جوش ملیح آبادی

(فکر و فن)

مرتبہ:
شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

جوش ملیح آبادی
(فکر و فن)

مرتبہ

شاہد ماہلی

JOSH MALIHABADI

(Fikr-o-Fun)

Edited by :

SHAHID MAHULI

I.S.B.N. 81-8172-048-2

اشاعت	:	۲۰۱۱ء
قیمت	:	۳۰۰/روپے
مطبوعہ	:	اصیلا پرنٹنگ پریس، دہلی

پیش لفظ

غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال کئی اہم قومی اور بین الاقوامی سمینار کا اہتمام کرتا ہے۔ ان سمیناروں میں اردو زبان وادب اور ہماری کلاسیکی شاعری سے متعلق کئی اہم موضوعات پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ ادارے نے نہ صرف غالب کی زندگی اور اُن کے فن کے حوالے سے بڑے مذاکرے کا انعقاد کیا ہے بلکہ میر تقی میر، سودا، مصحفی، خان آرزو، خواجہ میر درد، تفتہ، ذوق، ظفر، مومن، انیس، دبیر اور اقبال کے علاوہ اردو اور فارسی ادب کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کے علمی کارناموں پر بھی بحث کی گئی ہے۔ ان تمام موضوعات پر ادارے کی طرف سے کتابیں بھی آچکی ہیں اور اُن کتابوں سے ہمارے طلباء، ریسرچ اسکالرز، اساتذہ اور اہل علم کو روشنی بھی مل رہی ہے۔

ہم نے ۲۰۰۸ء میں جوش ملیح آبادی پر ایک بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا تھا جس میں ملک اور بیرونِ ملک کے علماء اور ادبا نے شرکت کی تھی۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اپنے معاصرین میں فکری اعتبار سے جوش زیادہ متحرک تھے اور اُن کا شعور بھی زیادہ جاندار تھا۔ اردو ادب کی دنیا میں جوش وہ پہلے انقلابی

شاعر ہیں جن کی فکر کی بنیاد فلسفۂ تغیر اور عقل پرستی پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا کوئی رخ نہ دھندلا ہے اور نہ برف سے ڈھکا ہے۔ اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ جس وقت برصغیر کی آزادی و انقلاب کی داستان مرتب ہوگی وہاں اگر جواہر لعل نہرو، گاندھی جی، ابوالکلام آزاد اور قائداعظم کی تحریریں اور تقریریں پڑھنا ضروری ہوں گی تو وہاں جوش کا گلگوں صفت کلام بھی پڑھنا لازم ہوگا۔

میں شکر گذار ہوں پروفیسر شمیم حنفی، جناب اقبال حیدر، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر سید محمد عقیل، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر سید فضل امام رضوی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، جناب یاور عباس اور جناب زبیر رضوی کا جنہوں نے اس مذاکرے میں شرکت کی اور اُن کی گرانقدر تحریروں نے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کیا۔ ان حضرات کے علاوہ جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں وہ بھی کافی علمی نوعیت کے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، سمینار میں اُن کی موجودگی اور دلچسپی نے سمینار کے وقار میں اضافہ کیا تھا۔ خراجِ عقیدت کے طور پر ہم اُن کے مضمون سے ہی اس کتاب کی ابتداء کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے قارئین، علما اور دانشوروں کی اس اہم تحریر سے علمی طور پر ضرور مستفید ہوں گے اور اپنی رائے بھی پیش کریں گے۔

شاہد ماہلی

HaSnain Sialvi

فہرست

قمر رئیس

جوش کی شاعری میں احتجاجی لہجہ کی معنویت

جوش کی شاعری فکری جولانی اور تخلیقی رنگ سامانی کا ایسا قلزم ہے جس میں ہواؤں کے تند جھونکوں سے کبھی طوفانی لہریں اُٹھتی ہیں کبھی بادِ نسیم کے نرم ہاتھوں سے سبک رو موجیں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پُر شور طغیانی کے تھپیڑوں سے اس کے ساحلوں پر جھاگ اُٹھتا ہے اور اس جھاگ کے اندر بس جھاگ ہی ہوتا ہے لیکن جوش کی تخلیقی جولانی کی اصل صورت تو لہروں کے نیچے کے تموج میں ہی دیکھی جاتی ہے۔ اندر ہی جہاں کئی دھارے بہتے ہیں۔ کبھی متوازی اور کبھی ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے۔ یہ دھارے کبھی گہرائی سے نمودار ہوکر اوپر کی طرف آتے ہیں کبھی اوپر سے اُٹھ کر نیچے کی گہرائیاں ناپتے ہیں۔ اس آویزش اور برقی روانی میں ایک انمول توانائی جنم لیتی نظر آتی ہے اور کبھی کبھی لہروں کی کشمکش اور ٹکراؤ سے بہالے جانے والی انرجی بھی متحرک دکھائی دیتی ہے۔

جوش کے ذخیرۂ شعری کی اس تمثیل پر راقم الحروف کو اعتماد اس لیے ہے کہ آج کل

یہ حقیر قومی کونسل کی ہدایت پر جوش کے کلیات کی تدوین کا مشکل کام انجام دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کے اکثر مجموعوں کی سیر کرتے ہوئے اس تمثیل نے آنکھیں کھولیں۔ اس مطالعہ کے نتیجہ میں جوش کی شاعری اور اس کے تخلیقی اور فکری ماخذ کے جن حوالوں تک رسائی ہوئی وہ حیران کر دینے والے تھے۔ یہ حیرانی اور اس سے جزی سوچ کی پریشانی اب بھی باقی ہے۔ اس لیے جوش کے کثیر جہتی شعری رویوں کے ایوان میں داخل ہونے اور کسی تہ دار موضوع کا انتخاب کرنے کے بجائے گفتگو کے لیے نسبتہً ایک اکہرے سے موضوع کو چنا ہے اگرچہ اس کی اپنی مشکلات بھی کم نہیں ہیں۔

شاید بات یہاں سے شروع کرنا ضروری نہیں کہ عہد قدیم کی عالمی شاعری کے ذخیرہ کا ایک بڑا حصہ احتجاجی جذبات اور فکر سے جڑا ہے۔ قدیم یونان اور خطہ عرب کے علاوہ کنفیوشس کے افکار سے اثر پذیر عہد عتیق کی چینی شاعری میں بھی احتجاجی لہجہ کی کھنک صاف سنائی دیتی ہے۔ ہندستان میں بھی بدھ مت کی جاتک کہانیوں اور مدرا راکھشس و بھوتی کے ناٹکوں سے کبیر اور رایداس کی شاعری تک سماجی احتجاج کے کتنے توانا رویے گندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن شاید ماضی کے اس جائزے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ عہد وسطیٰ سے اعلیٰ معیار کی نازک اور لطیف شاعری کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں جبر و استبداد اور ہر طرح کے انسانی استحصال کے خلاف کسی احتجاج کی گنجائش نہیں تھی۔ اس دور میں عاشقانہ جذبات، نشاط انگیز معاملات اور افسانوی طلسمات نے ہر طرح کے شعری اظہار میں اپنی مستقل جگہ بنالی تھی۔ یہ سچ بھی ہے۔ اس لیے کہ اس عہد میں خواہ مذہب کے نام پر قائم ہونے والی ریاستیں ہوں یا دوسری مطلق العنان مملکتیں، زباں بندی کا قانون اتنا متشدد تھا کہ بڑے بڑے سخنور بھی صرف ان ہی جذبات، واردات اور خیالی حکایات کے اظہار و بیان پر گزر بسر کر رہے تھے جو اہل اقتدار کی پُر تعیش زندگی کے تانے بانے سے تعلق رکھتے تھے۔ البتہ ان میں تخلیقی جوہر سے

بہرہ ور جو باکمال تھے وہ اس تنگ گھٹی وادی میں بھی جذبات کی بوقلمونی اور تخیل کی رنگینی میں اپنے ہنر کی تکمیل اور تابنا کی کے پہلو تلاش کر لیتے تھے۔

جوش کی شاعری کا آغاز وارتقا ان کی خوش قسمتی سے، ایک ایسے دور میں ہوا جب کم از کم تہذیبی ورثہ اور معاشرتی حقائق کے بارے میں سچ بولنے یا اُن کے حوالے سے شخصی تجربات کو بے کم و کاست بیان کرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ روایت گزیدہ سماج میں بے باکی سے سچ بولنے کی جرات کسی میں نہیں تھی۔ اکبرالٰہ آبادی نے البتہ حق گوئی کی ہمت کی تو ظریفانہ پینتروں کے رنگین غلافوں نے ان کے احساس کی تلخی اور تندی کو خاصہ تحلیل کر دیا۔ یہاں ایک بزرگ کا قول نقل کرنا شاید بے جا نہ ہو۔

"If reality is not presented in stark maked form, it simply turns into hypocrisy"

تلخ سچائیوں سے چھلکتی ہوئی حقیقتوں کی پردہ پوشی کرنا اور ان کی جگہ سامنے کی بے ضرر سی حقیقتوں کو بیان کرنا، خواہ اس کے پیچھے کیسی ہی مصلحت ہو ایک طرح کی منافقت ہی ہے۔ جوش جاگیرداری کی بعض کمزوریوں کا شکار ہو کر بھی، اس کی مصلحت آمیز منافقتوں سے ہمیشہ بیزار اور برسرِ پیکار رہے۔ اس طبعی میلان نے ان کے کردار کی بنیادی پہچان اور افتاد کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور اس سے جدا ہونے کے لیے وہ کسی حالت میں تیار نہیں تھے۔

جوش صاحب نظر ہوں یا نہ ہوں لیکن دین بزرگان کو خوش کرنے کی رغبت کبھی ان کے اندر پیدا نہیں ہوئی۔ جوش نے ''روح ادب'' کے دیباچہ میں اپنے لڑکپن کی سرکشی اور غضبناکی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میری سیاسی نظموں میں جو خطیبانہ لہجہ جھلکتا ہے وہ اسی افتاد کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں جوش رواجی مذہب پر اعتقاد رکھتے تھے۔ معرفت الٰہی کے لیے رکوع وسجود میں غرق رہتے تھے۔ افلاطونی عشق کے قائل تھے۔ لیکن باغیانہ اضطراب کی جو کمانی آہستہ آہستہ اُن کے اندر کھل رہی تھی ایک دن اس نے انہیں ان آبائی عقائد ورسوم

سے بیگانہ کردیا۔ والد کے سمجھانے پر بھی وہ جدی عقائد کی طرف واپس نہیں لوٹے۔ یہاں تک کہ ان کی اس گمراہی پر اُن کے والد نے وصیت لکھ کر انہیں اپنی جائداد سے محروم کردیا۔ لیکن ان کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ جوش فکر واظہار کی آزادی کو اپنی تخلیقی شخصیت کا محور جانتے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک سوچنے والا ذہن رکھتے تھے لیکن یہ ذہن کسی ضبط ونظم کا پابند نہیں تھا۔ اس پر مغربی شعرا کی رومانوی حسیت اور ٹیگور کی ماورائیت کا کچھ اثر ضرور تھا۔ ویسے بھی کسی تخلیقی فن کار کے لیے کسی منظم نظام فکر کو اُٹھا کر چلنا ضروری نہیں۔ اس بوجھ سے اکثر یا تو وہ خود تھک جاتا ہے یا اس کی شاعری یا اس کے قاری۔ افکار کے ساتھ علامتوں کی تکرار کا بوجھ الگ سے ہوتا ہے۔ جوش نے شعوری یا ارادی طور پر کبھی اس بار برداری کی کوشش نہیں کی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جوش کی شعری بوطیقا میں فکر کا کوئی مقام نہیں یا شاعری میں وہ حکمت ودانش کی معنویت کے منکر تھے۔ اس کے برعکس فکر اور اس کی تازہ کاری ہی تو ان کی سخنوری کا کلیدی وظیفہ ہے۔ لیکن جوش کے یہاں یہ ایسی فکر ہے جس میں خالی ماورائیت کے بجائے بشری اور سماجی سروکار روح بن کر دوڑتے ہیں۔ وہی اس کو مہمیز کرتے ہیں۔ اسے بنی نوع انسان کی آزادی فلاح اور ترقی کے آدرشوں سے جوڑتے ہیں۔

جوش کی شاعری کے ارتقائی سفر کی یہی وہ منزل ہے جہاں وہ آزادانہ طور پر جدی وراثت، اپنے رواجی عقائد اور اپنے تہذیبی اور سماجی اداروں کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس طرح کی گرفت اصلاح معاشرہ کے نام پر پہلے بھی ہوتی رہی تھی۔ جوش اس کی تنگ دامانی سے آشنا تھے۔ ان کی موضوعی یا داخلی سرکشی کو ایسے معروضی وژن اور کارگر آلات کی تلاش تھی جو معاشرہ کی کمزوریوں، انسان دشمن طاقتوں، استحصالی حربوں، تقلیدی رسوم اور ہر طرف بکھری ہوئی غلاظت کے ڈھیروں کو والم نشرح کرسکیں۔ جوش کہتے ہیں۔

ہاں نوعِ بشر چیں بہ جبیں ہے اب تک

انسان ''راہ راست'' پر نہیں ہے اب تک
اللہ کو ہو مژدہ کہ ''سرکش'' بندہ
تھا روز ازل جہاں وہیں ہے اب تک

گویا خدا نے انسان کو سرکشی کی پاداش میں دنیا میں بھیج کر جو سزا دی تھی وہ ابھی تک اسی سخت عقوبت یا عذاب سے گزر رہا ہے۔ اس رباعی میں طنزیہ لہجہ نے کئی معنوی دائرے بنا دیے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ انداز جوش کے شعری لہجہ کا ایک منفرد زاویہ اور تشخص بن گیا۔

یہ وہ منزل تھی جہاں جوش کو انسانی ذہن، اوہام اور افکار وعقائد کی بہت سی زنگ خوردہ زنجیروں میں جکڑا نظر آیا۔ ان کی تعقل پرستی (Rationalism) اور دوسرے جدید مادی نظریات کی تیز روشنی میں زندگی کی حقیقی سچائیاں اب ان کے روبرو آ جاتی ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ عقلی شعور سے عاری بچپن کی تعلیم Conditoning انسان کو گرد و پیش کی سلگتی ہوئی حقیقتوں سے کس درجہ بیگانہ کر کے ظلمت پرستی کے پنجروں میں قید کر دیتی ہے۔ اس احساس کی تلخی نے جوش کے کلام میں احتجاج کی ایسی صورت اختیار کر لی جو سینکڑوں اشعار میں بڑے مؤثر انداز میں رونما ہونے لگی۔ مثلاً:

منطق کو برہنہ پا کیا ہے ہم نے
اوہام کو تاج زر دیا ہے ہم نے
اب تک نہیں اُترا ہے وہ زہر اقوال
بچپن میں جو کانوں سے پیا ہے ہم نے

جوش کے فکر ونظر کی ترجمانی کرنے والی ہر تحریر اور ہر تخلیق میں ان کی تعقل پسندی اور سائنسی بصیرت شفاف صورت میں نظر آتی ہے۔ روشن خیالی کے اس ذہنی رویے کو انہوں نے اپنی شاہکار نظموں مثلاً ''موجد و مفکر'' حرف آخر اور لافانی حروف میں قائم کرنے کی

کوشش کی ہے۔ ان میں ایک جانب انہوں بنی نوع انسان اور اس کے تہذیبی اور مادی ارتقا کی کہانی، سائنسی زاویہ سے بیان کی ہے دوسری جانب انہوں نے نظریۂ علم کو بھی ایک نئی سطح پر پیش کیا ہے۔ جوش کا نظریہ علم حرکی، عملی اور ہمہ گیر ہے۔ انسانی تمدن کے ارتقا میں وہ اُسی سائنسی علم کو کارفرما دیکھتے ہیں جو انسانی محنت اس کی تخلیقیت اور تجربات کی دین ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی اور قدیم جامد علوم کو انسانیت کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ حکمت و دانش کی نئی لہروں سے چھلکتی جوش کی نظمیں، خشک اور بے کیف منظوم افکار کا نمونہ ہوں۔ اس کے برعکس یہ شاعرانہ حسن کا بڑا نادر نمونہ ہیں۔ 'موجد و مفکر' میں کائنات کے مادی ارتقا کے بعد جب وہ زمین کی تخلیق کو بیان کرتے ہیں تو اس کا تخلیقی حسن دیکھنے تعلق رکھتا ہے۔

مژدۂ ہستی لیے موج صبا آنے لگی
قلزموں نے ارغنوں چھیڑا زمیں گانے لگی
اور پھر اک دلفریب و دلنشیں انداز سے
خاک سے پودوں نے اپنے سر نکالے ناز سے
اور پھر کچھ تھم کے اُٹھی ایک موج سرخوشی
قلزموں میں زندگی کی اولیں جنبش ہوئی
خاک نے انگڑائی لے کر اپنے جوڑے کو چھوا
آئی سطح بحر سے میلاد خوانی کی صدا
دہر کے تاریک گوشے تک منور ہو گئے
زندگی کی سانس سے جھونکے منور ہو گئے

جوش کی شاعری میں احساس کی تلخی، اور احتجاجی لہجہ کی دھار تین اطراف میں خاص طور پر تند و تیز ہو جاتی ہے۔ ایک ہے ضعیف الاعتقادی اور مذہب کے اجارہ داروں کی

ریاکاری اور منافقت اور دوسری ہے عوام کا استحصال کرنے والی طاقتوں کے ساتھ مل کر اہل سیاست کے ڈھونگ اور فریب کاریاں۔ تیسری ہے زندگی کی ناہمواریوں، نابرابری اور انسان کی محرمیوں اور ناآسودگیوں سے پیدا ہونے والی تلخ کلامی۔ اولاً ذکر دائرہ میں فتنۂ خانقاہ 'مولوی' اور ذاکر سے خطاب, جیسی مشہور نظمیں شامل ہیں۔ ان میں طنز و تعریض کا نشانہ مذہب کو پیشہ و رتجارت بنانے والے ہوس پرست ہیں۔ مذہب کی اصل خدا، رسول، اہل بیت یا مقدس مذہبی شخصیتوں کے خلاف ان میں کسی جارحانہ جذبہ کا اظہار نہیں ہے۔

غلامی کے دور میں اشتعال انگیزی کی بنیاد پر جب فساد اور فرقہ پرستی کا فتنہ سر اٹھاتا تھا تو جوش تڑپ اُٹھتے تھے۔ آزادی اور متحدہ قومیت کا خواب انہیں ٹوٹتا اور خون میں نہاتا نظر آتا تھا۔ ان کے احساس کرب و محرومی میں تلخیاں گھل جاتی تھیں۔ 'مقتل کانپور'، 'نعرہ شباب' اور دوسری کئی نظموں کے شعری اظہار میں شاعر کی اذیت اور بیزاری احتجاجی لہجہ کی شعلگی میں ڈھل جاتی ہے۔ زیادہ مثالیں دینے سے احتراز کر رہا ہوں۔ 'مقتل کانپور' کے یہ دو اشعار دیکھیے:

سبحہ و زُنّار میں جکڑے ہوئے دیو سیاہ
تو ابھرتے ہی زمانہ کی نظر سے گر گیا
اُٹھنے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جہاد
اے فرنگی شادماں باش و غلامی زندہ باد

ہندو مسلم فساد اور فرقہ پرستی کی آگ نے شاعر کو مایوس کر دیا ہے اور اس مایوسی نے تلخی اور طنز کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن زندگی کے اذیت ناک تضادات اور بوالعجبیوں نے تو ہر خطہ اور ہر دور کے باکمال ادیبوں کو متاثر کیا ہے۔ وہ جوناتھن سوئفٹ ہو یا اکبر الہ آبادی۔ تیکھا سماجی شعور رکھنے والے تخلیق کاروں کے لیے طنز و مزاح ایک کارگر حربہ رہا ہے۔ اس احتجاجی رویے میں ان کا تشخص ہی نہیں ان کی ہمہ گیر مقبولیت کا راز بھی پوشیدہ

ہوتا ہے۔ اس لیے جوش کو یا ان کی شاعری کو احتجاجی اسلوبِ اظہار کی وجہ سے ہدف ملامت بنانا جائز نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ باکمال اور پُرگو شاعر کی طرح جوش کے ان گنت مجموعوں اور منظومات میں کئی لہجے نظر آتے ہیں جو مل کر ان کی شعری جمالیات کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان میں خود کلامی اور خود احتسابی کے لہجے بھی ہیں۔ تلقین اور تاکید کے لہجے بھی۔ انیس کے مراثی کی طرح رثائی اور محاکاتی لہجہ بھی اور کہیں کہیں خصوصاً فطرت سے تعلق میں غزل کا نرم غنائی لہجہ بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس لیے بعض دوسرے شعرا کی طرح جوش کی شعری جمالیات کو کسی ایک یا دو لہجوں میں قید کر کے دیکھنا مناسب نہیں۔ تخلیقی عمل میں ہر تخلیق موضوع اور تجربہ کی تہ داری کی مناسبت سے نمو پاتی ہے۔ اس کی تکمیل میں شاعر کی اپنی شخصیت کا افسوں بھی اضطراری طور پر شامل ہوتا ہے۔ جوش کی شخصیت میں ابتدا سے کچھ نسلی یا جینیاتی اوصاف و عناصر اور کچھ احساسِ انا کے زیر اثر، غصہ اور غیظ کے عناصر حاوی رہے۔ جس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے۔ اس لیے کوئی بھی واقعہ جو ان کی انسان دوستی کے آدرشوں اور اقدار کو مجروح کرتا ہے، اپنے ابتدائی ردّ عمل میں انہیں مشتعل کر دیتا ہے۔ یہ اشتعال تہذیبی شعور اور تعقل پرستی کی آنچ سے تحلیل ہو کر بھی تخلیق عمل میں کم یا زیادہ اپنا رسوخ بنائے رکھتا ہے۔ یہاں پروزیر آغا کی تصنیف ''تخلیقی عمل'' کی تھیوری کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ اُن کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ تخلیقی عمل کی بُنت میں دو طرح کے عناصر روبہ کار ہوتے ہیں۔ ایک منفعل (Passive) اور دوسرا فعال (Active)۔ ان میں نسلی، تجربات بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فعال عناصر طفلی سے عہد جوانی تک گھر سماج ماحول سے حاصل ہونے والے تاثرات کی پُراسراری کھتونی ہوتے ہیں۔ پھر کسی اچانک واقعہ کی تحریک پر یہ مثبت اور منفی لہریں آپس میں متصادم ہو کر ایک طرح کے مزاج (choos) کی منزل تک پہنچ جاتی ہیں۔ فن کار اپنی شخصیت کی افتاد کے مطابق ہی مزاج کی

اس صورت حال سے عہدہ برآ ہوتا اور دم گھونٹنے والی نراجی کیفیت سے نجات پانے کا جتن کرتا ہے۔ اس میں اس کی طباعی، تخلیقی وژن، تخیلی اختراعات اور لسانی مہارت سب بروئے کار رہتے ہیں۔ اس عمل میں وہ ایک نئی چیز یعنی ایک اچھوتی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔ تخلیقی عمل کی اس تھیوری یا نظریہ کو اگر صحیح مانا جائے تو اس عمل کی کارفرمائی جوش کی نظموں میں صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ تاہم ان کی اکثر و بیشتر نظموں میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انفعالی عناصر کے بجائے فعالیت کی لہریں ہی زیادہ دخیل رہتی ہیں۔ اس طرح کہ کہیں وہ تہ نشیں ہوتی ہیں جو فطرت اور عورت کے لازوال حسن کی پرستش پر انہیں آمادہ کرتی ہیں۔ کہیں اتنی حرکی کہ تخلیقی تجربہ کو شاعر کے وجود کی نادیدہ گہرائیوں میں لے جاتی ہیں جو اُن سے زوال جہانبانی، کسان، موجد و مفکر اور شکست زنداں کا خواب جیسی شاہکار نظمیں لکھواتی ہیں۔ اور کہیں فعالیت کی یہ لہریں سینکڑوں رباعیات کے فانوسوں سے فکر و نظر کے ایسے در و بام سجاتی ہیں کہ اقوامِ شرق کے شعری سرمایہ میں جن کی مثال نہیں ملتی۔ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ تخلیقی عمل کے منفعل یا سلبی لہروں سے جوش کا سروکار بہت کم رہا ہے۔ اُن کا واسطہ ہمیشہ اس کی فعال اور مثبت لہروں سے رہا۔ اس لیے کہ یہی ان کے کردار کی افتاد کا فطری تقاضہ تھا۔ اُن کے تخلیقی جوہر کی ساری جولانیاں انہیں اسی رُخ پر لے جاتی ہیں۔ شعری لفظیات پر ان کی لاثانی قدرت کے فرس اسی میدان میں بجلی کی طرح لپکتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ جوش کے احتجاجی لہجہ کی طرفگی توانائی اور تازگی تخلیقی ہنر کی نزاکتوں کو آزماتی تھی۔ اس کے لیے ایک چیلنج کا درجہ رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ جوش کی ان گنت رباعیوں میں بھی احتجاجی فکر کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ صرف دو رباعیاں دیکھیے:

قانون سے جب خموش ہوتی ہے زباں
تو ہونکنے لگتے ہیں دلوں میں طوفاں
جب پشتِ گدا، کرب سے جھک جاتی ہے

سلطان کے تاج پہ کڑکتی ہے کماں

ہنستے ہیں بوسیدہ، سیہ خانوں پر
گرتی ہے سدا برق اُن ایوانوں پر
جو بولنے دیتے نہیں پامالوں کو
گھن بولنے لگتا ہے ان انسانوں پر

احتجاجی فکراور انقلابی شعور کی رسوائی دراصل ان شعرا کے ہاتھوں ہوئی جنہوں نے اسے سیاسی نعروں اور نظریاتی مناجاتوں میں ڈھالنے کی سعی کی۔ برطانوی غلامی کی لعنت کے خلاف چند سیاسی نظموں سے قطع نظر، جوش کی شاعری میں، جہاں جہاں ذہنی تہذیبی یا معاشرتی احتجاج کی لہریں پیدا ہوئی ہیں وہ ان کے فن کی شعریت اور شعری جمالیات کا ایک فعال حصہ بن کر ہی سامنے آتی ہیں۔ اور اس نے ان کے معاصرین کی نظم نگاری کو متاثر کیا ہے۔ اس سچائی کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

خلیق انجم

صفِ اوّل کے مکتوب نگار: جوشؔ ملیح آبادی

کسی بھی فنکار کے سوانح، شخصیت اور سیرت کو سمجھنے کے سب سے اہم اور مستند مآخذ اُس کی خودنوشت اور دوستوں، عزیزوں اور مداحوں کے نام لکھے گئے اس کے خطوط ہوتے ہیں۔ خطوط میں فنکار کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات، اس کے سوچنے کا انداز، اس کے فکر و خیال کی دنیا، اس کی علمیت اور اہلیت، غرض شخصیت کے تمام نقوش واضح طور پر نظر آجاتے ہیں۔ فنکار کے خطوط میں اس کی سیرت و شخصیت کے بارے میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ذریعے فن کار کی شخصیت کے مثبت اور منفی پہلو ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

خطوط اور خودنوشت میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ خط لکھتے ہوئے انسان تخلیے میں صرف ایک فردِ واحد سے اپنے دل کی باتیں کر رہا ہوتا ہے اور اس طرح کے مراسلاتی

مکالمے میں عام طور سے کوئی دنیاوی مصلحت اس کے آڑے نہیں آتی جب کہ خودنوشت میں وہ پورے سماج سے ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سماجی مصلحتیں بھی اس کے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ لہٰذا یہاں وہ خطوط کے مقابلے میں سچ اور جھوٹ دونوں کی گنجائش رکھتا ہے۔
خطوط کا معاملہ یہ ہے کہ مکتوب نگار بے تکلفی سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے حقائق کو اکثر بے کم و کاست بیان کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خط لکھتے ہوئے مکتوب نگار کے ذہن میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ اس کے خطوط کبھی عام قاری تک پہنچیں گے۔ لیکن مکتوب نگار کے ابتدائی زمانے کے خطوط جب رسالوں یا کتابوں میں شائع ہونے لگتے ہیں تو پھر وہ احتیاط سے کام لینا شروع کر دیتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنی زندگی کے کچھ نہ کچھ حقائق خطوط میں بیان کر ہی دیتا ہے۔
اگر چہ مکتوب نگار اپنے خیال، فکر، عقیدے، احساس اور جذبے وغیرہ کو خط کی شکل میں منتقل کرتا ہے۔ خط شخصی اور نجی ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی اور اجتماعی نوعیت کے بھی حامل ہوتے ہیں۔
علامہ اقبالؔ کے بعد جوشؔ بیسویں صدی کے انتہائی اہم شاعر تھے۔ شعر کے میدان میں جوشؔ کو اس درجہ شہرت حاصل ہوئی کہ اُن کی نثر نگاری اپنی تمام ترین خوبیوں اور محاسن کے باوجود پسِ پشت جا پڑی۔ جوشؔ کے بے شمار مضامین، ماہنامہ 'آج کل' اور ماہنامہ 'کلیم' کے اداریے اور خاص طور پر سیکڑوں کی تعداد میں اُن کے خطوط پر جوشؔ کے مداحوں کی نظر ہی نہیں گئی۔ اپنی زندگی کے ابتدائی تیس پینتیس برسوں تک جوشؔ اپنی شاعری کا جھنڈا لہراتے ہوئے ہوا کے گھوڑے پر اڑتے رہے چناں چہ ان کے مداحوں، اردو کے نقادوں اور محققوں کو بھی جوشؔ کی نثر پر توجہ کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ اردو کے مشہور اور ممتاز نقاد احتشام حسین صاحب نے 'جوشؔ ملیح آبادی۔ انسان اور شاعر' (لکھنؤ۔ ۱۹۸۳ء) کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب نہیں بلکہ کتابچہ ہے۔ اوّل تو یہ کتاب احتشام صاحب کے شایانِ شان

نہیں، دوسرے اردو کے تمام نقادوں کی طرح احتشام صاحب نے بھی جوشؔ کی نثر نگاری کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

جوشؔ کے خطوط رنگیں بیانی، گل افشانیِ گفتار اور اعلا درجے کی ظرافت کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہی جوشؔ کے منفرد اندازِ بیان کی کلید ہے جس کے سبب جوشؔ کا شمار اردو کے ممتاز مکتوب نگاروں میں ہوتا ہے۔

خطوط انسان کی ایک انتہائی ذاتی قسم کی دستاویز ہوتے ہیں، جن میں گفتنی اور ناگفتنی ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ وہ نازک صورتِ حال ہے جس سے گزرتے ہوئے ناقدین اور محققین کو بڑ احتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ چناں چہ جب میں جوشؔ کے خطوط کا پہلا مجموعہ 'جوش بنام ساغر' مرتب کر رہا تھا تو اُس میں بہت سے خطوط ایسے تھے جن کے بارے میں ، میں نے سوچا کہ ان کا شائع کرنا مناسب نہیں ہے۔

مولوی احسن اللہ خاں ثاقبؔ جب امیر مینائی کے خطوط مرتب کر رہے تھے تو انھیں بھی اسی منزل سے گزرنا پڑا۔ میری طرح انھیں بھی محسوس ہوا کہ بعض خطوط میں امیر مینائی نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جن کا شائع کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ ایسے خطوط کو شائع نہ کیا جائے۔ ان خطوط کی ترتیب کے دوران مولوی احسن اللہ خاں ثاقبؔ نے علامہ شبلیؔ سے مشورہ کیا تو اُنھوں نے کہا کہ ''تمام خطوط بغیر قطع بُرید کے شائع کرنے چاہئیں۔ مولوی احسن اللہ خاں ثاقبؔ نے اس پر عمل کیا۔'' جب میری نظر سے علامہ شبلیؔ کا یہ قول گزرا تو میں نے بھی جوشؔ کے خطوط مرتب کرتے ہوئے یہی رویّہ اختیار کیا۔ میں نے غالبؔ کے جو خطوط مرتب کیے تھے، اُن میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو شائع نہ کی جاتیں تو بہتر تھا لیکن مجھے ہمیشہ یہی خیال رہا کہ غالبؔ کے خطوط کا ایک ایک لفظ اُن کے سوانح نگار کے لیے اہم ہے اور یہی خیال جوشؔ کے خطوط کی ترتیب کے وقت میرے ذہن میں رہا۔ چناں چہ میں نے 'جوشؔ بنام ساغر' میں وہ تمام عبارتیں شامل کر دی ہیں جو جوشؔ کے

غیر مطبوعہ خطوط میں موجود تھیں۔

جوشؔ کا جب پہلا مجموعۂ کلام 'روحِ ادب' شائع ہوا تو اس کتاب میں نظم کے ساتھ جوش کی نثر بھی تھی۔ 'روحِ ادب' میں شامل جوشؔ کی نثر کی داد دیتے ہوئے اکبر الہ آبادی نے جوشؔ کے نام ایک خط میں لکھا:

> ''آپ کی نثر بھی خوب ہے، کیوں نہ ہو، آپ اہلِ دل بھی ہیں، اہلِ زبان بھی۔ میری خوش نصیبی ہوگی کہ میرے بعد آپ ایسے یاد کرنے والے باقی رہیں۔''

'روحِ ادب' میں شامل جوشؔ کی نظم و نثر پر تبصرہ کرتے ہوئے شررؔ لکھنوی نے جوشؔ کی ادبی صلاحیتوں کی داد ان الفاظ میں دی تھی۔

> ''آج ان تمام جواہر و لطائف سے لبریز ایک نظم و نثر کا مجموعہ سبدِ گل کی طرح میرے سامنے ہے، جس کے تازہ پھولوں کی شمیم اطرافِ عالم میں پھیل چکی ہے۔''
>
> (شررؔ لکھنوی، مشمولہ روحِ ادب، ص ۷)

اگر میں جوشؔ کے خطوط کے دل چسپ اور اہم اقتباسات پیش کرنا شروع کروں تو یہ اقتباسات کم سے کم دو جلدوں میں سمائیں گے۔ میں یہاں بس دو یا تین اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔

کسی بات پر جوشؔ اور ساغر کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اس سلسلے میں جوش ساغر کو ۸/اکتوبر ۱۹۳۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت! آپ سے رسمِ محبت نباہنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔۔۔ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ، گھڑی میں خوش گمان، گھڑی میں بدگمان۔۔ خوش گمان بہت کم، بہت شاذ۔ بدگمان

بہت زیادہ، ہزاروں بار۔ اسی ایک بات کو دیکھ لیجیے، میں نے
آپ کے خط کا جواب تاخیر کے ساتھ دیا۔ آپ نے جواب
الجواب سے ہاتھ میں روک لیا۔ ایسا آدمی بھی کس کام کا۔ ایسے
شخص کو...... (ایک لفظ نہیں پڑھا جاتا) کے سوا اور کہہ کیا سکتے
ہیں۔

ساغر نے جوش کے خط کا کچھ عرصے تک جواب نہیں دیا۔ اس سلسلے میں ۲۱/اکتوبر ۱۹۴۸ء کو جوش نے ساغر کو صرف ایک فی البدیہہ شعر پر مشتمل خط لکھا۔ شعر ہے:

اپنے ذرّے کو آفتاب تو دو
میرے مکتوب کا جواب تو دو

جوش کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ جوش کے بارے میں عام نقادوں کا خیال ہے کہ میر انیس کے بعد اگر کسی کو زبان اور محاورے کا بادشاہ کہا جا سکتا ہے تو وہ جوش ہی تھے۔ زبان پر جوش کی قدرت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اردو کی معیاری زبان کے علاوہ انھیں ملیح آباد اور اس کے آس پاس اُن بولیوں سے پوری واقفیت تھی، جن کے الفاظ، روزمرّہ اور محاورے وہ اپنی نظم اور نثر دونوں میں برجستہ استعمال کرتے تھے۔

جوش کو استعارات اور تشبیہات پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ وہ مولانا محمد حسین آزاد کی طرح نثر میں انشا پردازی، شاعرانہ انداز اور جدّت طرازی، مقفّٰی و مسجّع عبارت کو اپنی تحریروں سے سجاتے ہیں۔

ان سب خوبیوں نے اُن کی نثر کو بہت خوب صورت اور دل چسپ بنا دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جوش کی نثر کے بیشتر حصے شاعری بن گئے ہیں جسے ہمارے بعض نقادوں نے نثر کا عیب کہا ہے۔

اگر میں غلط نہیں ہوں تو جوش کے خطوط کا پہلا مجموعہ 'جوش بنام ساغر' تھا، جو میں نے ۱۹۹۱ء

میں مرتب کیا تھا۔ جوشؔ کے یہ خطوط مرتب کر کے مجھے جوشؔ، اُن کی ادبی اور سماجی شخصیت سے جو لگاؤ پیدا ہوا وہ آج تک قائم ہے۔ میں نے جوشؔ کے خطوط تلاش کرنے شروع کیے اور اچھی خاصی تعداد میں مجھے خطوط مل گئے۔ میں نے جوشؔ کے وہ خطوط بھی ڈھونڈ نکالے جو رسالوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اُن میں سے کچھ خطوط مرتب کر کے ۱۹۹۸ء میں 'جوش ملیح آبادی کے خطوط' کے نام سے شائع کردیے۔ اس مجموعے کے بعد راغبؔ مرادآبادی صاحب نے 'خطوطِ جوش ملیح آبادی' کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا۔ جوشؔ کے خطوط کے اور مجموعوں سے کہیں زیادہ یہ مجموعہ اہم ہے۔ کیوں کہ اس میں جوشؔ کے سوانح سے متعلق بعض ایسے حقائق کا پتا چلتا ہے جن کا جوشؔ کے سوانح نگار کے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔ جوشؔ کی شخصیت ایک ایسی کھلی کتاب تھی جہاں وہ خلوت اور جلوت دونوں میں ایک ساتھ اپنے رنگ دکھاتی ہے۔ جو باتیں انتہائی نجی صحبتوں میں کہنے کی ہوتی تھیں جوشؔ وہ بھی اکثر عام محفلوں میں کہہ دیا کرتے تھے اور اُن کا یہی رویّہ خطوط میں بھی ہے۔

جوشؔ کی عمر تقریباً ۷۷ سال تھی۔ مگر وہ احساس اور جذبے کے لحاظ سے خود کو نوجوان ہی سمجھتے تھے۔ بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ مصائب و آلام سے نبرد آزما ہونے کی ہمت، حوصلہ، خوش و خرم رہنے کی فطرت اور الہڑ حسینوں کی صحبتوں نے جوشؔ کے بوڑھے جسم میں جوان خون دوڑا رکھا تھا۔ خورشید علی خاں کے نام ایک خط میں جوشؔ لکھتے ہیں:

''میں شاید مرتے دم تک بوڑھا نہیں ہوں گا۔''

میر انیسؔ نے فرمایا ہے کہ

جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ ''جو آ کے نہ جائے وہ جوانی دیکھی۔''
جوشؔ کی شخصیت بہت دل چسپ تھی۔ اُنھیں لڑکپن ہی سے حسینوں سے غیر معمولی لگاؤ رہا تھا۔ 'یادوں کی برات' میں اُنھوں نے اپنے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ جوشؔ صاحب

کے ایک عزیز ترین دوست بسمل سعیدی صاحب تھے جن سے مجھے بہت قربت حاصل تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ جوشؔ نے تکلف سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے معاشقوں کی تعداد اٹھارہ سے کہیں زیادہ تھی۔

۷۷ سال کی عمر میں اُن کی ملاقات لاہور کی ایک نوجوان لڑکی سے ہوئی اور جوشؔ اُس کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور ایسے گرفتار ہوئے کہ اُنھیں تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔ اس لڑکی کا نام خورشید علی خاں نے اپنی کتاب 'ہمارے جوش صاحب' میں ثمن کے بارے میں لکھا ہے۔ (ثمن یہ فرضی نام ہے) جوشؔ صاحب اگر اس لڑکی سے برملا اظہارِ عشق کرتے تھے تو وہ لڑکی بھی اظہارِ عشق میں جوشؔ صاحب سے کچھ پیچھے نہیں تھی۔ خورشید علی خاں نے اپنی کتاب 'ہمارے جوش صاحب' اور راغبؔ مرادآبادی نے اپنی مرتبہ 'خطوطِ جوشؔ ملیح آبادی' میں اس لڑکی کے بارے میں خاصی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ یہ لڑکی شاعرہ تھی۔ جوشؔ صاحب جب اس کے عشق میں گرفتار ہوئے ہیں تو ثمن کی عمر اُنیس، بیس سال تھی گویا وہ اتنی کم عمر تھی کہ جوشؔ کی نواسیوں کی ہم جماعت تھی۔ خورشید علی خاں نے اس لڑکی کی سخن سنجی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''شعر تو جیسے تیسے کہتی ہوگی مگر غضب کی شعر فہم ہے۔ قد درمیانہ اور رنگ کھلتا ہوا، چمپئی اور چہرے پر جوانی کی کشش اور بات کرنے کی ادا نہایت دلفریب۔''

جوشؔ صاحب نے اپنے دوستوں، خورشید علی خاں اور راغبؔ مرادآبادی کے نام خطوط میں اپنی اس آخری محبوبہ ثمن کا ذکر بار بار کیا ہے۔ ایک دو خطوں میں جوشؔ نے ثمن اور اس کی بڑی بہن کا ذکر کچھ ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوشؔ صاحب کی نظر ثمن کے ساتھ بڑی بہن پر بھی تھی۔ ۱۷ راگست ۱۹۷۳ء کے خط میں جوشؔ نے خورشید علی خاں کو لکھا ہے:

''کل سارا دن ''اُس'' کے ساتھ گزرا۔ اُس کی بڑی بہن نے کہا بھی کہ اب جوشؔ صاحب کو آرام کرنے دو، اپنے کمرے میں چلی جاؤ لیکن وہ فتنۂ روزگار میرے پہلو سے نہیں اُٹھی، اور عشوہ و ناز و ادا کے خنجر مارتی رہی۔

روزگار نے مجھ پر اس خبیث عمر میں دو کٹیلی چھوکریوں کو مسلّط کر دیا ہے۔ ہر چند میرے چہرے پر ماہ و سال کی شکنیں دوڑ چکی ہیں اور میرے خط و خال کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن رُوحِ کائنات نے، خدا جانے، ان لونڈیوں پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ میری دل داری پر کمر باندھے رہتی ہیں، وہ میرے چہرے کے بھیانک پن کو دیکھتی ہی نہیں، وہ کہتی ہیں، ہم کو حسین چہرے کی نہیں حسین ذہن کی ضرورت ہے۔ ارے کروڑوں کمسنوں میں ایک آدھ چھوکری اس مزاج کی بھی نکل آتی ہے۔ جو شاعر کے غروب کی تیرگی کو، طلوع کی جگمگاہٹ میں تبدیل کر دیتی ہے۔''

جوشؔ نے مزید لکھا ہے کہ:

''ان الھڑوں سے متاثر ہو کر میں نے ایک نظم کہی ہے۔ آپ بھی سن لیجیے۔ اس کے بعد جوشؔ نے خود اپنی ایک تازہ نظم نقل کی ہے۔ یہ نظم سات اشعار پر مشتمل ہے:

کڑی کرنوں کا منھ اُترا ہوا ہے
گھنی زلفوں کا ہم پر سائباں ہیں
نہ کیوں نازاں ہوں، اپنی ذات پر ہم
کہ ملجائے نیازِ دل براں ہیں

زہے قسمت ہماری آرزو میں
کسی کی آنکھ سے آنسو رَواں ہیں
بڑی حسرت سے حُوریں تک رہی ہیں
خدایا، ہم، یہ کس کے میزباں ہیں
ابھی تک ہیں حکایت در حکایت
ابھی تک داستاں، در داستاں ہیں

حسینوں کی رفاقت سے، ہم اے جوشؔ
زہے قسمت کہ اب تک نوجواں ہیں

جوشؔ اپنی محبوبہ ثُمن کو فتنۂ آخرالزماں کہا کرتے تھے۔ اس ثمن کا ذکر خورشید علی خاں کے نام ایک خط میں جوشؔ نے اس طرح کیا ہے:

"ہائے میری فتنۂ آخرالزماں بھی تقریباً ایک سال سے بیمار پڑی ہے۔ اور اس کی بیماری کا تسلسل گُھن کی طرح میری زندگی کو چاٹے جا رہا ہے۔ ہم تبرّک ہیں۔ بس اب کر لے زیارت مجنوں۔"

راغبؔ مرادآبادی نے اپنی کتاب 'خطوطِ جوشؔ ملیح آبادی' میں ثمن کے نام جوشؔ کے تین چار خطوط اور جوشؔ کے نام ثمن کے ایک خط کا عکس شائع کیا ہے۔

آخری عمر میں جوشؔ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے تمام مسودے کسی لائبریری یا ادارے کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ ان حالات میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کوئی ادبی ادارہ جوشؔ کے تمام مسودے شائع کرنے کا انتظام کر دیتا یا ان مسودوں کو شائع کرنے کے لیے جوشؔ کو معقول رقم دے دیتا۔ اس کے برعکس حکومتِ پاکستان نے یہ مسودے خرید کر

نیشنل لائبریری میں محفوظ کرنے کی پیش کش کی۔ اس سلسلے میں جوشؔ نے شیخ منظور الٰہی کو ایک خط لکھا۔ اس خط کے ایک ایک لفظ سے اُس ذہنی کرب کا اظہار ہو رہا ہے جو جوشؔ کو کوڑیوں کے دام اپنے لعل و گوہر فروخت کرتے ہوئے ہو رہا ہوگا۔

''بندہ نواز، گرامی نامے اور مسودات کے سلسلے میں، کرم فرمائی کا رسمی نہیں، دلی شکریہ قبول فرمائیے۔

جی ہاں، میں جانتا ہوں کہ میری ناکام زندگی، ان مسودوں کو فروخت کر رہی ہے اور اسی بنا پر حقیر معاوضہ ملے گا، اگر میری مبارک مَوت ان کو فروخت کرتی تو، منہ مانگے دام پاتی۔

لیکن، جب، زمانے کی ناقدردانی، اپنے اس دورِ واپسیں کی سوختہ سامانی اور اُن ذہنی تعصبات پر نگاہ کرتا ہوں، جو میری ذات سے وابستہ ہیں تو آپ کا پیدا کردہ یہ سہارا بھی بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے اور بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ آپ کا شکریہ ادا کروں۔

(جوشؔ ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، ص ۷۹)

جوشؔ نے اپنی زندگی ایک ہشاش بشاش، خوش دل اور کامیاب انسان کی حیثیت سے گزاری ۔لیکن آخری عمر کے جوشؔ کے بعض خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ اندر سے ٹوٹ سے گئے تھے اور خود جوشؔ کے بقول:

''اُن کے دل میں گھن لگ گیا تھا۔ وہ سخت مصائب کا شکار تھے، اُس کے باوجود وہ اپنے مصائب سے سینہ سپر رہے۔ اگرچہ اب بھی وہ اپنے دوستوں اور اہلِ خاندان میں ایک کامیاب اور خوش دل انسان نظر آتے تھے۔''

جوشؔ کی عمر ۳۱؍اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ۷۷ سال تھی۔ اُسی دن اُنھوں نے اپنی بیٹی سعیدہ بیگم کو ایک دردناک خط لکھا جو ان کے سوانح نگاروں کے لیے بہت اہم تھا اور جو جوشؔ کی شخصیت سے بالکل مختلف تھا:

''غور کرو، میری ایک جان ہے اور اتنے روگ ہیں۔ میری دانش مندی مجھ کو بہلاتی رہتی ہے۔ ہنستا بولتا ہوں لیکن گھن لگا ہوا ہے دل میں۔۔۔ جاگتے سوتے ضربیں لگتی رہتی ہیں میری جان...... رئیس (جوشؔ کے چھوٹے بھائی، جن سے جوشؔ کو بے انتہا محبت تھی) نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا۔ کاش وہ میری لاش پر روتا۔۔ ہائے میرا بھائی، میرا محبوب بھائی، مجھ سے بچھڑ گیا اور میں نامُراد مرنے کا نام نہیں لیتا۔ میری بشاشتوں اور میرے قہقہوں سے دھوکا نہ کھا۔ بیٹی میں اندر سے اس قدر زخمی ہوں جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔''

سرسبز ہوں بظاہر، باطن میں خون ہے دل

(۳۱؍اکتوبر ۱۹۷۳ء)

جوشؔ زندگی کے آخری دنوں تک غم و آلام کا مقابلہ کرتے رہے اور انہوں نے خوش مزاجی، خوش دلی، قہقہوں، دلچسپ لطیفوں کو اپنا سپر بنائے رکھا۔ اپنے قریب ترین دوست خورشید علی خاں کے نام جوشؔ نے ایک خط میں لکھا ہے:

''پھر بھی داد دیجیے میری سخت جانی یا بہادری کی کہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر قہقہے مارتا ہوں۔ انفس و آفاق کے اسرار پر غور کرتا ہوں اور ملازمت کے دغدغے بھی سہتا ہوں۔ ہر چند تین عدد موذی میموں، یعنی مسائل، معاشقے اور معاش میں گھری ہوئی

ہے۔ پھر بھی خوش دلی سے باز نہیں آتا اور بر پا پوش قلندر کے

نعرے لگاتا رہتا ہوں۔''

یہ حقیقت ہے کہ جوشؔ زندگی بھر ہنس ہنس کے غم جھیلتے رہے اور ہمیشہ اپنے قہقہوں، ہشاش بشاش مزاج کے سہارے غم و آلام سے سینہ سپر رہے۔ وہ ایک مجلسی انسان تھے اور اُن کے قہقہے، حاضر جوابی، فی البدیہہ، سنجیدہ اور فی البدیہہ شعر گوئی محفل کو ہمیشہ زعفرانِ زار بنائے رکھتی تھی۔ جس محفل میں جوشؔ ہوتے تھے، اس میں کوئی شخص افسردہ نہیں رہ سکتا تھا لیکن زندگی کے آخری دنوں میں جوشؔ اپنے پرانے دوستوں سے دور کراچی اور پھر اسلام آباد میں جا پڑے، جس کی وجہ سے اُن کی شخصیت میں وہ جادو باقی نہیں رہا۔ جو لوگوں کو خوش و خرم رکھتا تھا۔ کراچی میں تو جوشؔ نے اپنے سے کم عمر لوگوں اور نوجوانوں سے دوستانہ مراسم قائم کر کے اپنی محفل سجا بھی لی تھی لیکن اسلام آباد میں تو جوشؔ کے ملاقاتیوں کی تعداد بہت کم تھی بلکہ نہیں کے برابر تھی۔ جو لوگ اسلام آباد میں جوشؔ سے ملنے آتے تھے، اُن کا انداز، دوستوں کا نہیں بلکہ اُن زائرین کا ہوتا تھا جو کسی آثارِ قدیمہ کی عظمت دیکھنے آتے ہیں۔ دیکھیے وہ جوشؔ جو زندگی بھر ہشاش بشاش رہا جس نے اپنے قہقہوں، لطیفوں، دل چسپ باتوں، حاضر جوابیوں سے لوگوں کو خوش و خرم رکھا، وہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ جوشؔ نے اپنی بیٹی سعیدہ خاتون ۳۱/ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ایک خط لکھا جس میں اُن کا درد اور ذہنی کرب انتہائی درجے کو پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ جوشؔ جو محفلوں کی جان تھے اب تنہائی کا عذاب سہہ رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنی بیٹی سعیدہ خاتون کو ایک خط لکھا جس میں اُنھوں نے اپنے بیٹے سجاد حیدر کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے ذہنی درد و کرب کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ جوشؔ نے خط میں لکھا ہے:

> ''میرے بیٹے! میرے پاس آ کر رہو۔ میری تنہائی پر رحم کرو۔ جب تمھیں یاد کرتا ہوں دل سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ بیٹا تم اس قدر بے رحم کیوں ہو گئے ہو کہ باپ کی مصیبت سے جی چراتے ہو اور کراچی میں پڑے ہوئے خود کو بھی گھلائے ڈال رہے ہو — خدا کے واسطے میری پکار سن لو اور میری آغوش

میں آجاؤ۔"

جوشؔ نے خاصی تعداد میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھے ہیں، ان میں سے بڑی تعداد میں یہ خطوط بعض لوگوں کے پاس محفوظ بھی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں میں نے پہلی بار ۱۹۹۱ء میں جوشؔ کے وہ خطوط مرتب کر کے 'جوشؔ بنام ساغر' شائع کی تھی پھر میں نے جوشؔ ملیح آبادی' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں جوشؔ کے خطوط کا ایک اور مجموعہ شائع کیا تھا۔ اب بھی میرے پاس کافی تعداد میں جوشؔ کے رسالوں میں بکھرے ہوئے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط محفوظ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آج بھی بہت سے لوگوں کے پاس جوشؔ کے خطوط محفوظ ہوں گے۔ میں اُنھیں مرتب کر رہا ہوں۔ یہ کام مکمل ہونے میں سال دو سال کا عرصہ لگے گا۔

میں آخر میں جوشؔ کے شعری و نثری مجموعوں کی فہرست دے رہا ہوں تا کہ جو طالب علم اس موضوع پر کام کرنا چاہیں وہ اس فہرست سے استفادہ کر سکیں:

۱- روحِ ادب۔ (شعری و نثری مجموعہ) ۱۹۲۰ء، دوسرا اڈیشن ۱۹۴۲ء

۲- مقالاتِ زریں و نثر میں مختصر اقوال کا مجموعہ لکھنؤ، ۱۹۲۱ء

۳- اوراقِ سحر، شعری و نثری مجموعہ، لکھنو، ۱۹۲۱ء

۴- اشارات، مضامین جو مختلف اوقات میں رسالہ کلیم، دہلی میں شائع ہوئے۔ نگار بک ایجنسی، دہلی، ۱۹۴۲ء

۵- مقالاتِ جوش، مرتبہ: سحر انصاری، اردو محل، کراچی، ۱۹۸۲ء

۶- مختلف رسالوں میں مضامین

۷- جوش بنام ساغر، مرتبہ خلیق انجم، مونومینٹل پبلشرز، دہلی، ۱۹۹۱ء

۸- جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، تقسیم کار، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی)، ۱۹۹۸ء

۹- خطوطِ جوش ملیح آبادی، مرتبہ راغب مراد آبادی، ویلکم بک پورٹ، کراچی

شمیم حنفی

جوش کا اثر، بعد کی شعری روایت پر

افکار، کراچی کے مدیر (مرتب جوش نمبر) صہبا لکھنوی صاحب کے نام، جوش نے اپنے ایک پیغام میں لکھا تھا کہ اپنے بعد، وہ اردو نظم کی روایت کو آگے لے جانے کا فریضہ فیض کے سپرد کیے جا رہے ہیں، اور اپنے اس انتخاب سے وہ پوری طرح مطمئن اور خوش ہیں۔ لیکن اردو شاعری کی جو ارتقائی صورت اور روایت جوش کے بعد کے شاعروں نے مرتب کی، اس میں اکادکا نظم گویوں کو چھوڑ کر، جوش کے رنگ کی تقلید یا ان شعری اسلوب کی پیروی کا عمل تقریباً ناپید ہے۔ ان نظم گویوں میں بھی، فیض کا نام شامل کرنا، جوش اور فیض دونوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ نیاز حیدر، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، احمد فراز، راہی معصوم رضا، نازش پرتاپ گڑھی وغیرہ کی لفظیات اور لہجے میں جوش کے تخلیقی رویّوں کا عکس اور اُن کی آواز کا اثر، بے شک دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جوش کے بعد کی نظمیہ شاعری ان با کمالوں سے زیادہ ان کے ایسے ہم عصروں سے پہچانی جاتی ہے جنھوں نے ایک نئی روایت کے قیام اور استحکام کا بیڑا اٹھایا اور اردو نظم کو اس کے ماضی سے الگ کر کے ایک نئے

حال اور استقبال کا ترجمان بنانے کی جد و جہد کی۔ اردو کی نئی نظم کے معماروں میں سب سے نمایاں نام فیض، راشد، میراجی، مجید امجد، مختار صدیقی، یوسف ظفر، ضیا جالندھری اور اختر الایمان کے ہیں۔ اور ان تمام شاعروں کا انداز اور اسلوب، ان کے تخلیقی مقاصد، ترجیحات اور تصورات کی دنیا جوش کی دنیا سے بڑی حد تک مختلف ہے۔

لیکن یہ دنیا تو اپنی داخلی ترکیب، اپنے لسانی سانچے اور شعری ذائقے کے لحاظ سے، اقبال کی دنیا کے مقابلے میں بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ جیلانی کامران نے اپنے ایک مضمون ''نئے لکھنے والوں سے میری ملاقات'' میں اس واقعے پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ نئے شاعروں کے فکری افق پر اقبال کا کوئی سراغ بھی نہیں ملتا۔ البتہ میراجی یہاں چھائے ہوئے ہیں اور اس کا سبب جیلانی کامران کے نزدیک یہ ہے کہ: ''جدید کا تصور عجمی، اسلامی روایات کی نفی سے پیدا ہوتا ہے اور ہر وہ شے نئی ہے جس میں مسلمانوں کی تاریخی روایت سے علیحدگی دکھائی دے۔''

خیر، یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور سردست ہمارے موضوع یا معروضات کے دائرے سے باہر کی بات ہے۔ اس وقت اقبال کی طرف دھیان یوں گیا کہ بیسویں صدی کی نظمیہ شاعری یا جوش کی شاعری کے تذکرے میں اقبال کا تذکرہ دو وجہوں سے ناگزیر ہے۔ ایک تو اس لیے کہ نظمیہ شاعری کے سیاق میں بیسویں صدی، بہر حال، اقبال کی صدی تھی۔ ان کا سایہ اس پورے عہد پر بہت گہرا ہے۔ دوسرے یہ کہ جوش کی اپنی روایت اور پس منظر کے واسطے سے بھی اقبال کے شاعری ہماری ادبی تاریخ کا سب سے بڑا سنگ میل ہے جسے عبور کرنا تو دور رہا، اس کے سامنے ٹھہرنے کی صلاحیت بھی ہمیں اردو کے کسی نظم نگار شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ جوش اور ان کے معاصر نظم گویوں کے سامنے سب سے بڑا اور پیچیدہ مرحلہ یہی تھا۔

یہاں میں ممتاز حسین کے ایک معروف مضمون، بہ عنوان ''ہماری شاعری میں

دانش وری کی روایت'' (مشمولہ مجموعۂ مضامین، ''ادب اور روحِ عصر'') کے ایک طویل اقتباس کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ:

''سرسید اور حالی سیاسی آزادی کے سوال سے دامن بچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکبر نے یہ سوال اپنی طنزیہ شاعری میں بھرپور طور سے اٹھایا۔ انہوں نے صرف سیاسی آزادی ہی کی بات نہیں اٹھائی بلکہ ذہنی غلامی، پیروئی مغرب کے سوال کو بھی دائرۂ فکر میں لائے۔ اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ محض ان کے علوم کو اپنانے میں کوئی عیب نہیں بشرط یہ کہ اس کا اطلاق اور اس کی تفہیم دونوں ہی تخلیق اور ملک اور قوم کی تاریخ سے ہم آہنگ ہوں۔

اقبال نے بڑی حد تک یہ خدمت انجام دی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد کے زمانے میں، ہماری شاعری میں سیکولر لہجہ بہت زیادہ ابھرا ہے۔ اس سلسلے میں جوش اور فراق کی فکر پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ جوش اور فراق دونوں ہی نے بہت ہی مثبت نظریہ، آدمی کے وجود سے متعلق اور اس کے معاشرے کی تشکیل نو سے متعلق اختیار کیا۔ ان دونوں شعرا پر آزادی کی تحریک اور ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر تھا۔ یہ خیال کچھ غلط نہیں رہا کہ جوش کی فکر میں گہرائی نہیں ملتی ہے۔ لیکن ایک بات جو ان کی شاعری میں نمایاں ہے، وہ یہ کہ انسانی عظمت کا جیسا ترانہ ان کی شاعری میں ملتا ہے کسی اور کی شاعری میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ فراق اس معاملے میں جوش سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن ان کی فکر نسبتاً جوش

کی نظر سے زیادہ گہری روح کی حامل ہے۔ ان کی فکر میں جہاں
مغربی اثرات، مارکسزم، آئن سٹائن کی افادیت (اضافیت؟)
وغیرہ ملتے ہیں وہاں نیوویدانت کے اثرات بھی کبھی سرّیت
(mysticism) کے روپ میں تو کبھی منفعل دانش وری
(Passive wisdom) کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن
جس قوت اور پامردی کے ساتھ ان دونوں شاعروں نے
انقلاب کی ضرورت، آدمی کی عظمت اور اس کی جہدِ مسلسل کے
نغمے گائے ہیں وہ ہمارے شعور کا حصہ بن چکے ہیں۔

(ادب اور روحِ عصر، اگست ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۱/۱۰۰)

ممتاز صاحب نے اپنے اس مضمون میں کئی متنازعہ باتیں کہیں ہیں۔ ایسی باتیں بھی جو اپنے اندرونی تضاد کی وجہ سے ہمیں الجھن میں ڈال دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ فراق کی فکر میں مغربی تصورات کے ساتھ ساتھ مارکس، آئن سٹائن اور ویدانت سے شغف کے نتیجے میں ایک طرح کی ''منفعل دانشوری'' کے عناصر ملتے ہیں اور اسی کے پہلو بہ پہلو ''قوت اور پامردی کے ساتھ انقلاب اور عظمتِ آدم اور اس کی جہد مسلسل'' کا شعور بھی۔ جوش کے کلام میں فراق کے برعکس، فکری اضمحلال کا رنگ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کا رجزیہ انداز، ان کی خطیبانہ بلند آہنگی، ان کا جذباتی وفور اور تکرار آمیز شدت پسندی، اسی کے ساتھ ان کے بیان میں ہر خیال کی صراحت پر زور یا قافیہ پیمائی کی سیلابی کیفیت اور زبان پر غیر معمولی گرفت انہیں اقبال کے علاوہ، اپنے معروف ہم عصروں میں، حفیظ جالندھری اور احسان دانش سے قطع نظر، فراق سے بھی یکسر مختلف نوعیت کا شاعر بناتی ہے۔ بڑی حد تک جوش اپنے مخصوص رنگ اور آہنگ کے ساتھ ہمیں اپنے بھرے پُرے دور میں تنہا اور منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے اسلوب شعر کے موجد تو نہیں ہیں، لیکن اس کے خاتم ضرور ہیں۔ اُن

سے پہلے یہ اسلوب اور اظہار کی یہ وضع انیس کے یہاں اپنی انتہا کو پہنچی تھی۔ اُن کے بعد کوئی اور نظم گو اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ فراق تخلیقی سطح پر جوش سے آگے، لیکن زورِ بیان اور قدرتِ کلام کے لحاظ سے بہت مختلف اور بہت پیچھے ہیں۔ اپنی قومی اور سیاسی نظموں میں وہ جوش کے سامنے ذرا بھی نہیں ٹھہرتے۔ تاہم، فراق کی دو نظمیں، ''پرچھائیاں'' اور ''آدھی رات'' اپنے بیان کی رمزیت، تجربے اور خیال کے ارتقا اور اپنے احساسات کی ندرت کے لحاظ سے، اسی کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی پیچیدگیوں اور گہرائی کے لحاظ سے، ایسی ہیں کہ اردو نظم کی جدید تر صورت اور اس کے ارتقائی مدارج کے لیے ایک پُرکشش پس منظر مہیا کرتی ہیں۔ ہندی شعریات کی آگہی اور مغربی ادبیات کے عرفان نے انہیں اپنے بعد کے شاعروں سے فکری اور حسی طور پر قریب کر دیا تھا۔ ''پرچھائیاں'' اور ''آدھی رات'' سے بعد کی اردو نظم کے لیے کئی دروازے کھلتے ہیں، جبکہ جوش کی نظم کے اوصاف اور امتیازات بعد کے شاعروں کے لیے بتدریج نامانوس ہوتے جاتے ہیں۔

بڑی شاعری، جو نئی بصیرتوں سے مالا مال بھی ہو، اپنے عہد کے لیے اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے نت نئے دروازے کھولتی ہے، افکار و اظہار کے نئے راستے سجھاتی ہے، تجربے اور زبان و بیان کی سطح پر ایک نئے جہانِ معنی کی خبر لاتی ہے، اپنے ماضی پر اور اپنی روایت پر ایک اضافہ ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کی نظمیہ شاعری میں یہ منصبِ جلیل بے شک اقبال کے حصے میں آیا۔ لیکن ان کے بعد نئی نظم کی جو روایت ترقی پسند اور حلقۂ اربابِ ذوق کے شاعروں نے مرتب کی، اس تک رسائی سے پہلے جوش ہمیں اپنے فکری حدود کے باوجود نمایاں نظر آتے ہیں۔ اقبال کے ساتھ جوش کا نام ایک ہی سانس میں لینا محض جذباتیت کی دلیل ہوگی اور ایک حد تک بیسویں صدی کے ذہنی افق اور اقبال کی تخلیقی کائنات کے تنوع پھیلاؤ اور بے حسابی، اس کائنات کے شکوہ اور اس کی رفعت و جلال سے بے خبری اور کم نگہی کی دلیل بھی ہوگی۔ لیکن ترقی پسند نظم اور حلقۂ اربابِ ذوق کی نظم کے

ساتھ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے اواخر میں جو منظر بتدریج سامنے آیا، اس پر اقبال اور جوش دونوں کے نشانات بہت دھندلے ہیں۔ اقبال اپنی وسعت فکر اپنی حسیاتی تنظیم اور اپنی معجزہ کارفنی تشکیل اور اپنی سرّیت، اور اپنی مابعد الطبیعاتی جہات کے باعث، نئے شاعروں کے لئے بڑی حد تک ناقابل تقلید تھے۔ دوسرے یہ کہ ترقی پسند نظم گویوں اور اُن کے غیر ترقی پسند معاصرین کی تخلیقی، ذہنی اور جذباتی ترجیحات بدل چکی تھیں اور ان کا شعور ایک نئی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ جوشؔ کی شاعری، اپنے بعد والوں کے لیے اور اپنے جونیئر ہم عصروں کے لیے ایک خاص طرح کی اپیل تو رکھتی تھی لیکن اس کا دائرہ محدود بہت تھا۔ محاکاتی شاعری کا زور بتدریج کم ہوتا جاتا تھا اور حقیقت پسندی کی وہ سطح جس سے ہمارا تعارف جوش کی نظموں کے واسطے سے ہوتا ہے، نئے نظم گویوں کے لیے زیادہ پرکشش نہیں رہ گئی تھی۔ جوش کے افکار اور محسوسات کی دنیا میں اس طرح کی وسعت اور رنگارنگی نہیں تھی جو نظمیہ شاعری کی کسی نئی روایت کے استحکام کا ذریعہ بن سکے۔ جوش اپنی تمام تر اُپج، تخلیقی وفور اور پُرگوئی کے باوجود، کسی ایسی تخلیقی دنیا کے متلاشی نہیں تھے جسے اجنبی، نامانوس اور نیا کہا جاسکے۔ ان کی شاعری کا غالب آہنگ ایک کلاسیکی، پختہ کار اور قادرالکلام شاعر کا تھا۔ اقبال کا طرزِ احساس کلاسیکی اور جدید، پرانی اور نئی، دونوں دنیاؤں سے ایک ساتھ ہم رشتہ دکھائی دیتا ہے۔ جوش کی شاعری میں بغاوت، انقلاب، احتجاج اور انحراف کے عناصر نمایاں ہیں۔ پھر بھی اُن کا مجموعی شعور ترقی پسند اور غیر ترقی پسند نظم گویوں کی اکثریت کے لیے پابلو نرودا، لورکا، مایاکافسکی یا ناظم حکمت جیسے شاعروں کی جیسی اپیل نہیں رکھتا۔ انہیں جہاں معنی اور بیان کے نئے امکانات کا سراغ ملا یا اردو کے نئے نظم گویوں کو تجربے اور اظہار کے نئے راستوں کی تلاش جس طرف لے گئی وہ ایک اور ہی سمت تھی۔ پھر بھی ترقی پسند شاعروں کی ایک پوری نسل نے جوش کی نظم کو رول ماڈل نہ سمجھنے کے باوجود جوش کے مرتبے کا اعتراف کیا اور اس نسل نے جوش کی اہمیت سے کبھی جو انکار نہ کیا تو اس

لیے کہ جوش کی نظم نے اپنے ہم عمر اور اُس دور کے تمام ممتاز اور معروف نظم گویوں کی بہ نسبت ایک زیادہ اہم، بامعنی اور موثر رول ادا کیا ہے۔ جوش کی نظم کا یہ رول صرف اُن کی شاعری یا تخلیقی مزاج تک محدود یا صرف اُن کی شعریات کا پابند نہیں ہے۔ اس کی ایک خاص تاریخی اہمیت بھی ہے۔ اور اردو کی جدید نظم کے سیاق میں اُس کے مکمل مفہوم کا تعین، دراصل اُس دور کی سماجی زندگی اور اجتماعی صورت حال کے واسطے سے بھی ہوتا ہے۔ جوش کی شاعری کا ظہور سیاسی غلامی، قومی آزادی کی جدوجہد، طبقوں میں بٹی ہوئی عام زندگی اور ایک تھکے ہوئے معاشی اور معاشرتی نظام کے پس منظر میں ہوا تھا۔ ساختی اور مہاجنی تہذیب کے وہ حوالے جو پریم چند کے فکشن کو ایک ٹھوس اور واقعاتی اساس مہیا کرتے ہیں، جوش کی شاعری کا تانا بانا بھی انہی حوالوں سے تیار ہوا ہے۔ اقبال کے بعد اردو میں نظم گو شاعروں کی جو صفیں آراستہ ہوئیں، ان میں عشقیہ، غنائی، منظریہ، سماجی اور سیاسی اور قومی شعور۔ ان سب کی ترجمانی عام ہے۔ اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش سے لے کر محروم، سیماب اور ساغر تک، ان صفوں میں ہر طرح کا نظم گو موجود ہے۔ اسی دور میں ان میں سے کچھ نے ہیئت اور اظہار کے نئے تجربے بھی کیے جیسے عظمت اللہ خاں اور ان کے وہ معاصرین جن کی توجہ شعری تجربے اور زبان و بیان کے نئے اسالیب پر تھی۔ لیکن جوش ان سب سے الگ دکھائی دیتے ہیں اور ان کی آواز، اپنے عمومی آہنگ اور رنج کے باوجود سب سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ جوش کی جیسی گھن گرج طنزیہ کاٹ اور برہمی کی بے چین کردینے والی کیفیت ان میں سے کسی کے یہاں نہیں ہے۔ جوش اپنے رنگ کے سب سے ممتاز شاعروں میں سے ہیں اور اس حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ کلاسیکی ادب کے اوصاف میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس کی کچھ نہ کچھ معنویت ہر دور میں باقی رہتی ہے، چاہے وہ دور یکسر تبدیل ہو چکا ہو۔ تو جوش کی نظم نے بھی ہمارے لیے اپنے معنی ابھی کھوئے نہیں ہیں۔

عتیق اللہ

جوش فہمی کی طرف ایک قدم

جوش ہی نہیں جوش کے علاوہ بھی ایسے بہت سے نام ہیں۔ جنہیں بالخصوص ان کے عہد میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ بہت بعد میں جا کر ان کے غیر معمولی تخلیق جوہر کا اعتراف کیا گیا۔ ہمارے تشہیری اور صارفی دور میں ردّ وقبولیت کے جو معیار فروغ پا رہے ہیں اور حقیقی اہلیتوں کو جس طور پر جھٹلانے اور نظر انداز کرنے کے گر آزمائے جا رہے ہیں۔ ان کے جبر سے جوش کل بھی آزاد نہیں ہو پائے تھے اور المیہ یہ کہ آج بھی ہماری تنقید کے باب ان پر تقریباً بند ہیں۔ میری نظر میں غالباً اس کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔

۱۔ اقبال کی غیر معمولی مقبولیت اور ان کی تخلیقی استعداد جو ان کے عصر ہی نہیں ان کے بعد کی نسلوں میں کئی قسم کی نفسیاتی گرہیں پیدا کر چکی تھی جو ایک فطری امر تھا۔

۲۔ جوش ہمارے آخری کلاسیکی شاعر تھے۔ ایک نسل ایسی پیدا ہو چکی تھی جو جتنی تجربہ پسند تھی اتنی ہی روایت شکن بھی تھی۔ حتّٰی کہ ترقی پسند شاعری کی بہتر مثالیں جس

قسم کے ارتکاز اور صلابت اور چیزوں کو سمجھنے کی نئی فہم کی مظہر تھیں۔ جوش کے اختیار سے باہر کی چیز تھیں۔

نئی اور پرانی نسل کے درمیان جو خلیج واقع ہوگئی تھی اس کے کم ہونے کا امکان کم سے کم تھا۔ نئی میزانِ قدر نے پرانی میزانِ قدر کی جگہ لے لی تھی۔ نئی تنقید نے تو ان سے اغماض برتا ہی، حیرت اُن نقادوں پر ہے جو مشرقی شعریات کا دم بھرتے تھے، لیکن جوش کو انہوں نے بھی توجہ کے لائق خیال نہیں کیا۔

ادبی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ہر نسل اپنے پیش رو۔ کے اثرات کی تشویش یا تناؤ میں متبلا رہی ہے۔ ہیلرڈ بلوم نے اس کیفیت کو فرویئڈ کے ایڈی پس کامپلیکس کے تصور کی روشنی میں The Anxeiety Influence سے تعبیر کیا تھا۔ جیوئن اور مقتدر تخلیقی فن کاروں کے حق میں وہ پیش رو نسل جو مستحکم اور توانا ہے، ہمیشہ خوف، تذبذب، کشمکش اور کشیدگی کا سبب بنی رہتی ہے۔ ادبی تاریخ اور اس کی روایت کا یہ جبر ہوتا ہے کہ ہر نسل اپنے ماضی کی کوکھ ہی سے پیدا ہوتی ہے اور پھر ماضی کو اپنے ذہنوں سے کاٹ کر ایک نئے ماضی کو خلق کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے وہ گذشتگان کو رد بھی کرتی ہے، اس سے خوف بھی کھاتی ہے اور اس کی طرف للچائی نظروں سے بھی دیکھتی ہے۔ ردّ وقبول میں Bina RY OPPOSITION کا رشتہ بھی ہے۔ رد کرنے میں کہیں نہ کہیں قبولیت کی ایک ننھی مُنّی سی خواہش بھی تہِ نشین ہوتی ہے۔ کیوں کہ جسے رد کیا جاتا ہے، رد کرنے سے پہلے اُسے پوری طرح اپنی فہم کا حصہ بنایا جاتا ہے اور فہم کا حصہ بنانے کے دوران اس کے بہت سے اجزا لاشعوری طور پر ذہن کے کونے کھدروں میں دب چھپ جاتے ہیں بعد ازاں بغیر کسی ارادے کے وہ اثر دکھائے بغیر نہیں رہتے۔ جیسے احتجاج کی روش اقبال اور جوش دونوں کے یہاں ہے۔ دونوں ہی نو آبادیاتی محکومی اور نو آبادکاروں کی تہذیبی یلغار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جوش کے احتجاج میں تحفظ شکنی، زور آوری اور مزاحمت کا پہلو زیادہ

حاوی ہے۔ جوان کے عہد کا تقاضہ بھی تھا۔ اقبال اپنے جذباتی وفور پر قدغن لگاتے ہوئے چلتے ہیں۔ اور احتجاج احتجاج سے زیادہ شکوہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جوش ایک ہی نظم میں بہت سی نظموں کا مواد بھر دیتے ہیں۔ اور اقبال بہت کچھ دوسری نظم یا نظموں کے لیے بھی بچا رکھتے ہیں۔ قومی بے حسی اور مجہولیت پر دونوں وار کرتے ہیں، لیکن جوش کا وار زیادہ شدید ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی طنزیہ لے میں طعن و تشنیع کے رنگ کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ جوش جب بھی اپنی قوم کی ناعاقبت اندیشیوں، منافقتوں اور بے کرداری کو موضوع بناتے ہیں ان کی کشیدہ خاطری اور آزردگی یک لخت برافروختگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر میں انہیں اردو کا پہلا Angry Young Man کہتا ہوں، اس معنی میں وہ بڑھاپے میں بھی اکثر غم و غصے کی افزونیت سے نظم کا تانا بانا جگہ جگہ سے کھل ضرور جاتا ہے، لیکن یہ چیز اثر آفرینی میں کہیں مانع نہیں آتی۔ اردو کی شعری روایت سے مانوس قاری نظم کے اس کردار سے بخوبی واقف ہے۔ ایک رنگ کے مضمون کو جب سو رنگ میں باندھا جاتا ہے تو نظم کے اندر محسوسات کے قماش اژدہام کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور یہ نمو پذیری ہماری شعری روایت سے کوئی علیحدہ اور اجنبی چیز نہیں ہے۔

جوش کا بنیادی اخلاقی فریضہ الم گریزی اور حصول لذت سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کے Sufferings کا راستہ قومی زوال کے احساس سے ہو کر جاتا تھا، جو جتنا اجتماعی تھا اتنا ہی انفرادی بھی تھا۔ عقلی کم جذباتی زیادہ تھا۔ عقیدے کی آمیزش نے ان جذبوں کی قبولیت کی راہ کو نسبتاً آسان بنا دیا تھا۔ جوش کا مسئلہ ایک ایسی اقلیم کو دریافت کرنے سے تعلق رکھتا تھا، جس کے فرماں روا صرف اور صرف جوش ہوں۔ اس فرماں روائی کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے از روئے ترجیح ایک ایسے نشاطیہ آہنگ پر بنیاد رکھی جو بلند تھا، اقبال سے زیادہ بلند بلکہ شور آگیں اور سماعت آزما بھی۔ انہوں نے اقرار کے بجائے جرأتِ انکار کو زیادہ التفات کے لائق سمجھا۔ روایتی اخلاقیات اور دینِ بزرگاں کو سوال زد کرنے کے

خطرات مول لیے۔ صاف گوئی اور بے باکی کی ایک ایسی مثال قایم کی جو ہماری شعری روایت میں قطعاً ایک نیا اقدام تھا۔

اردو کی وہ شعری روایت جس کی نشو ونما کلاسیکی نظام بلاغت کے تحت ہوئی تھی اور جو بالخصوص تہذیب لفظ کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے۔ اُس کا اپنا ایک وقار، اپنی ایک شان تھی۔ جوش بلاشبہ ہماری کلاسیکی شعری روایت کی سب سے آخری کڑی ہیں۔ لسانی سطح پر جوش نے اپنے امتیازات کی ایک جداگانہ کائنات تشکیل کی ہے۔ وہ ایک ایسے دور میں بدیعیاتی سطح پر زیادہ سے زیادہ امکانات کو بروئے کار لائے۔ جب کلاسیکی مشرقی شعری اقدار کی طرف عدم توجہی عام ہو چکی تھی۔ جوش نے کہیں ایسا کوئی لفظ یا لفظی ترکیب استعمال نہیں کی جو صوتیاتی سطح پر سامعہ نواز نہ ہو۔ آوازوں کے جن مرکبات اور لفظی درو بست کا انہیں ادراک تھا اور اس ادائگی میں جو والہانہ پن تھا وہ معمولی لسانی شعور کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کا پورا ایک ذہنی اور تہذیبی تناظر تھا۔ اسمائے صوت کو وضع کرنے اور انہیں مختلف ترکیبوں میں ڈھالنے کی سب سے پہلی مثال زٹلی نے قایم کی تھی، لیکن زٹلی لفظ یا کسی شئے یا عمل سے پیدا شدہ یا وابستہ آوازوں کی نقل میں الفاظ بنانے کے سلسلے میں ارادۃً نفاست دشمن واقع ہوئے تھے۔ ایک محدود سطح پر نظیر نے بھی لفظ کاری اور صوت کاری میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ جوش نے خطیبانہ آہنگ کو زیادہ سے زیادہ اثر کار بنانے کے لیے آوازوں کی نفیس تنظیم اور ترکیبوں کی جس خلاقانہ شعور کے ساتھ تشکیل کی ہے۔ اس کی نقالی بھی تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔

ایک مثال اُن کے اس آخری مرثیے سے اخذ کی گئی ہے۔ جس میں پانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پانی کے ہزار رنگ دکھانے کے بعد اس کی آوازوں کو وہ اس طور پر کسب کرتے ہیں:

ٹپ ٹپ، شرر شرار ترا تڑ چھنن چھنن

دھماں دھوم، دھام، دھا دھم دھنن دھنن

گُم گاؤرُوم جھوم، جھما جھم جھنن جھنن
گھن گھن گرج گھماؤ، گھما گم گھنن گھنن
گرجے جو ابر میں تو فلک چہچہا اُٹھے
انگڑائی لے تو سر پہ دھنک چہچہا اٹھے

--

مجاز کے نام جو پند نامہ لکھا تھا، اس میں بھی نشہ انگیزی اور سرمستی کی کیفیات کو نو بہ نو لفظوں اور آوازوں کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ اردو میں لفظ تراشی یا نو الفاظ سازی (Neologism) کی ایسی مثال غالبًا نایاب ہے۔

لات، گھونسا، چھڑی، چھری چاقو — لِب لباہٹ، لُعاب، کف، بدبو
لڑکھڑاہٹ، بلوتے، بڑ، ہذیان — بے کلی، نیند، بے خودی، نِسیان
طنز، آوازہ، برہمی، فساد — طعن، تشنیع، مضحکہ، ایراد
شور، ہُو، حق، اَبے تبے، بَے بَے — اوکھیاں، گالیاں، دھماکے قَے
مَس مَساہٹ، غشی، تپش، چکّر — سوز، سیلاب، سنسنی، صر صر
استحالہ، اَہانت، اِستحقار — اختراق، احتباس، استکبار
چِل پچے، چخ، پُٹاں، چُھپیں، چنگھاڑ — چُخ پُخے، چاؤں چاؤں، چیل چلھاڑ
معرکہ، مفسدہ، محاذ، مصاف — گونج، گالم گلوچ، گُرز، گراف
دُر دُبک، دور، دھرپخ، دوں دَوں — غُل غپاڑہ، غُنن غُنن غوں غوں
لپاڈگی، لتاڑ، لام، لڑائی — ہول، ہیجا، ہانک، ہاتھاپائی
اوبھ، اندوہ، آہ، اُف، آزار — اونگھ، آشفتگی، عَرق، ادبار
کھل بلی، کاؤں کاؤں، کھٹ منڈل — ہونک، ہنگامہ، ہم ہمہ، ہل چل
پینترے، پیچ، پشتکیں، پھنکار — ڈغ ڈغے، ڈھائیں ڈھائیں، ڈینگ ڈکار

الجھن، آوارگی، اُدھم، اینٹھن بھونک، بھوں بھوں، بھنن بھنن، بھن بھن
ڈھول دھپا، دھڑ پکڑ، دُھتکار تہلکہ، تو تڑاق، تُف، تکرار
جو، بھیک، بھے، بکس برر، بھونچال دبدبے، دندناہٹیں، دھمال
بل بلاہٹ، بُخار، بھناٹا غلغلہ، غُل، غریو، غنانا
گردش و گرد، گرمی و گرداب تشنگی و تکان و تندی و تاب

جو ان الفاظ کو نئی زندگی بخش دیتے ہیں جو نامانوس ہیں یا جنھیں عرفِ عام میں متروک کہا جاتا ہے۔ یا عمل اور اشیا سے پیدا شدہ اصوات، جن میں درشتی اور کرختی کے باوجود نفاست کا بھی ایک کردار ہوتا ہے، جوش کو بے حد للچاتی ہیں۔ اس قسم کے الفاظ زندگی کے احساسات کو تازہ دم رکھتے ہیں۔

لفظوں کے نئے نئے جھرمٹ خلق کرنے، نئے نئے لفظ گڑھنے، نئی نئی اور قدرے نامانوس ترکیبیں وضع کرنے اور رعایتوں کی کہکشائیں ترتیب دینے میں جوش کو کمال حاصل تھا۔ جو گہرے لسانی شعور ہی کی مظہر نہیں بلکہ تخلیقیت سے معمور بھی ہیں۔ جا بجا ضدوں کے جوڑے مرتب کرنے میں جوش اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کے دوسرے متعلقات بے جوڑ نہ معلوم ہوں۔ جیسے

علم کو تلخی و ترشی، جہل کو قند و نبات
خوب کو زہر ہلاہل، زشت کو آبِ حیات
نار کو روشن سویرا، نور کو تاریک رات
واہ کیا تیور ہیں اے انصافِ میرِ کائنات
مرحبا صد مرحباؤ آفریں صد آفریں
شکر اے جہاں آفریں الحمد للہ رب العالمین!

اس بند میں علم اور جہل، خوب اور زشت، نار اور نور جوڑے دار ضدین ہیں جوش

نے ہر ضد کے متعلقات کی رعایت کو برقرار رکھتے ہوئے معنی کے جو قماش مرتب کیے ہیں ان کے اپنے جواز ہیں۔ اس قسم کی مثالیں اور بیان و بدیع کے نت نئے پیرائے جوش کی شاعری میں جہاں تہاں بکھرے پڑے ہیں۔ انہیں پیرایوں کے پیچھے جوش کا ایک ایسا نظام فکر بھی کارفرما ہے جس میں انتشار کی کیفیت ہے۔ یعنی خیال کے ارتقا کی کوئی ایک رَو تہ بہ تہ جاری و ساری نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے اپنی کلیت میں ہر نظم کا اپنا ایک معنیاتی نظام ہوتا ہے۔ جس میں ایک خودرَوی کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ تاہم ہر معنی ایک وسیع الذیل معنی کے تابع ہوتا ہے، جو نظم کو اپنے محور سے اکھڑنے نہیں دیتا۔ جوش کے مراثی اور رباعیوں پر تو یہ بات صادق آتی ہی ہے ان کی نظمیں بھی اپنے کل سے زیادہ اپنے جزوں میں معنی کے دفتر کے دفتر کھول دیتی ہیں۔ طنز و ہجا اور طعن و تعریض سے متعلق جتنے دقیق اور نفیس طریقے ہوسکتے ہیں، انہیں آزمانے میں سودا کا نام یقیناً بہت بلند ہے، لیکن امکانات کے طور پر جو کچھ کہ ان چھوارہ گیا تھا، جوش کی دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ بہت سی مثالوں میں سے صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیں جسے میں نے نظم رشوت سے اخذ کیا ہے۔

اس گرانی میں بھلا کیا غنچۂ ایماں کھلے
جَو کے دانے سخت ہیں، تانبے کے سکّے پل پلے
جائیں کپڑے کے لیے تو دام سُن کر دل ہلے
جب گریباں تابہ دامن آئے تو کپڑا ملے

جان بھی دیدے تو سستے دام مِل سکتا نہیں
آدمیت کا کفن ہے دوستو کپڑا نہیں

صرف اک پتلون سلوانا قیامت ہوگیا
وہ سلائی لی میاں درزی نے ننگا کردیا
آپ کو معلوم بھی ہے چل رہی ہے کیا ہوا

صرف اک ٹائی کی قیمت گھونٹ دیتی ہے گلا
ہلکی ٹوپی سر پہ رکھتے ہیں تو چکراتا ہے سر
اور جوتے کی طرف بڑھیے تو جھک جاتا ہے سر
تھی بزرگوں کی جو بنیائن وہ بنیا لے گیا
گھر میں جو گاڑھی کمائی تھی وہ گاڑھا لے گیا
جسم کی اِک ایک بوٹی گوشت والا لے گیا
تن میں باقی تھی جو چربی گھی کا پیپا لے گیا
آئی تب رشوت کی چڑیا پنکھ اپنے کھول کر
ورنہ مر جاتے میاں کتے کی بولی بول کر

جوش کے مطالعے کے بے شمار عنوانات ہیں۔ میرا موقف بس یہ ہے کہ جوش کی اپنی ایک تشکیل کردہ کائنات ہے، جس پر صرف اور صرف ان کا اجارہ ہونے کے باوصف انیس، نظیر اور اقبال کے متون کی گونج سے وہ خالی نہیں ہے۔ جوش ہی نہیں کسی بھی شاعر کا متن دوسرے بہت سے متون کا زائدہ ہوتا ہے۔ جوش کے یہاں اثر و قبولیت کے معنی تبدیل محل یا Transposition کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایسی تقلیب پذیری کا عمل ہے جسے تغیر نوع یا تبدیلی جوہر کا نام دینا درست ہوگا۔ Transmutation

یادوں کی برات: ایک تہذیبی بازیافت

جوش ملیح آبادی نے اپنے بعض شعری مجموعوں میں اپنے تخلیقی عمل اور نظریۂ شاعری کے بارے میں جو مضامین لکھے تھے ان سے جوش کی نثر نگاری اور اسلوبیاتی انفرادیت کا نقش کم وبیش اسی طرح قائم ہوا تھا جس طرح ان کی شاعری سے زبان و بیان پر ان کی قدرت اور بلند آہنگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مگر اپنی شاعری سے متعلق ان کے مضامین تخلیقی اسلوب کو کم اور ترسیلی انداز اور اسلوب کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ البتہ ''نقوش'' کے شخصیات نمبر میں فانی بدایونی پر ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا اس میں جوش کی تخلیقی نثر کے عمدہ نمونے شامل ہیں۔ یادوں کی برات، نہ تو عام معنوں میں شخصی اور سوانحی کتاب ہے اور نہ صرف ایک شاعر کے تخلیقی محرکات کا بیان۔ خودنوشت سوانح کی صنف چونکہ تاریخ، سوانح اور ناول جیسے اسالیب اظہار سے خاص قریب ہوتی ہے اس لیے اس صنف میں لکھنے والا، سوانح نگاری کی واقعیت سے قدرے آزاد ہوتا ہے۔ وہ چونکہ اپنے

آپ کو ایک تاریخ نگار کے طور پر بھی نہیں پیش کرتا اس لیے تاریخیت کے جبر سے بھی اپنے آپ کو مشروط رکھنے پر مجبور نہیں ہوتا، اور اپنی تحریر کو ناول کا نام نہ دینے کے باعث پلاٹ اور کردار نگاری کے تقاضوں سے اس طرح عہدہ برا ہونا اس کے لیے لازمی نہیں ہوتا جس طرح ایک ناول نگار کے لیے بعض ضابطوں کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ خود نوشت سوانح کی صنف جہاں ایک طرف ان متذکرہ اصناف نثر کی پابندیوں سے بلند ہوتی ہے وہیں آپ بیتی لکھنے والا ان تمام اصناف کے مثبت پہلوؤں کو روبعمل بھی لا سکتا ہے اور اپنی خود نوشت کو اپنی ذات، اپنے معاشرے، اپنی تاریخ اور اپنے معاصر کرداروں کا نگار خانہ بھی بنا سکتا ہے۔ ''یادوں کی برات'' لکھتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے کسی مخصوص نوعیت کی صنفی ذمہ داری قبول نہ کرنے کے باوجود ان تمام سرچشموں سے فیض حاصل کرنے اور استفادہ کرنے کا ثبوت فراہم کیا ہے جن سرچشموں نے خود ان کی شخصیت اور ان کے زمانے کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

''یادوں کی برات'' کا مطالعہ متنوع اور مختلف قسم کے تاثرات یا ردعمل پیدا کر سکتا ہے۔ ایک تاثر یہ ہوسکتا ہے کہ یادوں کی برات، میں واقعہ نگاری کے نام پر غلط بیانی کو روا رکھا گیا ہے اور بہت سے شخصی اور تاریخی واقعات کو بھی غیر حقیقی اور غیر تاریخی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا تاثر مصنف کی خود پسندی اور نرگسیت کا ہوسکتا ہے، تیسرا تاثر اخلاقی اور مذہبی مسلمات پر کاری ضرب لگانے کا ہوسکتا ہے، ان تاثرات کے علاوہ ایک عام تاثر جوش کی خالص ذہنی اور تخیلاتی دنیا کی تصویر کشی اور اس تصویر کشی کے لیے ایک غیر معمولی اسلوب کی تخلیق کا بھی ہوسکتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کتاب کے بارے میں یہ تمام تاثرات پوری صداقت نہ ہونے کے باوجود جزوی صداقت کے طور پر اس طرح کے کسی بھی زاویۂ نگاہ کی تصدیق اور توثیق کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ آپ بیتی کی صنف کو اپنے وسیلۂ اظہار کے طور پر اپنانے کے باعث جوش اس طرح کا کوئی

بھی تاثر قائم کرنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ ''یادوں کی برات'' میں زبان اپنے آپ کو ایک الگ معروض کی حیثیت سے قائم کرنے میں کامیاب ہے، اور اس کتاب کا بیانیہ خارجی واقعات کی صداقت، واقعیت یا تاریخیت سے ماورا ہو کر ایک ایسی دنیا اور ایسے معاشرے کی تخلیق یا تعمیر میں مصروف ہے جو دنیا یا جو معاشرہ مصنف کی یادوں کا معاشرہ ہونے کے باوجود قاری کے جانے پہچانے معاشرے سے کسی قدر ملتا جلتا مگر بڑی حد تک مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اس بیانیہ سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ زبان کی تشکیل، جس حقیقت کی تخلیق کرتی ہے وہ واقعاتی پیش کش ہونے کے باوجود ایک طرح کی غیر مانوس مانوسیت کے تأثر سے بھی دوچار کرتی ہے۔

جہاں تک ''یادوں کی برات'' میں بیان ہونے والے واقعات کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں مصنف نے کتاب کی تمہید میں ہی اپنے حافظے کے ضعف کا اعتراف کرلیا ہے، اور یہ ضعف حافظہ کچھ اس نوعیت کا ہے جسے نہ تو قرین قیاس کہا جاسکتا ہے اور نہ قابل وثوق۔ جوش لکھتے ہیں کہ:

> میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی، صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے پہلے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لیے نکلا تھا، واپسی میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا..... اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔ چند سکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا، اور اگر دو چار سکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص نہ یاد آجاتا تو یقین فرمایئے کہ میرا دم نکل جاتا۔.... میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی کہ اگر

میری زندگی کے کسی واقعے میں کمی بیشی، یا تقدم وتأخر نظر آئے،
تو آپ اسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں، اور میری حالت پر ترس
کھا کر، اسے معاف کردیں۔ (ص ۱۳)

اس اقتباس کے آخری فقرے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جوش نے حافظے کے ضعف کی تمہید ہی اپنی غلط بیانی کے جواز اور حفظ ماتقدم کے طور پر باندھی ہے۔ 'یادوں کی برات، میں 'ابتدائی باتوں کے عنوان' سے اس نوع کی اور بھی جو پیش بندیاں کی گئی ہیں وہ دراصل افسانہ طراز ذہن کے کھل کھیلنے اور نری واقعیت یا تاریخیت سے اجتناب برتنے کی خاطر ہیں۔

یادوں کی برات، کے ابتدائی صفحات میں ایک عنوان 'خودکشائی' کا قائم کیا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت جوش صاحب نے اپنی زندگی کے بنیادی میلانات، شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی، بتائے ہیں۔ شعر گوئی، کے علاوہ دوسرے میلانات کی توثیق ان کی زندگی کے حقیقی واقعات سے کس حد تک ہوتی ہے؟ یہ تو ان سے قریبی واقفیت رکھنے والا شخص ہی بتا سکتا تھا، البتہ جوش صاحب نے اپنی کتاب میں اپنے بیانات سے ایک ایسا خاکہ مرتب کرلیا ہے جو ان کے بیان کردہ شخصی میلانات کی منصوبہ بند تصدیق کرتا ہے، اور اس منصوبہ بندی سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی معمولی حافظے کا مالک اتنی طویل خودنوشت کا خاکہ اس جامعیت کے ساتھ مرتب نہیں کرسکتا کہ اپنے تسامح، خیالی دنیا کی تعمیر، حتیٰ کہ غلط بیانیوں تک کا جواز کتاب کے ابتدائی حصے میں پہلے سے موجود رکھا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش صاحب اول وآخر ایک شاعر تھے، اور شاعری میں ان کے امتیازات نے ان کو اس بات کا حق دے رکھا تھا کہ وہ اپنی خودنوشت میں جا و بے جا اور موقع بے موقع اپنی شاعری اور شعری نقطۂ نظر کا جواز فراہم کرتے اور اپنی شاعری پر وارد ہونے والے اعتراضات کی مدافعت کرنے کی کوشش کرتے۔ اس معاملے میں

انہوں نے نہ صرف احتیاط اور توازن کا ثبوت دیا ہے بلکہ شاعری کے سلسلے میں بعض مقامات پر ایسا حقیقت پسندانہ انداز اختیار کیا ہے جو اپنی شاعری پر ان کے اعتماد کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے اور یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ وہ مروجہ تنقیدی رایوں کو کس حد تک نا قابل اعتنا تصور کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کو بے ساختہ اظہار بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> شاعری میری حاکم ہے، میں محکوم، وہ جابر ہے، میں مجبور، وہ قاہر ہے میں مقہور، وہ آمر ہے اور میں مامور۔۔ شاعری کے باب میں بعض بزرگوں نے ایک خاص دینی مصلحت کی بناء پر، یہ عجیب کلیہ وضع فرمایا ہے کہ صرف اس موزوں کلام پر شعر کا اطلاق ہوگا جو 'بالقصد' کہا گیا ہو۔۔ اگر یہ کلیہ تسلیم کرلیا جائے، تو چونکہ میں نے آج کی تاریخ تک ایک مصرع بھی بالقصد موزوں کرنے کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اس لیے آپ کو اختیار کامل ہے کہ میرے تمام کلام کو شاعری سے کلیتہً خارج فرما کر میرے غیر شاعر ہونے کا اعلان فرما دیں۔ میں خوش، میرا خدا خوش۔

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنے شعری انتخابات میں شاعری کے بارے میں اپنے نظریے کا جس طرح اظہار اور اپنے نقطۂ نظر پر جتنا اصرار کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اپنی خود نوشت لکھتے ہوئے، جب وہ تقریباً نصف صدی تک شاعری کر چکے تھے، تعلّی اور تفاخر کا بلند بانگ دعویٰ کرتے۔ مگر وہ جس توازن اور انکسار کا رویہ اختیار کرتے ہیں وہ 'یادوں کی برات'' کے پورے مزاج سے مختلف اور خود جوشؔ صاحب کی افتادِ طبع کے برخلاف معلوم ہوتا ہے۔

> جھوٹ کیوں بولوں، میرے گوشِ مبارک میں بھی، شاعری یہ افسوں پھونک چکی ہے کہ حضور اقدس و اعلیٰ اس بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی اشعر الشعرا ہیں لیکن قوت وحیات کا

لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عقل بیمار نہیں ہے.... بے شک یہ
ہوسکتا ہے کہ آپ شاعر یا بہت بڑے شاعر ہوں۔ لیکن اُسی
طرح اس کا بھی مساوی امکان ہے کہ آپ معمولی شاعر، بُرے
شاعر یا سرے سے شاعر ہی نہ ہوں اس لیے دانائی یہی ہے کہ
ابھی آپ اپنے باب میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کریں۔

اس حزم و احتیاط اور توازن کو کم از کم اپنی شاعری کے سلسلے میں انہوں نے پوری کتاب میں برقرار رکھا ہے اور مشکل ہی سے دو ایک جگہ کے علاوہ کہیں اور اپنی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرانے کی کوشش کی ہے۔ جوش ملیح آبادی جیسے ممتاز شاعر کے لیے اپنی خودنوشت لکھتے ہوئے اس باب میں ضبط نفس کا ایسا ثبوت ایک غیر معمولی بات ضرور معلوم ہوتی ہے۔

یادوں کی برات، واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ مصنف کی ذاتی زندگی، ذہنی اور تخلیقی محرکات، خاندان، ملازمت، نقل مکانی اور معاشقوں سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ چند قابلِ ذکر احباب اور اپنے دور کی چند عجیب ہستیوں کے خاکوں پر مبنی۔ ان خاکوں میں ہماری ملاقات بعض ایسی نامور ہستیوں سے بھی ہوتی ہے جن کو ہم ان کے کارناموں کے باعث جانتے ہیں مگر بیش تر خاکے ان لوگوں کے ہیں جو نہ تو کوئی سماجی، علمی یا فنی امتیاز کے باعث جانے جاتے ہیں اور نہ ان کو پہلے سے کوئی شہرت حاصل ہے۔ یہ سارے لوگ ایک طرح سے گمنام لوگ ہیں جو جوشؔ صاحب کے قلم سے زندہ جاوید ہوتے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک آپ بیتی کی صنف کے اطلاق کا سوال ہے، تو بنیادی طور پر وہ پہلا حصہ ہی 'یادوں کی برات' کے صنفی دائرۂ کار کا حصہ ہے۔ اس حصے میں ذاتی احساسات یا واردات کا بیان ہو یا اپنے معاصر معاشرے کی پیش کش، جوش صاحب نے واقعات کی خارجی سطح سے کہیں زیادہ ان واقعات کے بارے میں اپنے ذاتی اور داخلی ردعمل سے سروکار رکھا ہے۔ اس اعتبار سے جوش صاحب کے ذاتی یا تجرباتی معاملات ایک قسم کے ناسٹیلجیا کا

روپ اختیار کر لیتے ہیں اور ناسٹیلجیا کے روپ میں جہاں ایک طرف بیانیہ کی غیر معمولی قوت بن کر نمودار ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف یادوں کے حوالے سے ان کی قلبِ ماہیت بھی ہو جاتی ہے۔ اس قلبِ ماہیت کا سب سے بڑا نمونہ اس کتاب کا وہ باب ہے جو مصنف کے معاشقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں تو یادوں کی اس برات میں اشخاص اور واقعات بھی شامل ہیں مگر اشخاص اور واقعات کے حوالے سے جو چیز یادوں کی اس برات کے جاہ و جلال اور تزک و احتشام کا تاثر قائم کرتی ہے وہ ان کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی وہ تہذیبی بازیافت ہے جو اشیا اور واقعات کو قوت اور توانائی فراہم کرتی ہے۔ اس طرح آپ بیتی کا حصہ بھی دو اجزا میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک کا تعلق جوش صاحب کی زندگی کی سرگزشت اور واقعات کی خارجی منطق سے ہے اور دوسرے کا تعلق ثقافتی اور تہذیبی جوابوں سے۔ جہاں تک جوش کی سرگزشت اور واقعات کی خارجی شکل وصورت کا سوال ہے تو اس ضمن میں وہ ہماری ملاقات اپنے عزیز و اقارب، احباب، ادبی اور سماجی رشتوں اور ان متعدد شخصیتوں سے کراتے ہیں جنہوں نے انہیں کسی نہ کسی اعتبار سے متاثر کیا۔ ان تفصیلات کے بیان میں یادوں کی برات، میں واضح طور پر دو طرح کے اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ جہاں کہیں مصنف محض اپنے بیانیے سے کام لیتا ہے وہاں واقعات کی منطقی ترتیب بروئے کار لائی گئی ہے اور جہاں اس کا مقصود واقعات یا تجربات کی خارجی سطح کے ساتھ داخلی سطح کو بھی نمایاں کرنا ہوتا ہے وہاں واضح طور پر استعاراتی اور تخلیقی زبان کا سہارا لیا گیا ہے۔ جوش صاحب نے ایک جگہ اپنے والد کی وفات اور اس کے کچھ عرصے کے بعد اپنی شادی کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

> میرا سا بدبخت و بدنصیب دولہا کون ہوگا۔ شادی کا جوڑا مجھے اس وقت پہنایا گیا جب کہ میرے باپ کا کفن ابھی میلا نہیں ہوا تھا۔ اور میرے سر پر اس وقت سہرا باندھا گیا جب کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برس رہی تھیں۔ میرے

پھاٹک کی شہ نائیوں کی آوازوں میں نوحے تیر رہے تھے۔ میری
ہتھیلی کی مہندی کے رنگ سے میرے دل کا خون ابل رہا تھا۔
تاشوں کی جھنکار کفِ افسوس مل رہی تھی۔ اور مجھ نامراد کی شادی
کے دوش پر میرے باپ کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔

اس اقتباس کے تمام فقروں میں شعری اور تخلیقی وسائل اختیار کیے گئے ہیں۔ ہر فقرہ مرکب تشبیہ کی ایسی اکائی ہے جس میں تضاد کی صنعت کے پس منظر میں تشبیہی یا استعاراتی پیکر ابھارا گیا ہے، شادی کے جوڑے کے ساتھ کفن، سہرا کے ساتھ آنسوؤں کی لڑیاں، شہ نائیوں کی آواز کے ساتھ نوحہ، مہندی کے ساتھ دل کا خون، تاشوں کی جھنکار کے ساتھ کفِ افسوس اور شادی کے دوش کے ساتھ جنازہ جیسی پیکر تراشی، جوش کے تخلیقی اسلوب کی ادنی سی جھلک ہے۔ اس اسلوب کی معراج اس وقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب وہ فضا آفرینی کی کوشش کرتے ہیں۔ گاؤں کا منظر، ہو یا کسی ریت رواج کا ذکر، کسی شخصیت کی ہشت پہل تصویر دکھائی ہو یا خود اپنے حسن وشباب کا تذکرہ، جب وہ اپنے موضوع کے گرد فضا سازی کا ہالہ تیار کرنا چاہتے ہیں تو کم وبیش اس میں عمدہ شاعری جیسا ارتفاع پیدا کر دیتے ہیں۔ جوش صاحب کی شاعری میں الفاظ کی کثرت اور شعری منظرنامے کو مترادفات کی تکرار کے ذریعے ایک نقطے پر مرتکز کر دینے کا جو الزام ان پر اکثر ہماری تنقید نے عائد کیا ہے، اس طرح کے انجماد سے ان کی تخلیقی نثر آزاد دکھائی دیتی ہے۔ شاید اس باعث رشید حسن خاں نے ان کے انشائیہ اسلوب کا موازنہ ان کے شعری اسلوب کے ساتھ ان الفاظ میں کیا ہے:

یہ دلچسپ بات ہے کہ الفاظ کی کثرت اور تشبیہوں، استعاروں
کی فراوانی نے ان کی شاعری کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔
اس معنی میں کہ معنی کی توسیع کے بجائے تکرار کو اصل چیز بنا
دیا ہے۔ لیکن انہی اجزاء نے 'یادوں کی برات'' کی نثر کو بے

مثال دل کشی عطا کی ہے۔ یہاں ہم معنی یا قریب المفہوم لفظوں کی تکرار اور تشبیہوں، استعاروں کی کثرت مرقع نگاری کے انداز کو روشنی بخشتی ہے، اور جس چیز، منظر یا واقعے کا بیان ہے اس کو جگمگا دیتی ہے (تفہیم، ص ۴۷)

یہ بات درست ہے کہ ''یادوں کی برات'' میں جس جوش سے ہماری ملاقات ہوتی ہے وہ غیر معمولی طور پر خود پرستی اور نرگسیت کا اسیر ہے، اور جہاں کہیں اپنے بچپن، اپنی جوانی یا اپنی شکل وصورت کے ذکر کا انہیں موقع مل جاتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک آئینہ خانے میں بنتا اور سنورتا دیکھنے کی کوشش میں اس طرح مصروف ہو جاتے ہیں کہ آرائش جمال سے فارغ ہونا ان کے لئے ایک مشکل امر بن جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنے خاندان، اپنے معاصرین اور اپنے معاشقوں تک میں ان کا ذاتی حوالہ کہیں بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ حافظے کے ضعف کی پیش بندی اور حسن وعشق کی داستانوں میں یہی بنیادی محرک کارفرما نظر آتا ہے۔ محبت کے معاملے میں بھی ان کی توجہ اپنے آپ کو عاشق ثابت کرنے پر کم اور معشوق بنا کر پیش کرنے کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ جوش صاحب نے اپنے جبلی محرکات میں انسان دوستی کا ذکر کثرت سے اسی خاطر کیا ہے تا کہ وہ اپنی نرم دلی، رقت اور وسیع القلبی کا نغمہ گا سکیں۔ اس طرح کے کسی بھی منظر نامے میں ان کی ذات کے ساتھ ان کے گرد وپیش کی ثقافت اور تمدنی اقدار بھی پس منظر کا رول ادا کرتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کتاب ایک انانیت پسند، خود پرست اور نرگسیت میں مبتلا انسان کی آپ بیتی بن کر رہ جاتی۔ جن نقادوں نے جوش صاحب کی یادوں کے حوالے سے ان کی افسانہ طرازی اور خیالی دنیا کی تعمیر پر اعتراضات کیے ہیں انہیں شاید اس حقیقت کا احساس نہیں کہ اس کتاب میں جوش کی خود مرکزیت بھی تہذیبی اور ثقافتی حوالوں کے باعث ایک بڑا اور وسیع سیاق وسباق اختیار کر لیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو محض ایک فرد کے طور پر پیش نہیں کرتے، بلکہ ان کی پیش کش کے انداز

اور ہمہ گیر تمدنی تناظر نے فرد کو ایک دبستان کی حیثیت بخش دی ہے۔

اگر آپ ''یادوں کی برات'' کا مطالعہ فردِ واحد کے حوالے سے ایک مٹتی ہوئی تہذیب کی بازیافت کے طور پر کریں تو ان کی غلط بیانیاں بھی اپنا جواز پیدا کر لیتی ہیں۔ اکثر ناقدینِ جوشؔ نے ان کے معاشقوں، ان کے آباء واجداد کے ذکر، حتیٰ کہ رسول کریمؐ کو خواب میں دیکھنے اور بشارت دینے کی صداقت پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رویہ بھی ایک قسم کا ثقافتی رویہ ہے جس کے باعث انسان اپنی ضرورت، تلاشِ معاش اور دربدری کو بھی شریفانہ حیلوں اور تاویلوں کے پردے میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ جوشؔ صاحب نظام حیدر آباد سے اپنی ضرورت کا برملا اظہار کرتے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک ایسے خواب اور ایسی بشارت کا سہارا لیا جو اپنے آپ ان کے لیے وسیلۂ ملازمت بن گئی۔ اب یہ بات بہت بامعنی نہیں رہ جاتی کہ حیدر آباد سے قبل جوشؔ صاحب نے والیٔ ریاست کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا تھا اور اس طرح دربار میں باریابی کا ماحول تیار کیا تھا۔ البتہ اس نوع کے واقعات جوشؔ صاحب کی اخلاقیات پر ایک طرح کا سوالیہ نشان ضرور قائم کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ''یادوں کی برات'' کے پورے خاکے میں ایسا کوئی منظر نہیں جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ایک صادق القول اور اعلیٰ اخلاقی مدارج پر فائز انسان بنا کر پیش کرنا چاہتے ہوں۔ یہ آپ بیتی کی صنف کا تقاضہ اور آپ بیتی لکھنے والے شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ آپ بیتی کو اپنے نقائص کی پردہ پوشی کا کاغذی پیرہن بنانے کے بجائے، جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرے۔ اس کوشش میں نہ صرف یہ کہ جوش صاحب کامیاب نظر آتے ہیں بلکہ وہ بعض سماجی مسلمات سے نجات حاصل کرنے کو خاصی جرأت اور جسارت کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی بے راہ روی کو اپنا بنیادی حق سمجھتے ہیں۔ اور مذہبی اور سماجی قدغنوں کو ایک طرح کی رومانی اور باغیانہ نظریہ سازی

کے ذریعے رد کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو ہمدردی اور انسان دوستی کی خاطر جواب دہ ضرور محسوس کرتے ہیں۔ یوں تو ان کی زندگی کے اہم واقعات میں غربت وافلاس اور پس ماندہ عوام کے لیے کسی بڑے واقعے کا ذکر نہیں ملتا، مگر نظریاتی سطح پر ہی سہی ان کی شاعری اور نثر میں اِس کا حسّی اور جذباتی اظہار ضرور ملتا ہے۔ وہ ایک مقام پر اپنی رقیق القلبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> جب کسی مفلس کے گھر کے چولہے میں آگ روشن نہیں ہوتی، میرے سینے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ جب کسی یتیم کی پسلیاں نظر آتی ہیں، میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں۔ جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے، میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں، اور جب کسی کے گھر سے جنازہ نکلتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔

ان جملوں میں زبان و بیان کا حسن اپنی جگہ مگر یہاں بھی مرکزیت اس شخص کو حاصل ہے جو ایسا کچھ محسوس کرتا ہے۔ یہاں بھی ذاتی حوالہ اور نجی احساس اور جذبہ بنیادی نوعیت اختیار کرلیتا ہے اور پڑھنے والے کو مصنف کا گردوپیش خود مصنف کی رگ و پے میں مرکوز نظر آنے لگتا ہے۔

یادوں کی برات، میں خود مصنف اور مصنف کے وسیلے سے اس کا خاندان، اس کے معاصرین، اور مجموعی طور پر اس کی نشوونما میں شامل تہذیبی اور تمدنی صورتِ حال کیوں کر یادوں کے محور پر گردش کرتی نظر آتی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے بیانیہ میں ذات اور غیر ذات کا فرق مٹ گیا ہے۔ مصنف اپنے آپ کو ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نمائندہ بنا کر پیش کرتا ہے اور جاگیردارانہ تمدن اپنے پورے تزک و احتشام کے

ساتھ مصنف کی ذات میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وارث علوی نے اپنے ایک مضمون میں 'آخر شب کے ہم سفر' پر اظہار خیال کرتے ہوئے جب 'یادوں کی برات' کو 'شب گزیدہ'، 'بستی اور آخر شب کے ہم سفر، جیسے ناولوں کی صف میں رکھا تھا تو بعض ادبی حلقوں میں اس نقطۂ نظر پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا گیا تھا۔ مگر صنفی حد بندیوں سے ماورا ہو کر اگر تہذیبی سیاق وسباق کے اعتبار 'یادوں کی برات' کے بیانیہ کا موازنہ ان متذکرہ ناولوں سے کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ یادوں کی برات میں ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے جاہ وجلال کی جیسی غیر معمولی بازآفرینی میں ملتی ہے اس کا جواب شاذ ونادر ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ 'جاگیرداری یا زمین داری' اشترا کی فلسفے کی آمد اور لبرل طرز فکر کے فروغ کے ساتھ ساتھ جس حد تک بھی معتوب اور مذموم ہو کر رہ گئی ہو، مگر اس جاگیردارانہ نظام نے جس تمدن اور ثقافت کو پالا پوسا تھا وہ تمدن بہر حال برصغیر کے لیے ایک ایسا سرمایۂ افتخار ہے جس کے باعث زندگی کے تمام شعبوں میں شائستگی، نفاست، احساس جمال اور فنون لطیفہ کا ایک دریا سا موجزن رہا ہے۔ اس ثقافت اور تمدن کا خاتمہ ان تمام اقدار کے خاتمے کے مترادف ثابت ہوا، جو اس تمدن سے وابستہ تھیں۔ اس لیے مٹتی ہوئی تہذیب وتمدن کا کوئی بھی نوحہ محض تاریخ کی بازگوئی نہیں بلکہ تہذیب کی بازیافت بن جاتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے آپ کو صرف نوحہ خوانی تک محدود نہیں رکھا بلکہ تہذیبی آثار کو اپنے حساس اور موثر قلم سے جیتی جاگتی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ انہوں نے یادوں کی برات میں ایک عنوان ''میرے عنفوان شباب تک کا ہندوستان'' قائم کیا ہے۔ اس باب میں جوش نے ہندوستان کی اپنی مشرقی اقدار اور مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے تحت ایک قسم کی تہذیبی کشمکش کی صورت حال دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس صورت حال میں جوش خود کو مشرقی تہذیب کے دلدادہ کے طور پر ہی پیش کرتے بلکہ اپنی پرانی قدروں کے لیے ان کا احساس افتخار بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ یادوں کی برات میں ہولی، دیوالی، شب برات، رمضان، عید اور بقرعید اور محرم جیسے تہذیبی

مظاہر کا بڑا بھرپور ذکر ملتا ہے۔ ان کے ذکر میں مذہبی عناصر کو پس منظر میں رکھ کر ثقافتی سطح پر ان موقعوں پر اپنائی جانے والی روایات اور رسوم و رواج یا ان سے متعلق سماجی معروضیات کی تفصیلات تہذیبی مرقعوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ جوش صاحب امام حسین کی شخصیت کو بھی ایک تہذیبی قدر کے نمائندے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

> وہ حسینؓ، جس کے نظامِ انفاس کی اطمینان آمیز ہمواری کی زد پر میدانِ کربلا کی بادِ سموم کا دم ٹوٹ گیا تھا۔ جس کے لبوں کی خشکی دیکھ کر فرات کی موجیں آب آب ہو کر رہ گئی تھیں اور جس کے چہرے کی شادابی کو دیکھ کر کربلا کے تپتے سورج کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں..... لیکن میری زبان سے ان اعیانِ ممکنات کی تعریف سن کر اس مغالطے میں نہ پڑ جایئے گا کہ میں کسی دینی یا اعتقادی بنیاد پر اُن کا مدح سرا ہوں۔ میرے ان کے مابین جو رابطہ ہے وہ صرف انسانی صفات کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

''یادوں کی برات'' میں ذکر خواہ ملیح آباد کا ہو، لکھنؤ کا، آگرہ اور علی گڑھ کا یا پھر حیدر آباد کا، ہر مقام پر جوش صاحب کو تہذیبی حوالے ہی واقعات کے انتخاب یا عدم انتخاب میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ایسا حیرت انگیز تنوع ہے کہ تہذیبی مرقعوں کے ساتھ شخصی خاکوں، خاندان کے لوگوں، تیجے تیوہاروں، ادبی مناقشوں، حتیٰ کہ معاشقوں اور لطیفوں کے بھی متعدد نمونے مل جاتے ہیں، مگر جوش صاحب کی بنیادی دلچسپی کی نوعیت کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بنیادی سروکار تہذیبی اور ثقافتی ہے۔ اس لیے جہاں کہیں وہ اپنے اس مرکز بے حوالے دور گئے ہیں وہیں افراط و تفریط کے شکار ہوئے ہیں۔ تقسیم ہند کے سلسلے میں انہوں نے ایک طرف تو تقسیم کے عمل پر اظہار خیال

کیا ہے اور دوسری طرف اپنی ہجرت اور پھر پاکستان سے واپسی اور پھر دوبارہ نقل مکانی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس طویل بیان میں ان کی سادگی، سادہ روحی کی حدوں کو چھو لیتی ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ سیاسی ریشہ دوانیوں کے اسرار و رموز ان کی دسترس سے یکسر باہر رہے۔ وہ جہاں جواہر لال نہرو سے اپنے قریبی تعلقات اور بعض دوسرے ہندستانی اور پاکستانی زعماء سے بے تکلفی کا ذکر کرتے ہیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فن کارانہ سادگی ہر تبسم اور تکلم کو محبت اور قربت کا نام دے دیتی ہے۔ اس کے برخلاف سماجی اور انسانی سطح پر جب وہ اپنے خاکوں میں معروف اور غیر معروف لوگوں کی تصویر کشی کرتے ہیں تو گویا ان کو آر پار دکھانے پر قادر نظر آتے ہیں۔ اپنے چند قابل ذکر اور مشہور معاصرین کے تذکرے کے بعد جوش صاحب نے 'میرے دور کی چند عجیب ہستیاں' کے عنوان سے بعض غیر اہم اور غیر معروف لوگوں کے قلمی مرقعے لکھے ہیں۔ ان قلمی تصویروں میں انہوں نے معمول کو غیر معمول اور غیر اہم کو اہم بنا کر پیش کرنے کا ایسا ہنر دکھایا ہے جو خاکہ نگاری کا نقطۂ عروج معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے قلم کے وسیلے سے مردہ لوگوں میں جان ڈالنے کا ہنر دکھلاتے اور فراموش کردہ لوگوں کو ناقابل فراموش بنا دیتے ہیں۔

جوش صاحب نے شخصی خاکوں میں بھی اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ پرانی تہذیبی قدروں کی نمائندگی خواہ کسی معروف شخص کے ذریعے ہوتی ہو یا غیر معروف شخص کے وسیلے سے، ان کو ایک ثقافتی نمائندے کے طور پر پیش کیا جائے۔ ان کے لیے انسان اور تہذیبی مظاہر، دونوں کے بیان کا زاویہ ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آمیز ہے۔ تہذیبی مظہر کے طور پر انہوں نے ایک مقام پر عید کا ایک پہلو یوں دکھایا ہے:

> عیدگاہ سے پلٹتا تو یہ دیکھا کہ بڑی سریلی آواز میں میرے
> پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے۔ میرے باپ کا دربار جما ہوا ہے۔
> احاطے میں وہ ہجوم ہے کہ تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں ہے۔

صحن کے ایک گوشے میں گوٹے پٹھے کے انگرکھے پہنے اور سروں پر گول مندیلیں رکھے ہوئے چھلب دار دف بجا بجا کر گا رہے ہیں۔ اور چاندی کے ورق سے ڈھکے ہوئے سوئیوں اور شیر خرمے کے تھال حاضرین کے درمیان رکھے ہوئے ہیں، اور خاص دان و عطردان گردش کر رہے ہیں.....اور سپاہی برہنہ تلواریں ہاتھ میں لیے سلامیاں دے اور انعام لے رہے ہیں۔

یہ اور اس طرح کے ان گنت اقتباسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جوشؔ صاحب کو تہذیب و ثقافت کے کتنے باریک اور نازک ارتعاشات کو ریکارڈ کرنے اور گرفت میں لینے کا ہنر آتا ہے۔ وہ جوٹی، ایس، ایلیٹ نے لکھا ہے کہ ''جب فن کار خود کو لکھتا ہے تو وہ دراصل اپنے عہد کو لکھتا ہے۔'' سو جوشؔ ملیح آبادی نے بھی 'یادوں کی برات' کی صورت میں ایک پورے عہد اور جاہ و جلال پر مبنی متمول تہذیبی علامتوں کو اپنی خودنوشت کے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے۔

وہاب اشرفی

مراثیِ جوش کی عصری معنویت

بہت سے لوگ اس امر پر ایقان اور ایمان رکھتے ہیں کہ انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری دراصل وہ منزل تھی جب یہ صنف اپنے ارتقائی سفر کے اختتام پر پہنچ چکی، اس میں ترفع کی گنجائش نہیں، ان کے بعد کے لکھنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش کی ہے۔ گویا یہ صنف متذکرہ دو عظیم بزرگوں کے بعد Stale ہو چکی۔ اب جب صورت یہ ہو تو پھر اس صنف میں پہنچنے کی صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ اس میں متعینہ خدوخال کو اٹوٹ نہ سمجھا جائے اور زمانے اور حالات کے تقاضے کے تحت اس میں ضروری تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ اس امر کو شاد عظیم آبادی نے شدت سے محسوس کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ انیس و دبیر کے مدارج سے آگے بڑھنے کی سعی کی جائے اور اس صنف میں نئے امکانات پیدا کیے جائیں۔

"ان کا اپنا بیان ہے کہ سید صاحب کے نزدیک مختلف مرثیہ گوئی میں اگر کوئی دل پسند و دلکش و موثر اور اردو نظم کے بالکل مناسب طریقہ اور احاطۂ سخن ہے تو وہ میر انیس کا ہے۔

وہ دل سے اس کے قائل ہیں کہ جن مضامین کو وہ جس اسلوب سے باندھ گئے ہیں۔ ناممکن ہے کہ دوسرا شخص اس سے اچھے اسلوب سے باندھ سکے، فرض کرو کہ کسی نے بڑی کاوش سے اس حد تک اپنے کو پہنچا بھی دیا اور یہ بھی فرض کرلو کہ کلام میں بھی وہی بات پیدا ہوگئی تو جب تک کوئی نہ کوئی دل پسند جدت نہ کرے، اس آفتاب درخشاں کے آگے اس کا چراغ کب جل سکتا ہے اور جب یہ نہ ہوا تو چبائے ہوئے اور گلے ہوئے نوالوں کو پھر چبانے کا کیا نتیجہ۔ میر نواب مونس مغفور انہیں کے بھائی (جن کی نسبت خود سید صاحب کے سامنے میر انیس نے کہا کہ اس کا قلم سولی پر بھی نہیں رُک سکتا) وغیرہ وغیرہ کو لیجیے۔ حق یوں ہے کہ میر انیس کے بعد اگر دیکھا جائے تو مونس کو اس میں ید طولیٰ ہے مگر میر انیس کے مقابلہ میں ان کا کوئی نام نہیں لیتا۔ پھر اگر اس طرز میں کوئی جدت نہ ہوئی تو کیا حاصل۔ علاوہ اس کے اب زمانہ بدلتا جاتا ہے۔ علم و فن کی ترقی ہوتی جاتی ہے، لوگ شاعری میں بھی صداقت و صحت بیان (جتنی بھر صداقت و مقتضائے معنی حال شاعری کے لیے درکار ہے) خواہاں ہوتے جاتے ہیں۔ مذہب کی رو سے بھی صحت روایات کی پابندی ضروری ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا امور کا لحاظ رکھ کر مرثیے کہے جائیں تو اہل علم تو شاید پسند کرلیں گے پرانی شاعری کے شائق اور ایسے سخن سنج جو میر انیس کے کلام کے دلدادہ ہیں کب پسند کریں گے۔ بلکہ عجیب نہیں کہ نظم لکچر کا اس کو لقب دیدیں۔" (شاد کی کہانی شاد کی زبانی"۔ صفحہ ۱۵۶ تا ۱۵۸)

لیکن ایسے احساسات کے باوجود ان کا اپنا بیان ہے کہ وہ کوئی بند کہہ کے اور اسے میر انیس کا بتادیتے تو کوئی فرق محسوس نہ کرتا۔ حالانکہ اس زمانے میں علی مرزا، ننھے آغا، حافظ سید احمد اور مولوی محمد تکی موجود تھے جو میر انیس اور دبیر کے کلام کے اتنے شناسا تھے کہ وہ کسی بھی الحاق بند یا شعر کو انیس و دبیر کے کلام سے ممیز کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن شاد کی اس معاملے میں وہ بھی گرفت نہ کرسکے۔ شاد نے اسے اپنے وصف کے طور پر بیان

کیا ہے لیکن اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ شاد کوئی ایسی نیرنگی نہیں پیدا کر سکے جو روایات سے یکسر الگ ہو کر اپنی شناخت کروا سکیں، لیکن یہ سچ ہے کہ انہوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ جس طرح چہرہ مرتب کیا جاتا ہے، تمہیدی مضامین سامنے لائے جاتے ہیں۔ کوفہ کا بیان ہوتا ہے۔ صبح کی کیفیت سامنے لائی جاتی ہے۔ رخصت کا بیان کیا جاتا ہے، صف آرائی کی تفصیل سامنے آتی ہے۔ میدان جنگ کی حالت کا ذکر ہوتا ہے، گرمی کی شدت کا احساس دلایا جاتا ہے، پیاس کی حدت کا عالم پیدا کیا جاتا ہے، فوج مخالف کو امام حسین کے پند ونصائح سے آشنا کیا جاتا ہے، میدان رزم، تلوار اور گھوڑے کی تعریف کی جاتی ہے، امام کی نماز کے احوال رقم کیے جاتے ہیں۔ مرثیوں میں اخلاقی فلسفہ پیش کیا جاتا ہے، امام کے ساتھ دوسروں کی شہادت کے احوال رقم کیے جاتے ہیں اور آخرش اہل بیت کے بین کا بیان ہوتا ہے یہ سب کے سب فطری نظر نہیں آتے جبکہ مرثیوں کو زندگی یعنی حقیقی زندگی کے کیف وکم سے لبریز ہونا چاہیے۔ شاد نے اجتہاد کی کوشش تو کی لیکن ان کے عقیدے کی عقبی زمین انہیں بہت دور نہیں لے جاسکی اور وہ امکانات نہیں پیدا ہوئے جو جدید مرثیے کے خدوخال پیدا کر سکتے تھے۔

میرے پیش نظر عاشور کاظمی کی کتاب ''اردو مرثیے کا سفر'' ہے جس میں بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگاروں پر بھی توجہ کی گئی ہے۔ گویا یہ کتاب سولہویں صدی سے بیسویں صدی تک کے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں پر محیط ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر مرثیہ نگار روایات کے شکنجے سے آزاد نہ ہو سکے اور ان کے ذہن ودماغ پر کلاسیکی مرثیوں کی چھاپ نمایاں رہی ہے، گویا آج کی زندگی کے جو تقاضے ہیں وہ سینکڑوں مرثیہ نگاروں کے مرثیوں سے پورے نہیں ہوتے۔ ہاں جوش کی ایک شخصیت بے حد منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے جنہوں نے رسمیات سے گریز کیا ہے۔ عمومی طور پر مرثیوں کے جو کلاسیکی تقاضے ہیں ان سے الگ تھلگ رہنے کی سعی پیہم کی ہے۔ مرثیے کی روایات میں جو ماورائیت اور روحانی

اوصاف کی نمائندگی کی جاتی رہی ہے اس سے گریز نیز عقیدے کے چہار دیواری میں رہنے کے باوجود ان سے نکلنے کے لیے حضرت امام حسینؑ کو نئے تقاضوں کے تحت دیکھنے اور ایک انقلابی اور استحصال کے خلاف جنگ کرنے والے ایک لافانی پیکر کے جو مظاہر سامنے لائے وہ ان کے اپنے فکری میلان اور حضرت حسینؓ کے باب میں یا پورے کربلا کے سلسلے میں قطعی ایک نئے نقطۂ نظر کی تشکیل کی راہ ابھاری، یاد رکھنا چاہیے کہ جوش ایک جاگیردارانہ نظام کے پروردہ تھے۔ انہوں نے اس نظام میں خود پسندی، مطلق العنانی، حق تلفی، قوت اور طاقت کی پرستش، کمزوروں کا استحصال وغیرہ ایسے پہلو تھے جن سے وہ آشنا تھے۔ جوش کے سامنے حضرت حسینؓ کا ایک مثالی کردار تھا جو حق کے ساتھ تھے۔ جنہیں کسی کو غلام بنانا نہیں تھا۔ مظالم کے خلاف سینہ سپر ہونا تھا اور ظالم و ظلم کو ہمیشہ کے لیے دفن ہونا تھا۔ حسینؓ ابن علی ایسے علمبردار تھے جس کی کوئی مثال اس وقت تک دنیا میں کوئی قائم نہیں ہوئی تھی اور آج بھی کربلا یا واقعات کربلا ایسی علامتیں ہیں جن سے باطل کے خلاف حق کی فتح و نصرت کا علم بلند کیا جاتا رہا ہے۔ ''حسین اور انقلاب'' میں جوش نے امام حسینؓ کو ایک مثالی کردار کے طور پر پیش کیا ہے اور ''آوازِ حق'' کے لیے کس طرح کوئی شہید ہوسکتا ہے یا اس کا خانوادہ اس کا درس دیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ جوش کا پہلا مجموعۂ نظم ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا اس میں اپنے طرز کا ایک نمائندہ مرثیہ ''آوازِ حق'' شامل ہے جو 1918ء کی تخلیق ہے، اس مرثیے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا گیا اور اسے محض مسدس کہہ کر ٹال دیا گیا۔ لیکن جمیل مظہری نے اس کی پذیرائی کی۔ یہاں یہ بھی نکتہ واضح کرنا چاہوں گا کہ جدید مرثیے کی روایت روح سے شروع ہوئی تھی لیکن آواز بہت دھیمی تھی ''حسین اور انقلاب'' میں یہ آواز بانگ درا بن گئی اور نئے مرثیے کے اپنے تیور کی ایک طرح سے تشکیل ہوگئی۔ اس سے پہلے ''آوازِ حق'' کے بعد جوش نے ''عرفانِ عشق'' کے نام سے ایک مرثیہ تخلیق کیا تھا جس کی نوعیت مختلف سی ہے۔ ''حسین اور انقلاب'' ۱۹۴۱ء میں تخلیق کیا گیا اور یہ مرثیہ جدید مرثیہ نگاروں یا جدید

مرثیہ کا ایک آئیڈیل ہوسکتا ہے یا ہونا چاہیے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی ایک اور مرثیہ جس کی طرف توجہ ہونی چاہیے، وہ ''موجد و مفکر'' ہے جو ۱۹۵۶ کی تخلیق ہے اس کے بعد موصوف نے ''وحدت انسان'' نام کا ایک مرثیہ تخلیق کیا جو فکر و نظر کے اعتبار سے انقلابی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد ایک مرثیہ ۱۹۵۷ء میں ''طلوع فکر'' نام سے سامنے آیا اور اس کے بعد ''عظمت انسان''۔ اس کے بعد ''موت و حیات'' ''پانی'' نیز ''آگ''۔ یہ سارے مرثیے ایک نہج کے نہیں ہیں۔ عنوانات سے ظاہر ہے کہ موصوف مرثیوں کے عمومی خدوخال کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مبالغہ آرائی انہیں بہت دور نہیں لے جاتی اور وہ کسی مغالطے کے شکار نہیں ہوتے۔ ان کے سامنے اس منتشر اور بکھری دنیا کے تضادات ہیں، ان کے سامنے شمر اور اس کے متعلقین ہی نہیں اور نہ ہی یزید اکیلا ہے۔ ہر زمانے میں استحصال کی قوتیں سر اٹھاتی رہی ہیں۔ حق تلفی کی جاتی رہی ہے۔ فطری حقوق چھینے جاتے رہے ہیں۔ جاہ و منصب کی فکر میں مستحسن قدروں کو مسلسل ضرب لگائی جاتی رہی ہے، حکومت اور قوت کے حصول کے لیے ہر وہ طریقے اپنائے جاتے رہے ہیں جو لازماً شیطانی اور ابلیسی کہے جاسکتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ ایسی تمام بدفعلیوں کے خلاف کھڑے نظر آتے ہیں اور عظمت آدم کے خصائص کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر قدم پر استحصالی قوتوں کو چیلنج کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ چیلنج کسی ایک وقت کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایک عقیدے کی شناخت اور تشخص کے لیے بلکہ قوت حسین کا یہ وہ عمل ہے جس سے دنیا سرخرو ہوسکتی ہے اور جس سے منفی قوتیں منہ کے بل اوندھے گر سکتی ہیں۔

جوش نے جان بوجھ کر ماروائیت سے گریز کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اساطیری تخموں میں نہیں پڑتے یعنی کسی طلسمی یا جادوئی کیفیت اپنے آئیڈیل میں بھرنا نہیں چاہتے ہیں۔ یہاں مورچہ بس دو ہی ہے ایک منفی قدروں کی طرف ہے اور دوسرا مثبت۔ اور وہ مثبت مورچے کے امام ہیں جو ہر زمانے کے لیے ہے، ہر مذہب کے لیے ہے اور ہر عقیدے

کے لیے ہے۔ انسان کو اگر اپنی کمزوریوں کا ازالہ کرنا ہو روحانی کیف وکم کی طرف راغب ہونا ہو تو وہ حضرت حسینؓ کی شہادت میں بہت سی راہ عمل تلاش کرلے گا جو اسے لازماً مثبت مورچے پر لا کھڑا کرے گا۔ جس کے یہاں فتح وشکست ضمنی بات ہوگی، اصل لیکن یہ ہوگا کہ اصل حق حق ہے جسے باطل سرنگوں نہیں کرسکتا۔

جوش ''حسین اور انقلاب'' میں جس طرح محتویات کو پیش کرتے ہیں وہ ان ہی امور پر دال ہے جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ طوالت مانع ہے ورنہ میں کئی بند آپ کے سامنے پیش کرتا پھر بھی دو بند ملاحظہ کیجیے:

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بہ دم — دشت ثبات وعزم ہے، دشت بلا وغم
صبر مسیح و جرأت سقراط کی قسم — اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتش بدر وحنین ہے
اس سورما کا اسم گرامی حسین ہے

ہاں خاتم حیات ابد کا نگیں ہے تو — گردون دار وگیر کا مہر مبیں ہے تو
اک زندہ حد فاصل دنیا و دیں ہے تو — کونین کا تخیل عہد آفریں ہے تو
پھر دشت جنگ کو ہے ترا انتظار اُٹھ
اُٹھ روزگار تازہ کے پروردگار اُٹھ

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جوش نے اپنے پہلے مرثیے ''آوازِ حق'' میں تمام تر کلاسکی تیور برقرار رکھے تھے۔ مثلاً 'سراپا'، 'چہرہ'، 'رخصت' اور 'رزم'، 'جنگ'، 'شہادت' اور 'بین'۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ امور ایسے داخل کیے جو آج کے سماجی حالات، سیاسی طرز اور تاریخ سے بھی ہم رشتہ ہیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا جوش کے مرثیوں میں ان کا اجتہاد زور پکڑتا گیا۔ صورت بھی کچھ ایسی تھی کہ اس وقت ہندستان میں خلافت، عدم تعاون کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ آزادی کی جنگ، بدیسی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند ہو چکا تھا، لہٰذا جوش نے حصول آزادی کی تمام تر کیفیت کو اور حالات کی سنگینی کو کربلا تازہ

سے موسوم کیا اور کامیابی کے لیے عزم حسین کی باتیں کیں، یہ وہ کیفیتیں ہیں جو دوسرے مرثیہ نگاروں سے انہیں قطعی الگ کرتی ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مرثیوں میں جدید فکر کی تیزی اور تندی انقلابی تصورات پر مبنی ہیں۔ لہٰذا روایتی عنصر کی تلاش ان کے یہاں بے معنی ہوگی۔ مرثیوں کا ایک بہت بڑا حصہ بین اور ذکر مصائب پر محیط ہوتا ہے لیکن جوش کے یہاں بین یا مصائب کے کچھ اور ہی تیور ہیں جن کا تعلق جدید باطلی آفاق سے ہے، ان کے یہاں جذبات کی کمی نہیں، لیکن وہ امام حسینؑ کو اس کے مدمقابل کر کے تمام سازشوں کے خلاف ایک مجاہد حق کے طور پر پیش کرتے ہیں اور منافقین کی نقاب کشائی میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جوش دہریت پسند تھے۔ لہٰذا وہ حقیقی مرثیہ کہہ ہی نہیں سکتے تھے لیکن ایسے لوگوں کو احساس ہونا چاہیے کہ ان کی مخالفت سطحی ملائیت سے رہی ہے۔ جہاں گہرائی اور عمق کا احساس نہیں ہوتا لیکن جب وہ مرثیہ کہتے ہیں تو صرف حسینؓ ہی یا عزم حسینؓ ہی مرکز نگاہ نہیں رہتے بلکہ حقانیت رسول، سرشاری اور تبلیغ مدنظر رہتی ہے۔

اس بات پر ہمیشہ زور دیا جاتا ہے کہ جوش بلند آہنگی کے شاعر ہیں جن کے یہاں شوکت الفاظ ہمیشہ بار پاتے رہے ہیں، لیکن وہ مراثی میں تازہ بہ کار تشبیہیں تلاش کرتے ہیں۔ متعلقہ استعارے بھی بڑے جاندار نظر آتے ہیں اور تشبیہوں کی ندرت دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ ایک مرثیے کا یہ بند دیکھیے:

گھومی کلید قفل، کھلا قفل فیض عام	ناگاہ آسمان پہ گونجا زمیں کا نام
گردش میں آئے نعرۂ صلی علیٰ کے جام	پڑھتے ہوئے درود بڑھے انبیاء تمام

کعبے کے گرد ایک کرن گھومنے لگی

روح محمدؐ عربی جھومنے لگی

جوش کے مرثیوں میں ایک طرف تو فارسی اور عربی تراکیب ہیں، آیات قرآنی، احادیث رسول اور اقوال ائمہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ حیرت انگیز طور پر ہندی کے بعض الفاظ انہوں نے اس طرح استعمال کیے ہیں جیسے وہ ایسے ہی موقع کے لیے

وضع ہوئے ہوں۔ چند اشعار دیکھیے:

زندگی، باگیسری، سارنگ، دیپک، موہنی　　بت تراشی، رقص، موسیقی، خطابت، شاعری
پنکھڑی، تتلی، صنوبر، دوب، نسریں، چاندنی　　لاجوردی، شربتی، دھانی، گلابی، چمپئی
زعفرانی، آسمانی، ارغوانی، زندگی
لاجونتی، مدھ بھری، کومل، سہانی زندگی

اتنا ہی نہیں جوش نے اس کا بھی التزام رکھا کہ وہ عورتوں کی مخصوص زبان استعمال کریں۔

اس طرح کے الفاظ جیسے جوڑا، رت جگا، مانجھے کا اُبٹن، چوڑیاں، سہرا، کنگن، مسّی، چمپاکلی وغیرہ بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ جوش ملیح آبادی، انیس و دبیر کی فنکاری سے ہم رشتگی کے باوجود مرثیوں کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اجتہاد کے کتنے ہی پہلو نکالتے ہیں۔ واقعات کربلا کو نئے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور متعلقہ کرداروں کو زمینی بنا کر انقلاب کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ استحصال اور انسانی پستی کے سامنے بعض آئیڈیل کردار کے تفاعل سے نئے امکانات ومضمرات پیدا کرتے ہیں جو صرف جوش ملیح آبادی کا ہی حصہ ہے۔

اقبال حیدر

جوش: ایک مفکر شاعر

جوش سے زیادہ متنازعہ شاعر کم از کم اردو ادب میں تو نہیں۔ بادی النظیر میں کچھ لوگوں کو ان کی شاعری تضاد کا شکار نظر آتی ہے۔ مگر اس بات کو ذرا سا مختلف انداز سے دیکھیں تو یہ بھی انداز ہوتا ہے کہ ہم اپنی علم بیزاری و سہل پسندی کی وجہ سے بغور تو چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہی نہیں۔ ہم نے تو ابتک یہ زحمت بھی نہیں گوارا کی کہ ''منطقی جدلیات'' اور ''منفی تضادات'' کے فرق کو جاننے کی کوشش کرتے۔ بہر حال جوش کے سلسلے میں ایک بات تو یقینی ہے کہ ان کے ناقدین اور پرستار دونوں ہی کسی نہ کسی انتہا (Extreme) پر ہی نظر آتے ہیں۔ فراق گورکھپوری سے لیکر ایک عام قاری تک ہزاروں ایسے مل جائیں گے جو انہیں شاعر اعظم کا درجہ دیتے ہیں اور دوسری جانب کم وبیش اتنی ہی بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوگی جو انہیں ایک عام سا شاعر سمجھتے ہیں۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا اگر ان دونوں متضاد رویوں کا معروضی اور تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

دراصل ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جوش صاحب کا اردو ادب مین کیا مقام ہے مگر

دشواری یہ ہے کہ جوش کو پرکھنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اُن جیسا متحرک (Dynamic) دماغ، بسیط نگاہ، جری اور بے باک مزاج اور سب سے بڑھ کر اتنا گھمبیر (profound) اور کثیر اسلوب (Multi-Dicitional) شاعر اپنے قاری اور ناقد سے جس مشقت، دیدہ ریزی اور سنجیدگی کا متقاضی ہے وہ اب بڑی کمیاب ہے۔ اُدھر یہ عالم کہ زندگی تیز رفتا، آدمی سہل طلب اور معاشرہ زوال پذیر۔ بات بنے تو کیسے بنے۔

جوش اردو شاعری کے اس موڑ پر آئے جب ہندوستانی تہذیب کی سانسیں اکھڑ چکی تھی، بیرونی قوت اپنے قدم جما چکی تھی اور مشترکہ اقدار معاشرے میں اپنا اعتبار بڑی تیزی سے کھو رہی تھی۔ ہندوستانیوں کی بہت بڑی تعداد کو پروپیگنڈے اور مختلف حیلے بہانے سے یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی دراصل غدر تھی۔ دو بڑی ہندوستانی اکائیوں کو آپس میں دست وگریباں کرانے کے عزائم بار آور ہوتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بین الاقوامی سطح پر جنگ عظیم اول، ختم ہوتے ہوتے انسانی وقار کو مجروح اور انسانیت کو زخم خوردہ کر چکی تھی۔ غلام ہندوستان اپنا آپ ڈھونڈ رہا تھا اور سامراجی فرمانروا اپنی حکومت کو طول دینے کا جواز۔ مذہبی اور فرقے وارانہ فکر اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ ادبی افق پر ٹیگور اور اقبال جیسے giants چھائے ہوئے تھے کہ ایسے میں ایک نوجوان آواز ابھری جو سیکولر اور تازہ حسّی عصریت لئے ہوئے تھی۔ اس آواز کا حوالہ مذہب یا عقیدہ نہیں تھا بلکہ انسان کا بنیادی وجبلّی حق تھا، آزاد رہنے کا حق، آزاد فضا میں سانس لینے کا حق، اپنے فیصلے آپ کرنے کا حق، یہ آواز اس قدر توانا اور مختلف تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک متبادل اور متوازی فکری رجحان بن گئی۔ جوش کا پہلا مجموعہ روح ادب ان کے تابندہ تر تخلیقی مستقبل کی غمازی کرر ہا تھا۔ دو تین شعر تبرکاً پیش کروں گا۔

دنیا بہت وسیع تھی لیکن مرے لیے
آزادیٔ خیال نے زنداں بنا دیا

دوسرے عالم میں ہوں عالم سے میری جنگ ہے
تاجِ شاہی سے قدم بھی مس کروں تو ننگ ہے

ہستی کی مملکت میں تباہی کا راج ہے
ہوشیار ہو کہ فرق مصیبت پہ تاج ہے

کسی شاعر یا آرٹسٹ کو پرکھنے کا اچھا پیمانہ یہ بھی ہے کہ اس کے Net contribution کو جانچا جائے ۔یہ دیکھا جائے کہ اس نے کون کون سی نئی چیزیں ،اسلوب ،فکراور حسّی رویوں سے ادب کو روشناس کرایا ہے۔اس لحاظ سے جب جوش پر نگاہ پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تو ایک تانتا بندھا ہے نئے امکانات ،ایجادات اور اختراعات کا۔اس لحاظ سے جوش کے ہم رکاب اور ہم پلہ بمشکل دو چار ہی ملیں گے۔اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے چند مثالیں آپ کے پیش خدمت ہیں۔

ا۔جوش اردو کے پہلے انحراف پسند یا منحرف شاعر ہیں(non conformist)۔

ب۔جوش اردو نظم کے پہلے ایسے شاعر ہیں جو اپنے اسلوب کے بانی بھی ہیں اور منتہی بھی۔

پ۔جوش اردو کے پہلے فری تھنکنگ (free thinking) شاعر ہیں۔بیشتر قابل ذکر جدید اردو شاعری میں جوش ہی کی فکر کا عکس ہے۔

ت۔جوش اردو کے پہلے اور شاید سر دست آخری کثیر اسلوب multi dictonal شاعر ہیں۔

ث۔جوش نے اردو ادب میں حسن کا معیار بدلا حسن کی طبقاتی تقسیم کو چیلنج کیا اور اس کا فوکس بدلا۔

ج۔حالانکہ اپنی نسل اور اپنے ماحول کی طرح جوش بھی تلذذ پسند اور دل پھینک رہے مگر اس کے باوجود ان کی فنکارانہ دیانت نے اردو شاعری کی عورت کو اس کی دہری شخصیت سے

نجات دلائی ورنہ ایک عورت اس کی زندگی میں پائی جاتی تھی اور دوسری اس کی شاعری میں۔

چ۔ جوش نے perception-based شاعری نہیں کی۔ انہوں نے کبھی نقاد کا منہ نہیں تکا۔

ح۔ جوش نے اردو شاعری کو برہمی اور برافروختگی کے جذبے سے روشناس کرا کے اسے اعتبار بخشا اور زندگی کی جذباتی تکملیت سے قریب تر کیا۔

خ۔ جوش نے اپنی بے مثل قوت متخیلہ سے نئی نئی ترکیبوں، نابغۂ روزگار امیجری اور استعاراتی نظام سے اردو کے شعری امکانات کو لامحدود اور فطرت نگاری کو متحرک اور لازوال بنا دیا۔

د۔ جوش نے اردو ادب کو للکار دی اور جبر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سکھایا۔

ذ۔ جوش اردو ادب میں مزاحمتی اور احتجاجی شاعری کے بانی ہیں

ر۔ جوش نے انقلاب کو رومان اور رومان کو انقلاب بنا کر ایک زمینی حقیقت بنایا۔

ان چند مشاہدات کے بعد جی چاہتا ہے کہ جوش کی تین عظیم تر خوبیوں پر تفصیلی گفتگو کی جائے خصوصاً اس لیے کہ انہی اوصاف سے جوش کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے اور یوں بھی کہ ان حوالوں سے جوش کے متعلق بہت سی بدگمانیاں پیدا کی گئیں یا پیدا ہوئیں۔

۱۔ جوش کا فکری paradigm اور فلسفہ جبر

۲۔ جوش کا تصور حسن اور عورت

۳۔ اسلوب جوش

ا۔ آرٹ کو زندگی کی نقالی (imitation) کہا جاتا ہے۔ آرٹ کے مختلف مظاہر اپنے لیے مناسب ذریعہ اظہار (میڈیم) اختیار کرتے ہیں جیسے رنگ، شکل، گت، لے، دھن، آواز اور الفاظ۔ شاید یہ بات بڑی حد تک درست قرار پائے کہ آرٹ کی جتنی بھی اکائیاں ہیں

شاعری ہی ان میں سب سے زیادہ Multi medial ہے۔ اس میں بسا اوقات ،صوتی صوری اور معنوی حسن ملکر ایک ایسی تاثیر پیدا کرتے ہیں جو ابدی پرتو کا حامل ہوتا ہے۔ ہئیت یقینی طور پر شاعر کے کرافٹ سے متعلق ہے مگر مواد کی گہرائی اور عصری سچائی ہی کسی فن پارے کو امر کرتی ہے اور زمان و مکان کی قیود سے آزاد کر دیتی ہے خصوصاً ان معاشروں میں جہاں زمینی حقیقتیں غیر یقینی اور مبہم ہوں۔

اب ''ادب برائے ادب'' یا ادب برائے زندگی'' کی بحث بہت پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے مگر یہ کہنا غلط نہیں کہ ادب کا ناطہ زندگی سے جڑے رہنے ہی سے ادب کو زندگی ملتی ہے یعنی life breeds life۔ شاعر کا ذریعۂ اظہار یا medium یقیناً اس کا کرافٹ یا تخلیقی جوہر ہے مگر جو مواد وہ نظم کر رہا ہے اگر وہ جیتی جاگتی زندگی سے متصل نہیں ہے تو اس کے کلام کی آفاقیت پہ حرف آئے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مواد کی اہمیت اس کی ماہیت میں مضمر ہوتی ہے، trivial موضاعات پر کہی ہوئی چیزیں عارضی ہی ہو جاتی ہیں اصل مواد تو وہ ہوتا جہاں سے زندگی اپنا تشخص وضع کرتی ہے وہ جدلیاتی عناصر جو مجموعی اور اجتماعی زندگی کی تنزلی یا ترقی کی رفتار اور سمت متعین کرتے ہیں اب وہ چاہے ارضی ہوں یا سماواتی ان پر واضح موقف اختیار کرنا فرض ہے کسی بھی ایسی کوشش کا جو فلاح اور ترقی کے لیے گامزن ہو ایسے کسی بھی موقف کا اظہار، فرض ہے ہر اس شاعر کا جو زندگی کی خمیدگی کو کم کرنا چاہتا ہو۔ جوش نے ہر نزاعی مسئلے پر ایک دوٹوک رائے رکھی اور ظاہر کی ہے پھر اس کا خمیازہ بھی بھگتا ہے۔ نہ اُن کا اسلوب Lack of clarity لیے ہوئے ہے نہ ہی ان کی فکر میں lack of character ہے۔ یہ defining moments ہی فکر کو اعتبار بخشتے ہیں اور دانش پہ سان چڑھاتے ہیں۔

عموماً فکری شاعری یا ادب سے مراد'' مابعد الطبعاتی '' امور پر گفتگو کرنا تصور کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک مابعد الطبیعات کو مافوق الفطرت (super

(natural) چیزوں سے متعلق سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن پچھلی چند دہائیوں سے اس کی تعریف میں بہت واضح فرق آیا ہے۔ آج کی فکر کے تناظر میں اسے معقول سے محسوس بنانے کے عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر ''بنیادی قوانین'' اور ''منطقی اسباب وعلل'' پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا جائے وہاں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ مابعد الطبیعات محض ''وجود'' کے بارے میں سوال کرنے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یہ تو اس راز کو پالینے کا نام ہے کہ ''وجود'' بھی متسوالیہ (questionable) ہے۔ یہ بحث شاید نسبتاً ترقی یافتہ اور زیادہ باشعور معاشروں میں اتنی ناگزیر نہ ہو جتنی ایک کم ترقی یافتہ یا ادّعایت پسند معاشرے میں کیونکہ یہاں آبادی کی تقسیم، امن وامان کی تفہیم اور انصاف کی ترویج سب کا دارومدار عقیدے پہ ہوتا ہے۔ یہاں اوتاری (Dogmatic) اور دیوتائی قوتوں (Deity) کے خلاف جنگ کرنا ہی زندگی اور اس کی قدروں کو بحال کرنا ہے۔ یہاں ''اچھائی'' اور ''برائی'' کے علاوہ اور کسی بھی قسم کی ''خانہ بندی''، انسانیت کو زخم زخم کرنے اور زندگی کو بے توقیر کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔ شاید وہی ادب، وہی شاعری جو مروجہ ضرر رساں عوامل کی بیخ کنی کرے اور اصل source کو ہدف بنانے سے نہ خوف کھائے، اجتماعی شعور کا معیار بلند کرے، فرسودہ منقولات سے گریز اور لوگوں کو ان کے جائز حق سے روشناس کرائے اور انہیں ان کے حق کے لیے اکسائے وہی فکری ادب ہوگا۔

اسلامی دنیا میں باضابطہ اور معروضی تعقل وتفکر کا رجحان بہت کم رہا ہے کیونکہ ہم ہمیشہ ادعائیت کا شکار رہے ہیں۔ ہم تو سماجی علوم (social seiences) پر بھی آزادانہ انداز سے نہیں سوچتے دیگر امور تو دور کی بات ہے۔ اب ان حالات میں یہ ذمے داری بھی شاعروں کے حصے میں آئی۔ اب شاعر تو پھر شاعر ہوتا ہے اس سے کسی منضبط فلسفہ کی آس لگانا ایسے ہی ہے جیسے سورج سے اوس مانگنا۔ اس پہ مستزاد یہ کہ وہ شاعر جو انحراف پسند یعنی Non -conformist ہو۔ کیونکہ اس سے جہتیں تو ملیں گی اور ابعاد تو سامنے آئیں گے

مگر شاعرانہ روش اور قلندرانہ ترنگ شیرازہ بندی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ہاں conformist (اقراری) فکر کا حامل شاعر یہ امکان ہوسکتا ہے کیونکہ وہاں نظریاتی یا مذہبی شیرازہ بندی موجود ہے صرف شعری ترغیب سے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔

شاعر کی فکر تو احساس کی رو پر چلتی ہے وہاں تو معقول کو محسوس بنانا ہی اصل فن ہے ۔ادھر محسوسات کی اپنی مجبوریاں (limitations) ہیں۔حواس کے حوالے سے حقیقت کو آشکار یا قبول کرنا بیسویں صدی میں یوں بھی ایک اہم فلسفیانہ الجھاؤ بنا رہا ہے۔

جوش کی حد تک یہ بات بالکل درست ہے کہ تفکر ان کا مزاج اور تعقل ان کا احساس بن چکا تھا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی فکری بے ضابطگی ان کی غیر معمولی معروضیت کی دین تھی۔نہ صرف یہ کہ ان کی وابستگی میں اضطراب تھا بلکہ ان کو تضادات کی زیریں لہر میں موجود ہم آہنگی کا عرفان حاصل ہو چکا تھا۔اس ذہنی فضا میں انہیں ہر نئی چیز، ہر نیا پہلو اور ہر نئی فکر اپنی طرف کھینچتی تھی اور ان کی زیرکی ہر شے کے متعلق رائے قائم کرتی اور ان کی بے باکی اور خوش ہمتی ان سے اس کا اظہار کرواتی تھی۔اس سے ایک طرف یہ تاثر ملتا ہے ان کی فکر میں گہرائی کم تھی دوسری طرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ خود بھی گومگو میں تھے اصل میں ایسا ہے نہیں۔فکری لحاظ سے کم از کم دو چار نکات تو ایسے ہیں جو اردو شاعری کی حد تک تو صرف جوش نے ہی برتے ہیں۔اور یہ ان کو جدید تر آفاقی فکر کا ہمنوا بنا دیتے ہیں ان مثالوں میں جانے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ جوش کے حوالے سے مسئلہ جبر وقدر کو بھی موضوع گفتگو بنایا جائے۔یہاں جوش نے خوب خوب چہلیں بھی کی ہیں، معرکے بھی سر کیے ہیں اور ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔جبر وقدر کو ہم نے ہمیشہ عقیدے اور مذہب کے حوالے سے ہی دیکھا ہے لیکن جوش کے یہاں جو الجھاؤ ہے اس کا ناطہ شاید Meno Paradox کی الجھن سے ملتا ہو جہاں اُس حقیقت یا سچائی کی بات ہوتی ہے جو کسی عمل یا تجربے کی مرہون منت نہیں جس کو محض الہام یا استغراق سے حاصل کیا جا سکتا ہے جس کو

Priori Truths (صدق ما سبق) کہا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے نابغۂ روزگار انگریزی مفکرین برٹینڈ رسل اور جی ای مور کی جدید تر ریسرچ جہاں وہ کسی حسی تجربے کو اثر کے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو شعور میں مادّی پیکر بتاتے ہیں اور دوسری طرف اس سے اخذ کردہ دانش کو غیر مرئی ادراک گردانتے ہیں جہاں حقیقت جاننے کے کم از کم دو مظاہر ہیں ایک Objects of Acquantance (جنس آ گہی) اور دوسرا Objects of Description (جنس ابلاغی) ہیں۔ رسل کے نزدیک جنس آشنائی زیادہ قابل بھروسہ ہیں بہ نسبت جنس ابلاغی کے۔ اب جوش کے یہاں جو الجھاؤ پیدا ہوتا ہے وہ اس Priori Tuth یعنی ''دھیان'' میں آئی ہوئی حقیقت سے متعلق ہے جو کسی حد تک رسل کی جنس آشنائی کے متشابہ ہے۔ جوش کو یہ ''جی'' یا دھیان'' میں آنے میں ایک جبر کا عنصر نظر آتا ہے۔ وہ اکثر اپنی گفتگو اور تحریروں میں بھی اس مسئلے کو اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف جوش ہی کے لیے نہیں یہ مسائل کسی بھی Free Thinking دماغ کو سوال کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے جوش کو اس سوال کرنے پر سراہنے کے بجائے مطعون کہا گیا کیونکہ ہمارے بیشتر نقاد حضرات ''جبر'' کے محدود اور مذہبی مفہوم کی روشنی میں اس کا ادراک کرتے ہوئے جوش پر یہ اعتراض کرتے پائے گئے کہ اگر جوش جبر'' کے قائل ہیں تو ''انسان کی عظمت'' اور عروج کے اس حد تک خواہاں کیسے ہو سکتے ہیں کہ اس کو الوہیت کے منصب پر فائز دیکھنے کے خواہش مند بھی ہوں۔ اصل میں تو یہ فکر اردو میں آج بھی اجنبی ہی ہے۔ جوش کا اعزاز تو یہ ہے کہ انہوں نے ایک باقاعدہ فلسفی نہ ہوتے ہوئے بھی اس امر کا ادراک کیا۔ اس کے علاوہ بھی جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا گیا اور پہلے مضامین میں ذکر کیا گیا کہ جوش کی فکری بوقلمونی میں اس کے علاوہ بھی بہت سے نمائندہ اور بالکل انوکھے رنگ ہیں ''جیسے'' انسان کا موت پر قابو پا لینا اور اس سے منسلکہ خدا کا تصور''۔ ''حواس کا ادراک''۔ مگر

انسان کا الوہیت کے درجے پر فائز ہونے کا امکان۔ آزادیٔ مطلق کا تصور:۔ ہمارے نا قدین نے کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ جوش کی فکری معجز نمائی کو بہت گھٹایا۔ ذرا یہ رباعیاں دیکھیے:

اک طرف کشاکش میں گھرا ہوں معبود
مکار حو اس اور وہ بھی محدود
بالفرض اگر کشفِ غطا بھی ہوجائے
پھر یہ نہ یقیں آئے کہ تو ہے موجود

ہشیار آگہی کے طالب انساں
دریائے حواس مکر کا ہے طوفان
خلاقیِ وہم کے نہاں خانے کا
مالِ مسروقہ بیچتا ہے وجدان

آوازۂ حق نشترِ فصاد نہیں
اک ذرہ بھی پروردہ ارشاد نہیں
ممکن ہی نہیں عدم سے پیدا ہو وجود
عالم فقط اظہار ہے ایجاد ہی نہیں

ہر لمحہ وبال بن گیا ہے اے جوش
ہر ذرہ سوال بن گیا ہے اے جوش
ہر چیز کی لم کریدنے کا لپکا
جی کا جنجال بن گیا ہے اے جوش

ٹھہرے افواہ کیا دلیل مطبوع
کیا موافقِ گماں سے ایقان طلوع
تفصیل سے قانونِ شہادت جو پڑھا
تو خیر سے ماں باپ بھی نکلے مسموع

معلول کو کب نظر میں تولا نہ گیا　　قفلِ علّت کسی سے کھولا نہ گیا
"کس طرح" کے مسئلے میں کیا کیا جھکیے　　کیوں کی جو چھڑی بات تو بولا نہ گیا

اس کے علاوہ مسئلہ جبر کو لے کر جوش نے جو طنزیہ شاعری کی ہے وہ دراصل اُس مروجہ اور شخصی خدا کے حضور سپاسنامہ پیش کیا ہے جس کو یاران کبار جانے مانے بیٹھے تھے۔ اُن کی اس قسم کی رباعیوں نے بھی ان کی اصل اور زیادہ سنجیدہ فکر کو سمجھنے میں دشواری پیدا کی ہے

ہر در ہے بجز درِ مشیت مسدود　　بس میں نہ ہبوط ہے نہ قابو میں صعود
اس بندۂ مجبور و مقیّد کے گناہ　　کس کی فردِ عمل میں لکھوں معبود

دنیا کو بلاؤں سے اماں دو یارو　　اور ادکو ہونٹوں پہ تکاں دو یارو
طوفان ٹل جائے گا دعائیں مانگو　　آندھی تھم جائے گی اذاں دو یارو

اسی تفکر مزاجی کو اور آگے بڑھائیں تو بے شمار نثری اور شعری تخلیقات ایسی ملیں گی جہاں جوش ایک باقاعدہ سماجی Visionary کے طور پر نظر آتے ہیں۔ رباعیوں، نظموں اور خصوصاً اشارات کے نثری مضامین لگ بھگ ستر برس پہلے لکھے ہوئے ہیں اور ان کے مواد کی تازگی اور Relevance اب تک اپنی طرحداری قائم کیے ہوئے ہے۔ کون سا ایسا پہلو ہے معاشرے کا جس کے بارے میں جوش نے کھل کر نہیں لکھا ہے۔ اشارات ہی کو اگر لیجیے تو "بھارتیہ ساہتیہ پریشد، سیاسی انجمنیں، ہمارے شاعر، ہمارے پیر، ہمارے مگر مجتہد، قومیت کا تخیل، عقل کی باتیں، ہندستانی پردہ اور ہمہ دانی ایسے مضامین ہیں جو روزمرہ زندگی اور معاشرے کی کج ادائیوں کو نہ صرف معرضِ تحریر میں لاتے بلکہ ان پر دوٹوک رائے بھی دیتے ہیں۔ کچھ مضامین جو یقیناً کسی بہت زیادہ Disturbing واقعے کے ردِعمل میں لکھے

گئے ہیں ان کا اسلوب یا اسٹائل بہت Aggressive اور طنز آمیز ہے۔ ویسے یوں بھی جوش کے یہاں نفسیاتی Shock Treatment کا استعمال بڑی چابکدستی اور فراخدلی سے جا بجا مل جاتا ہے۔ اسی مجموعے میں بہت سے بلکہ بیشتر مضامین بہت ہی مدلل اور تیر بہ ہدف ہیں۔ اب دیکھیے پردے پہ جو مضمون ہے ''خیر و شر'' کے حوالے سے جو مختصر مقالہ ہے یا پھر ہمہ دانی کے عنوان سے جو علم معلوم و علمِ محسوس گفتگو ہے اس میں حکیمانہ طرز استدلال اپنایا گیا اور بہت ہی نپی تلی اور دل کو لگنے والی دلیلیں دی گئی ہیں یا ایک جگہ اور کسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہندو مسلم تعصب کو روکنے کا بہترین ذریعہ Inter-Marriges ہیں۔ یہ نکتہ سماجیاتی Socialogy میں ایک مستقل فکر کی حیثیت رکھتا اور اس کا اطلاق کہیں بھی ہوتی نبرد آزما اکائیوں پر ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے سماجی حکماً ان امور پر بات کرتے ہوئے اب بھی لرزتے ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں جو ہونا تھا وہی ہوا اور معاشرہ تنزلی اور انحطاط کا شکار ہوتے ہوتے محض نقالی کرنے کے قابل رہ گیا ہے۔ جوش نے تہذیبی اور تمدنی حوالے سے جو کچھ کہا اور لکھا ہے اس سے صرف نظر کرنا، چاہے وہ مذہبی عدم تحفظ کی وجہ سے ہو یا سیاسی شعبدہ گری کی وجہ سے، ہمیں بہت مہنگا پڑا اور پڑتا رہے گا۔ ایک آزاد رائے ایک خود احتسابی کا دیانت دارانہ عمل اور ایک بے باک ترجمان، ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر ''الفاظ و شاعر'' کا حوالہ نہیں دیا وہ ایک الگ علمی بحث اور معرکہ آرا مضمون ہے۔ اسی کتاب میں ایک مضمون اور نظر سے گذرا ''اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت'' جو انتہائی وقیع اور قابل قدر مضمون ہے۔ اتفاقاً ڈاکٹر قمر رئیس کی مرتب کردہ کتاب ''جوش ملیح آبادی۔۔ خصوصی مطالعہ'' میں ایک مضمون کسی خاتون ڈاکٹر کا ''جوش اور رشید جہاں'' پڑھا۔ یہ مضمون بظاہر جوش کے مضمون کے جواب میں رشید جہاں صاحبہ کے غیر مطبوعہ آرٹیکل ''اردو ادب میں انقلاب کی ضرورت'' کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار نے یہ لکھا ہے کہ گویا رشید جہاں نے جوش کے مضمون کے خلاف

مضمون لکھا تھا۔ ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو۔ مجھے جزوی اختلاف تو نظر آتا ہے اس بات میں کہ جوش جس کو ''غیر اصل و مصنوعی'' شاعری کہہ رہے ہیں وہ بوجوہ رشید جہاں صاحبہ کو مصنوعی نہیں معلوم ہوتی۔ اُن کا نکتۂ نظر بہت حد تک واضح اور مدلّل ہے۔ لیکن مضمون نگار کا دیا ہوا دوسرا اقتباس یہاں نقل کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ (اس مضمون کو حال ہی پڑھا تھا اور، حافظے میں تازہ تھا اس لیے یاد آ گیا اور کوئی خاص بات نہیں) اس اقتباس میں رشید جہاں صاحبہ جوش کے موقف کی حمایت بھی کرتی نظر آ رہی ہیں اور جو مخصوص حوالہ اور جس رجحان کی نشان دہی انہوں نے کی ہے وہ اقبالؔ کے ترانے سے ہے۔ لیکن فاضل مصنفہ نے جس طرح اصل اعتراض سے صرفِ نظر کر کے اسے جوش سے منسوب کر دیا وہ ہمارے ناقدین کے اس عمومی رویے کی طرف واضح اشارہ ہے جو جوش کی بابت روا رکھا گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کا منشا بھی یہی ہو ممکن ہے سہو ہو گیا ہو یا misprint ہو۔

> ''اگر شد روز را گوید شب ورست میں'' کی غلامانہ تعلیم، غلامی کی حالت میں رہ کر ایک غیر حکومت کے زیرِ نگراں بسر کر کے ہم کیا لکھ سکتے ہیں؟ کیا آزادی کے شیخی باز ترانے گائیں؟ جس طرح رات کو دن کہنا غلط اور بزدلی ہے، اسی طرح اپنے کو غلام نہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ بعض شاعر تو زمانۂ حال کے بموجب بے چارگی اور لاچاری جس کا اثر ان کے دماغ پر بھی ہے، جذبہ پیش کرتے ہیں۔ اور بعض ''چین و عرب ہمارا'' کا غلط جوش عوام میں پھیلا دیتے ہیں۔ اور کہاں تک

ان کا بے ڈھنگا جوش صحیح ہے اور غلامانہ کیفیت
سے دور ہے اس کا اندازہ ہر کوئی لگا سکتا ہے۔
ہمارا ادب ہماری موجودہ سوسائٹی کا عکس
ہے۔اور کوئی نیا انقلاب جو ادب میں صرف
اصلیت کو جوش سے ظاہر کرتا ہے، سچا ادب
نہیں۔''

جوش کی شاعری کا ایک اور اہم پہلو اُن کا تصور حسن ہے۔ جوش کی سرشاریت اور محویت صرف حسن تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ ان کی حظ اٹھانے کی صلاحیت میں منتقل ہو کر ایک طلسماتی کیف Transform کرتی ہے جو بسا اوقات بہت خوشگوار حد تک متعدی (Contagious) ہوتا ہے۔ ان کا تصور حسن Kant aestheticism کی ''عدم دل چسپی اور جسمانیت لمسیت سے عاری سرشاریت'' اور Freud کی ''جبلی خواہشات اور نفسانی ترنگ کی ارتقائی شکل کے بین بین رہتا ہے۔ جوش کے یہاں حسن صرف صوری نہیں ہے وہ خیالی، وجدانی اور جدلیاتی بھی ہے۔ ان کی نظموں میں، رباعیوں میں ایسی مثالیں بے شمار ملیں گی مگر جہاں بات حسنِ فطرت کی یا حسنِ زن کی آتی ہے وہاں جوش کی شدت عجب عجب کرشمے دکھاتی ہے۔ان کے ذہن میں جو لامحدودیت اور آفاقیت تھی اس نے حسنِ فطرت کو بھی روایتی مظاہر سے متجاوز کیا اور حسن زن کو بھی۔ ان کے مظاہر حسن میں جہاں برسات، ندی، پہاڑ، دریا، سمندر، موسیقی، سحر، گھٹا، فاختہ کی آواز ہے وہیں خالی بوتل، بہار کی ایک دوپہر، کسان، ہل، بجھا ہوا دل اور رقیق لے ہے، وہیں جب جوش نے حسن زن پر نگاہ ڈالی تو ان کو روایتی حسن اور معاشرتی حد بندیاں نہیں روک سکیں۔ ان کے یہاں تو حسن اپنی پوری سج دھج کے ساتھ آتا ہے اور ہر روپ میں آتا ہے اُس کی کوئی سماجی برادری نہیں ہے۔
جوش نے یقینی اور الوہی انداز میں حسن کو Magnanimity اور Profoundity دی اس

سب کے باوجود عورت کی طرف جوش کا رویہ انتہائی قدامت پسندانہ، مربیانہ، سرمایہ دارانہ اور لمسیت زدہ ہی رہا۔ وہ اس حوالے سے اپنے ماحول اور اپنی نسل سے بغاوت نہیں کر سکے۔ عورت ان کے سامان تعیش کی سب سے حسین و نازک ترین شے تھی اور رہی۔ ان کے مزاج میں بلا کا تلذذ تھا اور وہ ساری عمر اس سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے بلکہ اس خامی کو محسوس بھی نہ کر سکے عورت ان کے نزدیک Commodity ہی رہی مگر اس سب کے باوجود ان کی فکری دیانت ایک دفعہ پھر کرشمہ سازی کر گئی۔ جوش کے ہم عصروں، ان کے پیش روؤں، حتیٰ کہ ان کے بعد آنے والے شاعروں اور ادیبوں میں بھی یہ اخلاقی استقامت نہیں نظر آتی کہ وہ اپنی شاعری ''میں'' اور ''زندگی'' میں عورت کی طرف جو رویے ہیں ان میں مماثلت (Consistency) رکھیں۔ یہ لوگ اپنی شاعری میں عورت کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ اس عورت کی نہیں ہے جو ان کی زندگی میں یا ان کی سیج پر ہے جبکہ جوش کی زندگی اور شاعری کی عورت کا تشخص ایمانداری پر مبنی ہے، ریاکاری پر نہیں اس لحاظ سے بھی جوش کا جو کنٹری بیوشن ہے اس پر مثبت انداز سے بالکل نہیں لکھا گیا۔ دوسری طرف جوش کو تلف کر دینے سے، ان سے صرف نظر کرنے سے، عورت اردو شاعری میں دوبارہ اسی منافقت کا شکار ہو گئی جس کا ان سے پہلے تھی یا جس کا شکار وہ معاشرے کی دیگر اکائیوں میں ہے۔ اس طرف باقاعدہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادیبوں اور شاعروں کی منافقت کا پردہ چاک ہو سکے۔

جہاں تک Focus شفٹ کرنے کی بات ہے تو جوش کی اس قبیل کی کچھ نظمیں تو اسقدر مشہور ہیں کہ صرف ان کا نام لے دینے سے اہل ادب اور سنجیدہ شاعری پڑھنے والوں کو متعدد اشعار اور پوری پوری نظمیں یاد آ جائیں گی۔ جنگل کی شہزادی، مالن، کوہستان دکن کی عورتیں، جامن والیاں، فتنہ خانقاہ، سہاگن بیوہ، جھریاں، الھڑ، ماتا اور محبت اور نگاران مردہ اور ایسی ہی بے شمار عہد ساز نظموں کو کون بھول سکتا ہے۔

جہاں جوش نے بہت سے Paradigm بدلے وہیں حسن کا منبع Sourcce بھی بدلا۔اردو شاعر کی نگاہ پہلے جہاں نہیں پڑتی تھی اب پڑنے لگی اسی کے ساتھ حسن کا معیار بھی پہلے پہل جوش کی نظموں کی بدولت تبدیل ہوا۔اب حسن ''سیاہ فام'' بھی ہونے لگا اور بدن اور اعضا کی نازکی ہی لائق تعریف نہ رہی بلکہ حسن کی Stereo Typing میں کمی آنا شروع ہوگئی۔ جوش عورت کو تلذذ آمیز اور عاشقانہ نگاہوں سے ہی دیکھا کیے مگر ان کی وسیع النظری پھر بھی کارفرما رہی۔ان کی نظم ''کوہستان دکن کی عورت'' کا ایک ہی مصرعہ اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

''حجر اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں''

اور اس کے بعد ''حسن اور مزدوری میں جوش عورت کو برابری تو نہیں دیتے مگر مربیانہ انداز میں اس کے آلام کا حل ڈھونڈتے ہیں اور ایک بار پھر غلامی سے نجات میں ہی ان کو اس مسئلے کا حل بھی نظر آنے لگتا ہے۔

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
جوش ان ہاتھوں میں کنگن جگمگانا چاہیے

اس کے علاوہ ان کی دو بہت ہی اچھی نظمیں اس حوالے سے خاتون مشرق اور خاتون مغرب ہیں۔ کچھ رباعیات نجوم و جواہر میں بھی ہیں جہاں وہ عورت کو پالنے کی ڈوری کا امین اور نظام ہستی کا معین بتاتے ہیں۔مگر صحیح معنوں میں ان کا رویہ عورت سے سرتاسر ایک عاشق کا رہا مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا انہوں نے اس معاملے کا کبھی Civility اور احترام کا دامن نہیں چھوڑا۔ دہلی کے نیا ادب کے دفتر میں سیاہی خاتون کی تصویر کا تذکرہ ''جوش اور عورت'' کے باب میں متعدد بار ہوا مگر وہ ایک شوخ اضطراری اور جزوی رُرخ ہے کُلّی رویہ نہیں۔ کچھ بھی ہو جوش نے اردو شاعری میں عورت کی دہری شخصیت کو اپنی بے ریا طبیعت سے بدلا ضرور۔

اب آتے ہیں جوش کے اسلوب کی طرف جو کہ انتہائی متحرک، توانا اور طلسماتی ہونے کے ساتھ ساتھ ست رنگا بھی ہے۔ ست رنگا اس لیے نہیں کہ وہ اک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے شیدائی تھی۔ (یہ تو الگ بحث ہے جس کا تعلق (Semantics) معنویات، (Phoenetics) صوتیات سے ہے اور اُس پر گفتگو شاید آگے چل کر ہو بھی) بلکہ اس لیے کہ ان کے یہاں موضوعاتی اکائی کا ایک خاص التزام ہونے کی وجہ سے ہر نظم اور ہر شعر اپنے پیکر کے ساتھ وارد ہوتا تھا۔ ان کی متخیّلہ میں ایک ایسی نادر ہم آہنگی (Unison) تھی کہ خیال خود لفظ کی شکل میں اس پر آشکار ہوتا تھا۔ جوش نے کئی جگہ کہا ہے کہ ان کو خیال کے لیے الفاظ تلاش نہیں کرنے پڑتے بلکہ ان کے یہاں خیال خود لفظوں کے روپ میں آتا ہے یعنی خیال کا وارد ہونا اور اس کے بعد اس کا شعری روپ میں ڈھلنا جوش کے یہاں دو الگ الگ تخلیقی عمل نہیں ہیں۔ بے شمار شعری تخلیقات اتنے مختلف النوع طرز بیان کی حامل ہیں کہ اگر ان کا نام نہ درج ہو اور صرف زبان کی ساخت، لفظوں کی آویزش اور لسانی آمیزش سے اندازہ لگانا ہو تو کوئی بھی نہ جان سکے کہ یہ ایک ہی اتھاہ سمندر کی مختلف موجیں ہیں۔ سیف و سبو، سنبل و سلاسل، نقش و نگار، سموم و صبا، شعلہ و شبنم حتیٰ کہ الہام و افکار، نجوم و جواہر اور محراب و مضراب میں بھی بے شمار ایسے شاہکار ملیں گے جن کا تعلق لسانی اور اسلوبی اعتبار سے بالکل جداگانہ ہے۔ جوش کو محض ادق اور ثقیل زبان کا الزام دینے والے اگر خود بھی کچھ مطالعے کی مشقت کریں تو انہیں اندازہ ہوگا جوش کے یہاں یہ بات شروع سے آخر تک کے کلام میں عیاں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ''واردات'' یا ''نفسِ مضمون'' خود طے کرتا ہے کہ اسے اپنا اظہار کس ڈکشن میں مقصود ہے ان کی قوت متخیلہ اور Linguistic Faculties اتنی فعال اور ہمہ گیر (Profund) ہیں کہ فکر یا جذبے کو من و عن اعلیٰ شعری پیکر میں ڈھلنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ جوشؔ کے حوالے سے فراقؔ نے کسی جگہ کہا تھا کہ کیونکہ زندگی خود Perfect نہیں ہے اس لیے زندگی کوئی بھی

Manifestation چاہے وہ ادب ہی کیوں نہ ہو اسے Perfect نہیں ہونا چاہیے (حافظے کی بنیاد پر نقل کر رہا ہوں اور اپنے لفظوں میں، ہو سکتا ہے کوئی چوک ہو جائے)۔ یہ ایک بڑا دلچسپ آبزرویشن ہے خصوصاً ایک ایسے شخص کی زبان سے جس نے اپنی کتاب کا انتساب ہی شاعرِ اعظم جوش کے نام کیا ہو۔ لیکن شاید بڑی دیانتدارانہ بھی ہے۔ دیکھیے جس طرح غالبؔ کو اپنے بیاں کے لیے اسلوب میں گھٹن کا احساس ہوا تھا شاید اسی طرح جوش کو بھی اپنی تخلیقی فعالیت، وجدانی حسیت اور غیر معمولی قدرت بیان کے باعث مضامین و مضمرات میں کمی اور یکسانیت کا احساس ہوا ہو اور اس لیے وہ ہر آن نئی فکر، نئے نکات اور نئے مسائل کی تلاش میں اپنے رنگا رنگ مشاہدے سے اس کمی کو، کم از کم اپنے لیے (Compensate) پورا کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ اس کو نفسیاتی طور پر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۵ کے بعد سے جوش نے اپنے آپ کو جیتی جاگتی زندگی سے کاٹ کر اس ازلی روحِ رواں Sense of Belonging سے محروم کر کے شاید اپنے تخلیقی مسائل میں اضافہ کر لیا ہو۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنے آپ کو "نقیب شاعر فردا" کہا ہو۔ بہر حال کسی طور بھی دیکھیں ایک بات تو تقریباً واضح ہے کہ اردو میں صرف دو ہی شاعر ایسے ہیں جن کی تخلیقی سرّیت کا دارومدار "معنی" پر ہے "لفظ" پر نہیں مگر اب اس کو کس طرح بیان کیا جائے کہ یہ ہی دو شاعر اردو کے ان معدودے چند شعرا میں بھی ہیں جنہوں نے بے شمار تشبیہات وضع کیں، ہزاروں لفظی پیکر تراشے ایک ایسا استعاراتی نظام تخلیق کیا جس نے نہ صرف شعری امکانات کو لامحدود کیا بلکہ آج تک ایمائی اور علامتی شاعری ان کے جہانِ معنی میں سانس لے رہی ہے۔

اس مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ جوش کے اسلوب پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں اور کمزوریاں تلاش کی گئی ہیں ان کی ماہیت اور کمیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ ان کے مضمرات کو سمجھنے اور محرکات کو جانچنے کی کوشش کی جائے۔

جوش پر جہاں بہت سے اعتراض ہوئے وہیں یہ بھی کہا گیا بلکہ بار بار کہا گیا کہ جوش کی نظموں میں کثرت الفاظ اور تواتر بہت ہے۔ نظموں میں بالیدگی کا فقدان ہے۔ پھر یہ بھی اکثر کہا گیا کہ جدید نظم کی میکانکی ساخت کے لحاظ سے جوش کی نظمیں بوجھل اور منطقی انجام سے عاری ہیں۔ ان اعتراضات میں سے کچھ تو یقیناً بہت Valid ہیں اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ پچھلے پچاس سالوں میں ہماری ادبی اور شعری اساس خصوصاً نظم کے حوالے سے بہت بدلی ہے اور اب ہم کلیتاً انگریزی جدید نظم کی ساخت پر لکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں صرف دو قباحتیں ہیں ایک تو یہ کہ انگریزی ادب نے اپنے کلاسیکی ادب سے صریحاً انحراف نہیں کیا دوسرے یہ کہ ہماری Psyche ابھی تک نہیں بدلی تو اب بیشتر ایسی نظمیں اسلوب کے اعتبار سے ایک نیم اثر جذبات سے عاری میکانکی ڈھانچہ بن جاتی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت شاید یہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی قابل ذکر اور شدید ردعمل ہوتے ہیں، چاہے وہ مثبت ہوں یا منفی، اُسی شاعری کو پڑھ کر یا سن کر ہوتے ہیں۔ اب چاہے وہ اقبال کی دیوتائی پذیرائی ہو یا جوش سے معاندانہ بے اعتنائی۔ فارم سے قطع نظر وہ مواد Content کو Respond کرتے ہیں۔ جو بہت مقبول نظمیں ہوئی ہیں اس عرصے میں بھی وہ اکثر و بیشتر نظموں سے زیادہ ''آزاد غزلوں'' کے زمرے میں آسکتی ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ غزل سے ہمارا عشق قائم و دائم ہے۔ یقیناً جوش کی جو بھی کمزور نظمیں ہیں وہ اس عیب کا شکار ہیں اور جو ان کی اعلیٰ نظمیں ہیں وہ اسی وصف سے عبارت ہیں۔ گویا ہمارا مسئلہ مواد اور فارم کے یکجان و دو قالب ہونے یا ہونے سے ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ہم اپنی موسیقی کی مثال سامنے رکھیں تو شاید بات کچھ اور واضح ہو سکے۔ ہمارے یہاں، سرگم لینا تان لگانا، پلٹے لینا، بہلاوے، راگ اور ٹھاٹ میں جگہیں بنانا، خیال کی گائیکی اور ٹھمری اگر صرف اس لیے خارج کردی جائیں گی کہ زیادہ تر لوگ ان سے محظوظ نہیں ہوتے یا سمجھ نہیں پاتے یا اس میں طوالت بہت ہے تو پھر یہ تو آرٹ اور کرافٹ کی روح کے منافی بات ہوگی۔ کہنے والے تو یہ

بھی کہتے ہیں اور ان کی تعداد اس وقت شاید نوے فیصد سے تجاوز کر چکی ہو کہ آرٹ، شعر و ادب سب بیکار ہیں تو کیا اب ان کی بات مان لی جائے اور جو بھی خیال وارد ہوا سے دو سطر میں خبر کی طرح بیان کر دیا جائے اور بس۔

دراصل ہر چیز کا اپنا مقام ہے سب جیون ساگر میں سب کے لئے جگہ ہے جس طرح پوپ میوزک کا اپنا مقام ہے اور اصل میوزک کا اپنا۔ اسی طرح پوپ شاعری کا اپنا مقام ہے اور اصل شاعری کا اپنا۔ کہا جاتا ہے کہ آرٹ اور فنونِ لطیفہ انسان کے تحت الشعور پر اثر انداز ہوتے ان کا اپنا Subliminal دائرۂ اثر ہے۔ ہاں بیشتر اردو کی نظمیں اور بے شمار معرکہ آرا نظمیں اردو میں ایسی ہیں جن کے مختلف حصے منہا کر دیے جائیں تو شاید ان کے مواد پر کوئی اثر نہ پڑے مگر کیا ان کی اثر پذیری میں بھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس عمل تدوین سے بیشتر نظمیں مختصر اور کچھ شاید مواد کے اعتبار سے جامع بھی ہو جائیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ، مشاہدے کے تجزیاتی مظاہر کا سحر، تخلیقی اکائیوں کے impulse شعری تلازمے میں موسیقیت کے کیف Resonance سے تحت الشعور کو متاثر کرنے کے ہنر اور اُس سے بڑھ کر جہانِ معنی کے مختلف جہات اور ابعاد کو لفظوں کے Finer Shades سے آشکار کرنے کے لطیف عمل کا کیا نعم البدل ہوگا۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ لی جائے کہ آج کا شاعر بھی اسی پیرائے میں نظم کہنے کی کوشش کرنے لگے۔ نہیں ایسا کرنا شاید نہ ممکن ہو نہ سودمند۔ کیونکہ ہماری زندگیوں سے ریاضت کا عنصر بالکل اٹھ گیا ہے نہ تخلیق کار میں ہے نہ قاری میں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جیسے مغربی ادب نے اپنے ہر دور کے ادب کو اس دور کے تناظر میں دیکھا ہے وہ تہذیب نظر ہمیں بھی اپنانی ہوگی۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ملٹن کو شروع میں رد کیا مگر اپنے زیادہ بردبار، سنجیدہ اور مبعوث دور میں اسی ملٹن کو Reasses کیا۔ کیونکہ ایلیٹ نے نہ حصول علم سے منہ موڑا نہ ریاضتِ فن سے، تو لامحالہ نتیجہ وہی ہو سکتا تھا جو ہوا۔ جوش کو من وعن قبول کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جوش کے یہاں خامیاں ہوں گی

اور ہیں مگر اسی یارڈ اسٹک (Yardstick) سے اوروں کو بھی ناپے۔ پیمانے معروضی ہونے چاہئیں شخصی نہیں۔ ہم اپنی سہل پسندی اور تعصب، کی وجہ سے تخلیقی تاریخیت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔

جوش اردو ادب کے اسلوبیاتی نظام کی بہت برگزیدہ ہستیوں میں آتے ہیں ان کا معنوی نظام اتنا مربوط ہے کہ غالب کے بعد اس باب میں انہی کا نام آئے گا۔ جوش کی اساس ہی معنی ہے۔ جس انگریزی یا مغربی نظم سے ہم اتنے متاثر ہیں اگر اس کے صوتیاتی اور معنویاتی نظام پر جوش کے اسلوب کو پرکھیں تو کھرا سونا ملے گا۔ جن لوگوں نے ڈھونڈا ہے انہوں نے پایا ہے۔

اب آخر میں جوش کے کلام سے کچھ مثالیں اس وضاحت کے ساتھ کہ میرے نزدیک اسلوب صرف تشبیہوں، استعاروں، امیجری اور میکانیکی ساخت سے عبارت ہیں نہ ہی صرف معنویاتی ارتباط اور صوتیاتی نظام کا نام ہے۔ اسلوب تو ان تمام چیزوں کا مرکب ہونے کے ساتھ ساتھ زمینی حقیقت اور ایک ماورائی فطانت کی آمیزش سے حاصل کردہ ترسیلی اکائی کا نام ہے۔ خون میں چٹکیاں لینے اور لاشعور کے کسی نہاں خانے میں اک دائمی ارتعاش پیدا کردینے کا ہنر ہے۔ جوش نے الفاظ تو الفاظ بحروں سے حیرت انگیز کام لیا ہے۔ اُن کی ۱۹۳۸۔۱۹۴۰ کے آس پاس کی بہت مشہور نظم ہے ''تعاقب''

مرد عشق سے جہاد کرو
تم مجھے بھول کر نہ یاد کرو

اس نظم میں جوش نے بحر کے استعمال اور الفاظ کے Rythmic Pattern سے وہ کام لیا ہے کہ ہر لفظ تعاقب کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی بات کو برسوں پہلے پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون ''جوش اعظم'' میں لکھا بھی تھا۔

''اسی طرح جوش کا ایک اور غیر مطبوعہ شعر

گاہ دل اتنی لطافت میں ڈبوتا ہے مجھے
چاندنی کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

یا ایک بہت پرانی غزل کا ایک شعر

گذر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
چراغ مجلس روحانیاں جلاتا جا

اس ''چراغ مجلس روحانیاں کی لطیف ترایمائیت خاصے کی چیز ہے۔
یا پھر وہ ذہن ساز اور عہد آفریں فکر کا حامل شعر

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اسی قبیل کے دو چار اشعار اور یاد آ رہے ہیں۔ اسلوب کی اثر آفرینی دیکھتے جایئے:

دشمن کی سمت ایک ذرا مسکرا کے دیکھ
اس حربۂ لطیف کو بھی آزما کے دیکھ

بدلے کی رسم دین وفا میں حرام ہے
احسان اک شریف ترین انتقام ہے

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے

آیئے ہم ساتھ مل کر جوش کے چند مصرعے جو اس وقت یاد آ رہے ہیں ان کے تخلیقی اعجاز سے لطف اندوز ہوتے ہیں

مہک رہی ہے ہوا کم سنی کی خوشبو سے
برہنہ پا ہے تو ہر نقش گلابی ہے

بھنورے ہیں کہ اڑتی ہے کہانی پہ کہانی

شعری بوطیقا میں غیر معمولی حسیت کے ساتھ ساتھ خلاقانہ ایمائیت کے امتزاج سے جو بوقلمونی پیدا ہوتی ہے اس کی سحر انگیزی کو پیمبرانہ اثر آفرینی کے علاوہ اور کیا نام دیا جائے۔ چند رباعیاں یا اشعار اسی تناظر میں ملاحظہ فرمائیے۔

میں شمع جب عمیم کا طاق ہوں میں انسان کی توحید کا مشتاق ہوں
میں انسان ہوں باشندۂ آفاق ہوں مشرق کا نہ پابند نہ مغرب کا اسیر

کیا بتاؤں کہ وہ دم گلگشت
کس ادا سے قدم اٹھاتی ہے

جیسے کلیوں پہ رشحۂ شبنم
جیسے آنکھوں میں نیند آتی ہے

آخر میں آج کی دنیا کے تناظر میں جوش کی ایک دردمندانہ پکار

ایمان کی لذات کی خواہش ہے شدید
ہر چیز ہے اسباب طرب کی تمہید
حوران بہشت و دختران کفار
باقی نہ اگر رہیں تو غازی نہ شہید

اک چاپ ہے تاریک گذرگاہ میں ہشیار
اک سایہ ہے دیوار پہ ہاں جاگتے رہنا
پھر خاتم وحشت کو ضرورت ہے نگیں کی
الماس تراشان جہاں جاگتے رہنا

تم اونگھ بھی جاؤگے تو دامان تمدن
پھٹ جائیگا مانند کتاں جاگتے رہنا
سن سن ہے خموشی میں دن بول رہا ہے
فتنے ہیں دبے پاؤں رواں جاگتے رہنا

سید محمد عقیل

جوشؔ کی شاعری میں

انقلاب، بغاوت اور ملیٹنسی

(Militancy)

جہاں تک یاد پڑتا ہے یہی ۱۹۴۴ء کا زمانہ تھا، جب جوشؔ صاحب الہ آباد میں ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم کے یہاں صبح صبح تشریف لائے۔ الہ آباد وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اعجاز صاحب کے یہاں نشور واحدی، مجازؔ لکھنوی اور معین احسن جذبیؔ صاحب پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ جوشؔ صاحب نے بیٹھتے ہی اعجاز صاحب کو مخاطب کر کے ایک شعر داغ دیا:

جنگ جوئی ہے میری فطرت میں
آفریدی پٹھان ہوں پیارے

مشاعرے میں جگرؔ صاحب سے کچھ نوک جھونک ہوگئی تھی، یہ اُسی کا خمار تھا۔ اعجاز صاحب بولے، بھئی ناشتہ تو پہلے کرلو، پھر جنگ بھی لڑیں گے۔ پھر جوشؔ صاحب نے اپنی نظم 'تلاش' گرجدار آواز میں پڑھنی شروع کی:

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد
آ، مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد

جس کے اندر دہشتیں پُر ہول طوفانوں کی ہیں

لرزہ افگن آندھیاں تیرہ بیابانوں کی ہیں

جس کے اندر ناگ ہیں، اے دشمنِ ہندوستاں

شیر جس میں ہو نکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں

چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افسر و اورنگ کی

... میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ

یہ تخاطب انگریزی حکومت سے تھا۔ مگر ذرا رکیے پہلے ایک بات اور کرتے ہیں۔ یہ اردو شاعری میں انقلاب کا لفظ سیاسی مقصد اور منطق کے ساتھ کب اور کیسے داخل ہوا؟ کیا جوشؔ سے پہلے کسی اور اردو کے شاعر نے یہ لفظ مع اپنے سیاسی متعلقات اور سیاق کے بالقصد استعمال کیا تھا؟ اور پھر اپنی شعری فضا میں اُس کو پھیلاتا چلا گیا؟ کم از کم راقم کو نہیں معلوم۔ یہ بھی جاننا چاہیے کہ اقبالؔ نے سب سے پہلے اس لفظ 'انقلاب' کا اپنی فارسی شاعری میں اپنے مجموعۂ کلام 'زبورِ عجم' میں انھیں معانی میں اور اسی تحرّک کے ساتھ استعمال کیا۔ 'زبورِ عجم' ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ ان کی غزلوں کے مجموعے میں اچانک یہ نظم نما شعری تخلیق بغیر کسی عنوان کے تیسویں نمبر پر چھپی ہے جو یوں شروع ہوتی ہے:

خواجہ، از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

از جفائے دِہ خدایاں، کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

میر و سلطاں نرد بازو کعبتینِ شاں دغل

جانِ محکوماں زتن بُردند و محکوماں بہ خواب

انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

مَن درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ اَم

آں چناں زہرے کہ از وے کارہا در پیچ و تاب

انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

راقم کو صحیح سنہ اور تاریخ تو نہیں معلوم مگر شاید کم و بیش اسی وقت ہندوستان کی اُس وقت کی ایک

ترقی پسند سیاسی پارٹی انڈین نیشنل کانگریس نے بھی ''انقلاب زندہ باد'' کا سیاسی نعرہ اپنایا تھا۔

جوش کی شاعری کی ابتدا تو غزل سے ہوئی مگر ۱۹۱۸ء میں جب انھوں نے ''وطن'' نام کی نظم لکھی، تو اُن کی فکر میں احتجاجِ بغاوت، انقلاب اور ملیٹنسی (جنگ جوئیت) کی کیفیت پیدا ہونا شروع ہوتی ہے۔ اگر چہ وطن پرستی کی لہر اُس وقت بھی اردو شاعری میں حالی (حبِ وطن)، چکبست اور اقبال نیز دوسرے شعرا کے یہاں پیدا ہو چکی تھی۔ مگر جوش کے یہاں وطن کی محبت تقریباً ایک متحارب جذبہ لے کر پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی نظم کے ساتھ اُن کی فکر میں احتجاج، بغاوت، انقلاب اور پھر ملیٹنسی کی کیفیت بیدار ہوتی ہے۔ جوش کی انقلابی اور ملیٹنسی کی شاعری پر باتیں کرتے ہوئے اُن کے ان مصرعوں اور اشعار کو بطورِ خاص نظر میں رکھنا چاہیے:

(۱) کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

(۲) اٹھو چونکو، بڑھو، منہ ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے، ہندوستاں والو

(۳) خواب کو جذبۂ بیدار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے دیتا ہوں

(۴) ذکر ہوتا ہے مرا پُر ہول پیکاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ

(۵) پھر تیشۂ نو ہوا ہے وادی میں بلند
پھر جوش دھڑک رہا ہے کہسار کا دل

یہ تحرک اور اقدام کی عملی ترغیب کی صورت ہے جسے پروٹسٹ اور احتجاج کا اگلا قدم سمجھنا چاہیے اور اسی ''ہاتھ میں تلوار'' اور ''تلواروں کی جھنکاروں'' کے ساتھ جوش کی انقلابی شاعری میں ملیٹنسی یعنی جنگ جوئیت شروع ہوتی ہے۔ یہاں جوش کی ایسی شاعری میں ایک واضح فرق پیدا ہوتا ہے، اُس اردو شاعری سے جو رائج الوقت، وطن پرستی کی شاعری تھی جس میں:

یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے
سنا ہے واں پہ محبت کی جنس سستی ہے
(چکبست)

یہ ایک طرح کی ''جی حضوری''، ''مائی باپ'' اور ''دریوزہ گری'' کی شاعری تھی جس کے مقابلے میں جوشؔ کی شاعری نے ایک للکار اور مقابلے، نیز چیلنج کی صورت موضوع اور لہجے دونوں میں پیدا کی اور یہ کیفیت جوشؔ کی شاعری میں تصورات اور فکری عمل کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ جس کی بنیاد ایسے اشعار بناتے ہیں:

کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں لیتا ہے رہ رہ کر فضا میں انقلاب
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرّے ذرّے سے عیاں آثارِ حرب و جنگ ہیں
تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر
خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر
میں اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا

اور یہ للکار، لہجہ اور چیلنج کی صورت صرف جوشؔ کے ساتھ ہی اردو شاعری میں داخل ہوتی ہے جس پر بعد کو سردار جعفریؔ، مخدومؔ، کیفیؔ اور مجروحؔ وغیرہ اپنی انقلابی دیواریں مضبوط کرتے ہیں۔ یہ آواز بے دریغ بھی ہے اور Cult of Energy بھی اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے، جوشؔ کی انقلاب کے لیے یہ اقدامی اور جرأت مندانہ جسارت بھی ہے۔ جوشؔ سمجھتے تھے کہ اگر ہندوستان، انگریزوں کی قید و بند سے چھوٹ جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کلونیلزم کی اندرونی بافت، بدنیتی، سامراجیت کی نیت کی کھوٹ کو سادہ لوحی سے آنک رہے تھے اور سامراجیت کے تمام وعدوں کو On the Face of It سمجھتے تھے۔ ہاں یہ ضرور جان گئے تھے کہ اس قید و بند کو توڑنے کے لیے عوام میں بیداری اور طاقت پیدا ہونی چاہیے، فکری طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ اور یہ اب ملیٹنسی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ محض احتجاج،

پروٹسٹ اور نعرے بازیاں کام نہیں آئیں تو جوشؔ للکار کر آواز دیتے ہیں:

میری آوازوں سے کانپ اٹھتا ہے روحوں کا سکوں
جذبۂ غیرت کی آنکھوں میں اُتر آتا ہے خوں
شور اٹھتا ہے کہ محض اک وہم ہے دار و رسن
یا تو اب ہم تاج ہی پہنیں گے یا خونی کفن

اور پھر جب آزادی مل جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، تو کہتے ہیں کہ:

قسم اس جوشؔ کی جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستاں جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا
مری تیغِ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

اپنی ایک اور نظم ''غلاموں سے خطاب'' میں کہتے ہیں:

توپیں گرج رہی ہیں سروں پر خبر بھی ہے
اے امتِ شکستہ دل وا ے گروہِ شل
کب سے بلا رہا ہوں میں تجھ کو سوئے عمل

تقریباً یہی صورت اُن کے اس وقت کے نثری مضامین میں بھی ملتی ہے جو اُسی وقت اُن کے رسالے ''کلیم'' میں آگے پیچھے شائع ہو رہے تھے۔ ایک بات اور یہاں قابلِ غور ہے کہ کیا یہ جنگ جوئیت جوشؔ کی اپنی انفرادی سوچ ہے یا اُس وقت یہ ملک کا اجتماعی مزاج بن رہا تھا۔ جواب اس کا 'ہاں' بھی ہے اور 'نہیں' بھی۔ ہاں اس لیے کہ ایسی فکر، شاعری میں اس وقت جوشؔ کی اپنی سوچ ہے۔ الفاظ کی تراش خراش، تلاش، جو جنگ جوئیت کے لیے اکسائیں، ترکیبوں کی ساخت اور ایسی شعری فضا بنانا جو جنگی اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا کرے، سب جوشؔ کی انفرادی جہت اور جہد ہے جو اُن کے موقف، یقین اور استقامات کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ یہاں تک تو جوشؔ کے لیے یہ بات صحیح ہے۔ 'نہیں' اس لیے کہ پورے ہندوستان کی فضا اور ماحول ہی ایک ایسے ہی ہیجان سے گزر رہے تھے۔ سیاسی طور پر انگریزوں کے خلاف یہ

ہیجان پورے ملک میں پیدا ہو گیا تھا۔ علی الخصوص جلیاں والا باغ کے بعد۔ اس صورت کی بلند چوٹیاں نان کو آپریشن تحریک، خلافت کی تحریک، بھگت سنگھ کی پھانسی اور ایک سیاسی و جذباتی خلفشار کی صورت سب مل کر ملک میں ایک انتشار پیدا کرتے ہیں، جس کا نقشہ جواہر لال نہرو کی ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں یوں ملتا ہے۔

"MASS UPHEAVAL AND THEIR SOPRESSIOM" (اجتماعی انتشار اور اُس کی سرکوبی):

''نو ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو علی الصباح متعدد گرفتاریاں پورے ملک میں شروع ہوئیں۔ پھر کیا ہوا کہ ہفتوں بعد ہم تک اخباروں کے کچھ تراشے بہم پہنچے۔ اور اب ہم اُن کی مدد سے صرف ایک نامکمل تصویر کا کچھ اندازہ کر سکے۔ یکا یک تمام اہم اور مشہور سیاسی لیڈر گرفتار کر کے موقع پر سے ہٹا دیے گئے اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا اور یہ کہ اب ہمارا لائحۂ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اب تو صرف احتجاج ہی ہمارا راستہ رہ گیا تھا۔ یہ احتجاج ہر طرف سے فوری طور پر ہوئے بھی۔ ان احتجاج کرنے والوں پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ آنسو گیس کے غبارے چھوڑے گئے اور عوام کے اس غم و غصے کے اظہار اور ان کی مشتہری کو حکومت نے سختی سے مسدود کر دیا اور اُن پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ اور پھر لوگوں کے یہ تمام دبے ہوئے احتجاج اور اجتماعی جذبات یکا یک پھوٹ پڑے۔ تقریباً تمام شہروں اور دیہاتوں میں عوام کے ساتھ پولیس اور فوج کا مقابلہ ہونے لگا۔ عوام بھی ان تمام ٹھکانوں پر حملہ آور ہوئے جو برٹش حکومت کے جبر کی علامتیں اور مستقر تھے یعنی پولیس اسٹیشن، پوسٹ آفس، ریلوے اسٹیشن وغیرہ۔ لوگوں نے ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے تار کاٹ ڈالے۔ ان غیر مسلح عام لوگوں نے اسی طرح نہتے پن کے ساتھ پولیس اور فوج کی گولیوں کا مقابلہ کیا۔ ان نہتے لوگوں پر حکومت نے

نیچی اڑان والے ہوائی جہازوں اور فوج کے اسلحوں سے گولیاں
برسائیں۔ تقریباً دو ماہ تک یہ عوامی بلوے کی صورت چلتی رہی''۔[1]

تو ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں کے تخلیقی ادب میں احتجاجی اور انقلابی ادب کی یہ صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں بنگالی، ہندی، پنجابی اور اردو شاعری میں اس کی روشن مثالیں، قاضی نذرالاسلام کی نظمیں 'وِدروہی' (باغی)، 'طوفان آگیا'، 'اے کہ رن باجا باجے گھن گھن'،[2] ''وہ دیکھو! نقارۂ جنگ پر چوٹ پڑی 'نونہال ہنستے ہوئے توپوں اور تلواروں پر گر پڑے اور انھیں اپنے معصوم خون سے چھینٹیں دینے لگے''۔ (نظم 'حاکم ومحکوم' ترجمہ اختر رائے پوری)۔ ''کہہ دے اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔ میں باغیوں کا سردار ہوں/ خوں خواری سے میرا جی بھر گیا ہے/ میں اُسی دن مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضائے آسمانی میں نہ گونجے گی/ ...دنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر میں تن تنہا سر اٹھا کر کھڑا ہوں[3]۔

ہندی میں نرالا کی نظم ''بادل راگ'' اور ''جاگو تو ایک بار'' اور پھر جوشؔ ملیح آبادی، مخدومؔ، مجازؔ، سردار جعفریؔ اور کیفیؔ اعظمی کے انقلابی اور احتجاجی رویوں کا مطالعہ، ہندوستان کی سیاسی طور پر بدلتی ہوئی تصویر کی خاصی روشن مثالیں ہیں۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ اردو میں ایک طرح کی اجتماعی صورت تو دبے دبے چکبست اور اسی قبیل کے دوسرے شعرا کے یہاں وطن پرستی کی شکل میں دکھائی دیتی ہے جس کا دامن کانگریس کی نیشنل سیاست سے ''نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے'' کی قدرے تیکھی صورتوں تک موجود ہے مگر یہ ایک طرح کی گلوگرفتہ (Subdued) شکل ہے جو ترقی پسندوں کے ساتھ ہی بلند آہنگ (Vocal) اور جسور ہو کر اُٹھتی ہے جس میں سب سے بلند اور بے دھڑک آواز جوشؔ ہی کی ہے۔ جوشؔ کے اس وقت کے جونیئر ہم نواؤں میں مجازؔ نے ۱۹۳۴ء میں اپنی نظم ''رات اور ریل'' میں علامتی ڈھنگ سے اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار یوں کیا کہ رات میں جو ریل چل رہی ہے یہ ایک طرح سے ہندوستان کی باغی روح ہے (لکھنؤ میں اپنی ٹیبل ٹاک میں مجاز اس کی وضاحت بھی کرتے ہیں):

ایک سرکش فوج کی صورت علم کھوئے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نوا کا خون کھولاتی ہوئی[۴]

تو شاعر آتش نوا کا خون کھولانے والی فضا اُس وقت پورے ہندوستان میں موجود تھی اور اردو میں جوشؔ اُس کے میرِ کارواں بن چکے تھے۔ تاہم جوشؔ کانگریس کی مفاہمتی سیاست کے ساتھ نہ تھے بلکہ اُن کا مزاج اور طبیعت کا انداز انقلابیوں کے ساتھ تھا جس کا عملی سربراہ بھگت سنگھ تھا۔ ۱۹۳۰ء میں بھگت سنگھ کے پھانسی پر لٹکائے جانے پر لاہور میں جو تعزیتی اجتماع ہوا تھا، جوشؔ اس اجتماع میں شریک تھے اور جب یہیں انھوں نے اپنا وہ قطعہ پڑھا:

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی
ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

(یہاں ''ندا'' کے لفظ پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ جوشؔ ''صدا'' کے بجائے ''ندا'' کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہیں)۔ تو پورے مجمعے پر ایک سناٹا سا چھا گیا اور ظاہر ہے کہ بھگت سنگھ کے کارنامے کے لیے جوشؔ صاحب کا یہ زبردست نذرانۂ عقیدت تھا (راوی خود جوشؔ صاحب)۔ پھر جوشؔ صاحب کی نظم ''شکستِ زنداں کا خواب'' اور:

اے جواں مردو، خدا را باندھ لو سر سے کفن

سر برہنہ پھر رہی ہے عزتِ قوم و وطن
ہاں زمیں کو زیر کرکے آسمانوں پر چڑھو
ہاں بڑھو اے صف شکن ہیرو، بڑھو جلدی بڑھو
پاؤں میں تاچند زنجیرِ غلامی کی خراش
صرف اک جنبش ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش

یہ سب باتیں جوشؔ صاحب کی ملیٹنسی کا اگلا قدم ہیں، جو عملی انقلاب کی طرف بڑھتا جارہا ہے۔ اور جو حرکت اور عمل کا پیکر بن کر انقلابی بصیرت کے ساتھ ملک کے حالات پر پھیلتا جاتا ہے۔ جوشؔ ان اقدامات کو ہندوستانیوں کی شخصیت میں ڈھال لینے کے خواہاں ہیں، جن سے جوشؔ صاحب کی ملیٹنسی سے بے خبر صرف ان کا کھوکھلا نعرہ یا اُس وقت کے فیشن اور فارمولے کی شاعری یا محض ''ہاو ہو'' سمجھتے ہیں یا سمجھانا چاہتے ہیں جب کہ یہی ''مخادیم ادب'' انگریز شعرا کی نظموں خصوصاً ٹینسن کی نظم ''چارج آف دی لائٹ بریگیڈ''، ساسون، سینج (Synge) اور بائرن کی کریمین جنگ پر لکھی ہوئی نظموں کو انگریزی ادب کا شاہکار (ماسٹر پیس) مانتے ہیں۔

راقم کا خیال ہے کہ جوشؔ کی ایسی فکر اور اقدام کی کوشش انقلابی شاعری کی عملی ترغیب کی صورت بھی ہے، جو انقلابی دور کی انقلابی صورتِ حال سے پیدا ہوئی تھی اور جو اس وقت ملک وقوم دونوں کے لیے ایک صحت مند اور لازمی صورت تھی اور جو اس وقت جوشؔ کے جذبے اور اُن کے ذہن کا مستحکم ایقان بن گئی۔ شاعری جب بھی کسی یقینِ محکم اور عصری آگہی کے ساتھ روحِ عصر کی تجذیب کر کے اپنی فکر اور کیفیت کا اظہار کرتی ہے وہ کھوکھلی نعرہ بازی یا اشتہار بازی اور لمحاتی بازگشت نہیں ہوتی۔ جوشؔ کا عقیدہ تھا کہ ملک کی آزادی کی خواہش اور اُس کی اقدامی صورتیں ہی ایک راستہ ہیں جو غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکتی ہیں۔ یہ کوششیں بنیادی بھی ہیں اور مستحکم بھی:

دیواروں کے نیچے آ آ کر، یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینے میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

یہ اور اسی طرح کی متعدد شعری کوششیں اور صورتیں یقین محکم اور ملیٹنٹ (Militant) اقدام، جذبے تیز حرکت اور عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ یقیناً شاعر یا ادیب کی حساسیت اُسے اُن حالات میں ڈوب جانے اور اسے عصری آگہی کا واقف کار بن جانے کی ترغیب دیتی رہتی ہے اور پھر ''خریدار تو بن''، ''جذب دروں'' اپنی فعالیت کو بھینٹ کر یہ نتیجے نکالتی ہے:

یوں بھڑکنے سے رہا، شعلۂ عزم منصور
پہلے پروانۂ شمع رسن و دار تو بن
قبضۂ یار میں رہنے کو اگر ہے بے چین
عرصۂ دہر میں چلتی ہوئی تلوار تو بن
کھیل تو آگ سے بجلی کا خریدار تو بن

وغیرہ۔

کبھی مقننینِ انقلاب اور انقلابی ادیبوں میں سے کسی نے غالباً برنارڈ شا یا چی گورا نے کہا تھا کہ انقلابی ادب بغیر انقلاب کے زیادہ دیر اور زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔ لیکن جوشؔ کا آزادی سے پہلے کا ہندوستان اس قول کا مصداق نہیں کہ وہاں ہر ہر قدم پر ایک جلیاں والا باغ بنتا نظر آتا تھا۔ نہرو کی ''ڈسکوری آف انڈیا'' سے جو اقتباس اوپر پیش کیا گیا اس سے ہندوستان کی انقلابی اور انتشاری صورتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو کم و بیش حکومتِ برطانیہ کے زیر سایہ پرورش پانے والی تمام قوموں اور ملکوں میں ایسی انقلابی صورتیں موجود تھیں جن پر بعد کو دوسری عالمگیر جنگ مستزاد ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ جوشؔ کی انقلابی یا جنگ جویانہ (Militant) فکر کو جو غذا مل رہی تھی، وہ ہندوستان میں پھیلی ہوئی انتشاری صورتیں ہی تھیں جو روز بروز ملک کو انقلاب کی طرف لیے جا رہی تھیں۔ جوشؔ انھیں سب حالات کو ہر طبقے میں دیکھ رہے تھے۔ یہی سب حالات اُن کی شعری فکر کا مسالہ بنتے تھے۔ یہاں تک کہ

مرثیہ جیسے مقدس موضوع میں بھی انھوں نے یہ انقلابی اور ملیٹنٹ اقدامی جہت تلاش کرلی تھی۔ اپنے مرثیے ''حسین اور انقلاب'' میں کہتے ہیں:

تاخیر کا یہ وقت نہیں ہے دلاورو
آواز دے رہا ہے زمانہ بڑھو بڑھو
ایسے میں باڑھ پر ہے جوانی بڑھے چلو
گرجو مثال رعد، گرج کر برس پڑو
ہاں زخم خوردہ شیر کی ڈہکار دوستو
جھنکار ذوالفقار کی جھنکار دوستو
تلوار شمر عصر کے سینے میں بھونک دو
ہاں جھونک دو یزید کو دوزخ میں جھونک دو

اپنی نظم ''ذاکر سے خطاب'' میں کہتے ہیں:

ہاتھ ہے ماتم میں تیرا سینۂ افکار پر
اور حسین ابن علی کا ہاتھ تھا تلوار پر

یہاں اُس اندرونی اور فکری کیفیت پر نظر رکھنا چاہیے جو ان مصرعوں میں اندرونی طور پر دوڑ رہی ہے۔ جہاں اصل چیز شاعر کی اُکسانے والی اسپرٹ ہی ہے۔ الفاظ اور تناسبات تو محض ایک طرح کا کور (Cover) ہیں۔ اسے بھی جوشؔ کے انقلاب اور ملیٹنسی (Militansy) کی ایک لہر سمجھنا چاہیے جس میں عصریت، تاریخیت اور ایقان میں ڈوب کر جنگ اور انقلاب کے لیے تیار کرنے والی کوشش پھیلتی نظر آتی ہے۔ یہاں شمر اور یزید کی علامتوں کے ظلم و تعدی پر عمل کرنے والی طاقتیں ہی پائے کوب ہیں، جن سے مقابلے کے لیے ''حسین ابن علی کا ہاتھ تھا تلوار پر'' والی صورت ہندوستان کو اختیار کرنی پڑے گی۔ اسی خاطر وطن کے لیے جان دینے کو جوشؔ نے مقصد نہیں بلکہ ذریعہ بنایا ہے اور ذریعے کو بغاوت، جنگ جوئی، قومی تحرّک اور بیداری کے راستوں ہی سے چلنا ہوگا۔

یہاں بے محل نہ ہوگا، اگر ایک بات کا اور ذکر کردیا جائے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی

نے ۲۰۰۲ء میں سردار جعفری پر ''علی سردار جعفری۔ شخص، شاعر اور ادیب'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں سردار جعفری نے عجیب بات لکھی ہے کہ شاعری میں لفظوں کی طاقت اور زور پر باتیں کرتے ہوئے مشہور جرمن مستشرق اناماری شمل (Anamari Schemel) نے لکھا ہے:

''جس پر ہماری نظر کبھی نہیں گئی کہ انیسویں صدی میں جو اردو کے طویل مرثیے لکھے گئے، اُن میں پروٹسٹ (Protest) موجود ہے انگریزی راج کے خلاف اور اس کو اِسی طرح (اَن کوٹ) Unquote کرنا پڑے گا جس طرح Quote کو Unquote کیا جاتا اور پڑھا جاتا ہے''۔[۵]

شاید یہ بہت دور کی کوڑی لانا ہوا کیوں کہ مرثیوں کا مقصد ہمیشہ سے ''مقصدِ ذبحِ عظیم'' کی اشاعت اور کسی حد تک ثوابِ اُخروی کا حصول ہی رہا ہے۔ ہاں مرثیوں میں جنگی اظہاریت میں تیور اور محسوسات کا تیکھا پن کسی حد تک حالاتِ زمانہ کا انعکاس بن سکتا ہے۔ بہر حال جوشؔ کے مرثیوں میں یہ جہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ اُن کے ایک اور مرثیے ''موجد و مفکر'' کا بند ہے:

جہل پھر رکھے ہوئے ہے علم کے سر پر قدم
خاک میں پھر مل چکا ہے آدمیت کا بھرم
زندگی پر مارتے پھرتے ہیں ٹھوکریں پھر دِرَم
کھل چکا ہے پھر دلِ انساں میں سونے کا علم
پھر دفِ زر بج رہا ہے، شور ہے اشرار کا
صف شکن یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا

ایک دوسرے موقعے پر عامۃ الناس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

عصرِ حاضر میں یزیدوں کا نہیں کوئی شمار
تم مصلّوں پہ دو زانوں ہو، مسلّح اشرار
شور ماتم میں کہیں تیغ کی جھنکار نہیں

لب پہ نالے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں

یہاں بھی "لب پہ نالے" اور "ہاتھ میں تلوار" کے الفاظ اشاری ہیں جنھیں جنگ جوئیت کی ترغیب سمجھنا چاہیے۔ خالی خولی بیانِ واقعہ نہیں۔ یہی ترغیب اوپر کے بند کے مصرعوں میں بھی ہے: "صف شکن یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا" جو اپنے ملکی حالات کے لیے ہے۔ اس طرح اناماری شمل کی یہ بات کہ مرثیے غیر ملکی حکومت کے خلاف ایمائی اور علامتی طور پر ایک طرح کا احتجاج بھی تھے، جزوی طور پر درست ہو بھی سکتی ہے۔ اگر چہ یہ مرثیہ پاکستان میں لکھا گیا ہے جہاں ملکی حکومت تھی۔ شاید وہاں کی فوجی حکومت کے خلاف سیاسی صورتِ حال میں یہ باتیں کہی گئی ہوں جہاں ایسا ظلم و جبر ایک وقت میں بہت عام ہو گیا تھا۔ تاہم جوشؔ کے ایسے مرثیوں میں ایسے حصوں کو صرف عوام مخالف دستِ تعدی کے خلاف آواز ہی سمجھنا چاہیے۔ یہ بند ملاحظہ ہو:

کربلا، اب بھی حکومت کو نگل سکتی ہے
کربلا، تخت کو تلووں سے مسل سکتی ہے
کربلا، وقت کے دھارے کو بدل سکتی ہے
کربلا، قلعۂ فولاد ہے جراروں کا
کربلا، نام ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

یہاں کربلا ایک عوامی طاقت کی علامت بن کر ابھرتی ہے جو ظالموں کا قلع قمع کر دے گی۔ یہ ایک انتباہ اور چیتاونی بھی ہے جس میں ملٹینسی کی لہروں (Vibrations) کے ساتھ جوشؔ کا آہنگِ انقلاب بول رہا ہے۔ ان بیانات کو کوئی کربلائیت کی تبلیغ نہ سمجھے بلکہ جوشؔ کا حالات کو بدلنے کا نسخہ سمجھے جس کا راستہ انقلاب اور جنگ جوئیت کے گلیاروں سے گزرے گا۔ اسی لیے یہاں الفاظ بھی تہدیدی ہیں، مدافعتی (Defencive) نہیں۔

جوشؔ نے اپنے ان انقلابی خیالات کی توسیع اور اُن کی کیفیات کی اظہاریت کے لیے جو زبان اور الفاظ کے مجموعے (Cluster of Worlds) اور ترکیبیں اپنی ایسی شاعری میں استعمال کیے ہیں، اُن کا تجزیہ نیز اُن کے تحرکات کے اندرون اور بیرون کے

کھیل کا جو اس انقلابی اور ملیٹنسی والی شاعری میں استعمال ہوا ہے، سب کا اندازہ کرنا بہت ضروری ہے کہ یہ صورتیں ان الفاظ اور تراکیب میں پرت در پرت اپنے معنوی تحرکات اور مہیج اور معانی کی پرکشائی، سب کی شرح و بسط رکھتی ہیں۔ ان پر سے اوپری طور سے سرسری گزرنے والے ان کے بطون اور تہ داریوں کا اندازہ نہیں کر سکیں گے۔ ان الفاظ کی ایسی کیفیات اور مختلف الالوانیوں (Manysidedness) کا ادراک بھی قاری اور سامع کے لیے بہت ضروری ہے کہ ان کیفیات کی تہ داریاں بھی جوشؔ کی شاعری میں خاصا کردار نبھاتی ہیں۔ پھر ان کی تشبیہات، استعارے اور جذبات کی پیکر تراشیوں کا ایک نگار خانہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے جن میں وقت، تاریخ، تہذیب اور گرد و پیش کی تجرباتی دنیا منعکس ہوتی ہے۔ یہاں سیاست کی گرماگرمی، پینترے بازیاں، ملیٹنسی کی بیرونی فضا بھی ہے جو سامعین اور متاثرین کے لیے ایک مہیج کا کام بھی کرتی جاتی ہے اور حالات کی اظہاریت میں بھی معین ہوتی ہے۔ جوشؔ کی ایسی شاعری میں ان پیچ داریوں اور صورتوں سے کنارہ کر کے کوئی بھی اُن کی انقلابی اور ملیٹنسی والی شاعری کے ساتھ کبھی انصاف نہ کر سکے گا۔

حواشی:

۱۔ ڈسکوری آف انڈیا ص ۹۶-۴۹۵، پیپر بیک ایڈیشن۔ انگریزی سے ترجمہ بذریعہ راقم۔

۲۔ آگمن (ترجمہ اختر رائے پوری)۔

۳۔ ترجمہ اختر رائے پوری۔ نظم "بدروہی" (باغی)۔

۴۔ آہنگ، مطبوعہ ۱۹۳۴ء، مطبوعہ حلقۂ ادب، لکھنؤ، ۱۹۴۲ء۔

۵۔ علی سردار جعفری۔ شخص، شاعر اور ادیب مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی، ص ۱۵، مطبوعہ ۲۰۰۲ء۔

جوش کی شاعرانہ عظمت

جوش ملیح آبادی بیسویں صدی کے اُن عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی انقلابی شاعری سے الگ پہچان بنائی۔ جوش نے ایک طویل دور میں جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے ادبی، سیاسی و سماجی رجحانات کو اپنی شاعری کے ذریعہ متاثر کیا ہے۔ جوش کی شخصیت اس اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے قدیم جاگیردارانہ نظام کے برخلاف نئے سوشلسٹ نظام سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ جوش شروع سے آخر تک مشترکہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کے حامی رہے اور جب وہ ۱۹۵۵ء میں پاکستان چلے گئے تب بھی ایسا نہیں تھا کہ ان کا نقطۂ نظر بدلا ہو۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت کی سیاسی اور معاشی فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ جوش کی شاعری خوبصورت ترکیبوں، حسین تشبیہوں اور استعاروں سے بھری پڑی ہیں۔ ان کو نہ الگ الگ خانوں میں بانٹ دینے سے کام چلتا ہے اور نہ ہی محض بصری، سمعی اور لمسی پیکر کہہ دینے

ہے۔ انقلاب جوش کی شاعری کا ایک نہایت اہم موضوع تھا۔ وہ خود بھی اسی انداز میں سوچتے تھے اور وقت کا دھارا بھی ذہنوں کو اسی سمت بہائے لئے جا رہا تھا۔ جوش کی شاعری میں ہمیں ان کا باغیانہ مزاج بھی دیکھائی دیتا ہے۔ بغاوت کا میلان بھی ان کے اندر بچپن سے ہی ملتا ہے۔ بغاوت کا یہ میلان ان کی شخصیت میں کئی روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جوش کے بچپن کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ باپ کی مخالفت کے باوجود شاعری سے دست بردار نہ ہوئے اور باپ سے اجازت بھی لے لی۔ جائداد کی پرواہ کئے بغیر اپنے آبائی سنّی مسلک کو ترک کر کے شیعہ مسلک اختیار کیا اور پھر الحاد کی طرف بڑھے۔ جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجو جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی کھل کر مخالفت کی جو انگریز دشمنی کی صورت میں واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ مالی منفعت کے لئے حیدر آباد سے منسلک ہوئے، پھر بغاوت ہی کے سبب وہاں سے شہر بدر بھی ہوئے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آزادی ملنے کے بعد ماتمِ آزادی نظم لکھی، جس سے بے اطمینانی ظاہر ہوتی ہے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان گئے وہاں متنازعہ شخصیت بنے رہے اور حکومت کے عتاب کے شکار بھی ہوئے۔ جوش کی شاعری اور ان کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ انہوں نے جگہ جگہ اسلام اور مولویوں کا مذاق بھی اُڑایا ہے۔ ان کے بہت سے اقوال الحاد کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک متنازعہ پہلو ہے۔ اسی لئے توبسمل سعیدی نے اپنی ایک رباعی میں کہا ہے

الحاد کے زینے سے اتر لیتا ہے جوش   دامانِ مرادیوں بھی بھر لیتا ہے جوش
زردار مسلمانوں کی خلوت میں کبھی   اللہ کا اقرار بھی کر لیتا ہے جوش

یادوں کی بارات میں انہوں نے بچپن کے جو واقعات قلمبند کئے ہیں ان میں بھی انہی خواہشات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً بچوں کو درس دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنا پڑھا ہوا سبق بچوں کو پڑھاتے دوسرے دن سبق سنتے اور جو نہ سنا سکتے ان کی پٹائی

کرتے۔ یہی حال آگے چلکر انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں بھی کہا جن کو ان کی شاعری پسند نہ آتی وہ ان کے طنز کا نشانہ بنتے اور اسے انہوں نے گونگا، بہرہ اور جاہل تک کہہ ڈالا

اندھوں سے جب پڑا ہو زمانے میں سابقہ

اے جوش آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا

صد حیف قدرت سے ملا ہے یہ حکم

بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

ایک مفکر کی حیثیت سے جوش کی نظر میں حیات و کائنات کے مختلف پہلو ایک متضاد کیفیت کے حامل نہیں ہیں اور نہ ہی باہمی ٹکراؤ ان کا مقصد ہے بلکہ وہ انہیں ایک دوسرے کی تشکیل و تکمیل کرنے والے عناصر سمجھتے ہیں اور اسی نظریے پر اپنے فکر و نظر کی بنیاد رکھتے ہیں۔ جوش کی نگاہ پورے عالمِ شہود اور مکمل کائنات کا احاطہ کرتی ہے یہ نقطہ نگاہ جہاں اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور کسی بھی سوچنے والے دل و دماغ کو صرف تعمیر اور ارتقاء کے لغوی مفہوم ہی سے آگاہ نہیں کرتا بلکہ اس سے دور رس نتائج سے بھی آشنا کرتا ہے۔ مثلاً ایک نظم میں جس کا عنوان ہے 'میرے اجزائے فکر' جوش کہتے ہیں

میرا یہ نام ہے جو ذرا سا اس امر میں شامل فقط زمیں ہی نہیں آسماں بھی ہے

اس منزلت میں مرحمتِ ملحداں کے ساتھ کچھ عنصرِ نوازشِ روحانیاں بھی ہے

تنہا نہیں نوازشِ روحانیاں کی بات فیضانِ اشتراکِ خرابیاں بھی ہے

جوش کی شاعری میں ان کے مرثیوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، انہوں نے مصائب اور گریہ کے بجائے شجاعت، ایثار اور حق گوئی جیسی عظیم انسانی قدروں کو اپنے مرثیے میں مرکزیت عطا کی ہے اور مرثیہ گوئی کا مزاج بدل دیا۔ حسین اور انقلاب کے چند بند ملاحظہ ہوں

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بہ دم — دشتِ ثباتِ عزم ہے دشتِ بلادِ غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم — اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے — جس سورما کا اسمِ گرامی حسین ہے

جوش کربلا میں اس انسان کی تلاش و جستجو میں سرگرداں تھے جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا اور جس کا وجود ''عدل و مساوات کی مراد'' تھا جو ''امن کا کردار'' تھا اور عزمِ بشر کی بے مثال یادگار تھا۔ جوش نے اپنی شاعری میں انسانی عظمت کی طرف بھی کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ جس انسانی عظمت کا ذکر جوش نے اپنی شاعری میں کیا ہے اس کو پڑھ کر ہمیں ان کی عظمتِ شاعری کا بھی اندازہ ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش ہندوستان کے عظیم شعراء کالیداس اور سنت کبیر سے لیکر نظیر اکبر آبادی تک عظمتِ انسانی کے بارے میں ہندوستانی روایت کے وارث تھے لیکن جوش عہدِ حاضر کی تعقل پسندی اور سائنسی بصیرت سے بھی انسانی عظمت کا مینار تعمیر کرنے میں فیض اُٹھاتے ہیں اور اس طرح سے جدید فکر سے قریب آجاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جوش کی باغیانہ اور انقلابی شاعری میں بھی انسان کی عظمت کا جوہر پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے ایک مضمون میں صحیح لکھا ہے کہ:

> ''جوش کی انقلابی شاعری کا اول و آخر حوالہ عظمتِ انسان ہے اور جوش نے اس عظمت کے عرفان کے لئے قدرت شناسی پر زور دیا ہے''

جوش اپنی نظم ''عظمتِ انسان'' میں کہتے ہیں:

مرغ زار و چمن و کوہ و صحرا — سبزہ و شبنم و ریحان و گل و سرو صبا
ذرہ و اختر و مہر و مہ و دشت و دریا — سب یہ گونگے ہیں اُٹھائے ازلی سناٹا
کرۂ ارض و سماں کھول رہا ہے انساں — اس خموشی میں فقط بول رہا ہے انساں

عظمتِ آدم کے بارے میں دو نظمیں 'عروجِ انسانی' اور 'اے نوعِ بشر جاگ' بھی اپنی فنی تعمیر

اور پیکر تراشی کے لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ 'عروجِ انسانی' صرف انسان کی قوت وقدرت کا رزمیہ نہیں بلکہ اس میں ایک رقیق اور جرأت مندانہ فلسفیانہ پیغام بھی ہے۔ ایسی نظموں کو پڑھ کر قاری جوش پر الحاد کا الزام لگاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ خدا کے وجود کا انکار نہیں کرتے صرف یہ دکھاتے ہیں کہ خدا زمین پر جس انسان کو بھیجتا تھا اس نے عقل و ذہانت اور اپنی بے کراں تخلیقی قوتوں سے اس دنیا کو کتنا حسین بنا دیا ہے۔ انسان کے لئے عیش ونشاط کے کتنے سامان پیدا کر دئے ہیں۔ انسان اس زمین پر ایسے مناظر پیدا کرتا ہے جو ناپید تھے۔ چاند کے بعد مریخ پر پہنچنے کا سامان ہورہا ہے۔ جوش شعرانہ اشاریت اور تمثیلوں سے بتاتے ہیں کہ خدا اور انسان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں، کوئی کشمکش نہیں۔ جن کارہائے جہاں کی تکمیل کے لئے خدا نے آدم کو زمین پر اُتارا تھا وہ انہیں کاموں کی تکمیل کر رہا ہے۔ 'اکتارا' جوش کی ایک شاہکار نظم ہے جس میں انسانی عظمت کے نقوش تو اُبھرتے ہیں لیکن اس سے زیادہ نظم کی تمثالوں اور علامتوں کے مترنّم سایے ہیں۔ انسان کی وحدت کا تصور بھی سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ انسانی وحدت جوش کی سماجی فکر کا کعبہ ہے۔ وہ بار بار اس موضوع کی طرف آتے ہیں۔ 'اکتارا' جیسی گہری اشاراتی نظموں کے آہنگ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش انسان کو ہر طرح کی جغرافیائی، نسلی اور مذہبی حد بندیوں سے آزاد صرف ایک انسان کی شکل میں دیکھتے تھے اور اس کے اخلاق وتوانائیوں کا یہی نقش اجاگر کرتے تھے۔ 'اکتارا' نظم کا کینوس بہت وسیع ہے اس کے دامن میں انسان کی وہ تمام سرگرمیاں جذباتی وابستگیاں اور لاتعداد انسانی رشتے متحرک نظر آتے ہیں جن سے انسان اور انسانیت عبارت ہے۔ خود اپنی ذات کو شاعر نے نظم کا مرکزی نشان بنا دیا ہے۔ مثلاً:

سب کی آنکھیں، میرے تارے — سب کے کاجل، میرے پارے

سارے انسان، میرے پیارے — سب کی سانسیں میرے دھارے

بول اکتارے جھن جھن جھن جھن — ساری دھرتی میرا آنگن

جوش بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا۔ بعد میں انہوں غزل گوئی ترک کر دی۔ نظم نگاری کو ذریعہ اظہار بنایا غزل کے مخالفین میں شامل ہو گئے اور ایک ممتاز نظم نگار کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی۔ ان کے فوراً بعد کی نسل نے ان کے گہرے اثرات قبول کئے۔ غزل کی مخالفت میں انہوں نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ لیکن ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ غزلیہ روایت کے سحر سے کبھی آزاد نہ ہو سکے۔ ان کی تمام تر کامیاب نظمیں غزلیہ رنگ و آہنگ سے مملو ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا حسن بھی ہے اور قبح بھی، خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ ان کے تمام نقادوں کی کم وبیش یہی رائے ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جوش کا تخلیقی باطن غزل سے ہم آہنگ تھا۔ ان کی ذہنی تربیت کلاسیکی روایت کے زیرِ اثر ہوتی تھی۔ عزیز لکھنوی سے انہیں تلمذ تھا۔ تقریباً چھ سال تک یہ رشتہ برقرار رہا۔ عزیز غزل کے مستند اساتذہ میں تھے، ان کے مشہور شاگردوں میں اثر لکھنوی، جگت لال رواں اور جوش ہیں۔ عزیز کی تربیت نے بھی جوش کو کلاسیکی رموز و نکات سے آشنا کیا۔ جوش اس کے معترف ہیں وہ کہتے ہیں:

'اس میں شک نہیں کہ حضرت عزیز بہت ہی اچھے استاد اور بہت ہی ذی علم بزرگ تھے، جہاں تک زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے، ان کی ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا ہے'

[یادوں کی بارات ص ۱۲۹]

جوش کی غزلیہ شاعری میں پیکر تراشی کا عمل بھی بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ ہمیں دکھائی دیتا ہے ان کی شاعرانہ فکر بھی اپنی بعض خصوصیات کے ساتھ دانش و دانائی کا ایک الگ گوشہ ہے۔ جذبہ اور احساس کے بغیر تو شاعری اپنے مفہوم سے ہی محروم ہو جاتی ہے لیکن جو روشنی اسے نئی جہتوں کی طرف لے جاتی ہے وہ عقل، علم اور تجربے سے آتی ہے۔ جوش نے سوچنے کے عمل کو زیادہ بامعنی بنا دیا ہے۔ جوش کی پیکر تراشی کو اس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھنا ضروری

ہے۔ یہ شعر بطور خاص اس بات کی نشاندہی کرتا ہے۔

آ چکا ہے رونقِ فردا کا جنبش میں جلوس　　　آدمی کا خانۂ امروز، ویراں ہے تو کیا

کہیں کہیں جوش نے پیکر تراشی اور نقش گری میں تاریخی معلومات اور صدیوں سے چلی آتی ہوئی روایتوں کا بھی سہارا لیا ہے اور بڑے خوبصورت انداز میں لیا ہے

آ رہی ہے آگ لنکا کی طرف، بڑھتی ہوئی　　　آج راون کا محل، سیتا کا زنداں ہے تو کیا

جوش کی ایک مختصر سی فی البدیہہ غزل ہے۔ اس میں پیکر تراشی کے ایک دو بہت ہی حسین نمونے موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو

تم میری سمت نہ دیکھو کہ میرے چہرے پر　　　آرزو کی ہے شکن، لہر ہے ارمانوں کی

مسکراتے ہوئے یوں آئے وہ میخانے میں　　　رُک گئی سانس چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

ایک اور مختصر نظم کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔ یہاں بھی پیکر تراشی کا عمل متحرک ہے۔ اور متحرک تصویروں کا سا انداز رکھتا ہے۔

جھومتی جب کبھی اُٹھتی ہے گھٹا قبلے سے　　　اپنی بیتی ہوئی راتوں کا خیال آتا ہے

دل سے اُٹھتا ہے دھواں دہر پہ چھا جاتا ہے　　　ہائے وہ وقت جب اپنے پہ ترس آتا ہے

جوش نے اپنے محسوسات اور تصورات کے مختلف رنگوں سے جس خوبصورت اور زندگی سے بھرپور شعری کائنات کی تخلیق کی ہے اس کا مرکزی کردار انسان ہے۔ اسی کردار کے گرد اُن کی پوری کائنات رقص کرتی ہے۔ جوش کی شعری تخلیقات میں ابتدائی دور سے ہی انسان دوستی کی ایک زیریں لہر کا احساس ہوتا ہے جو ہمیں انسانی دردمندی، دلسوزی، جذبہ معصومیت اور قلبی تاثر کی شکل میں ملتی ہے، ''ٹھنڈی انگلیاں'' اور ''درد انگیز کھلونا'' جیسی مختصر نظمیں اس کی مثال ہیں لیکن اس وقت میں ان کی ایک نظم کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ 'وطن' ان کی ایک پرانی نظم ہے۔ جس میں ان کا تصورِ وطنیت نہایت واضح طور پر جلوہ گر ہے اس پر خود جوش نے ایک حاشیہ لکھ کر اپنے نظریہ وطنیت کو واضح کیا ہے حاشیہ کے الفاظ یوں ہیں:

'میں تمام نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں، وطن کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابنِ آدم کی تقسیم چاہتا ہے انتہائی حقارت سے دیکھتا ہوں لیکن اس قدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے'۔

افلاس، استحصال اور جہل کے خلاف جتنی طاقتور اور پُر اثر آواز جوش کی نظموں میں محسوس ہوتی ہے شاید اردو شاعری میں کہیں اور محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اس سے صرف جوش کے جذبات کی گرمی اور تڑپ کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کی ذہنی توانائی اور آگہی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے جیسے یہ دائرہ فکر پھیلتا جاتا ہے ان کی نظمیں ایک نئی کائنات تعمیر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ درسِ آدمیت، زوالِ جہاں بانی، 'نظامِ نو' اور نیا میلاد جیسی نظمیں ایک عالمگیر اور غیر طبقاتی انسانی سماج کی تصویر پیش کرتی ہیں جیسے

تلاطم میں ہے قصرِ آہنی سرمایہ داری کی	نظر ہے کلبۂ مزدور پر معمار فطرت کی
درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی	شاہانِ کج کلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی

یا پھر

شمعِ برتر آدمیت کی جلا دی جائے گی	ایک انوکھی ضو سے دنیا جگمگا دی جائے گی

اس نوع کی نظموں میں ان کا نظریۂ انسان دوستی اپنے نکھرے ہوئے روپ میں نظر آتا ہے عالمی اخوت، علم اور روشن خیالی، جبر و استحصال سے نجات اور مسرتوں سے معمور سماج کا خواب جیسے موضوعات ان میں سانس لے رہے ہیں۔ یہی عالمگیر اعلیٰ انسانی قدریں ان کے تصورِ حیات کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ انہوں نے خارجی اور فطری مناظر کی تصویر کشی اور پیش کش کے وسیلہ سے بھی کبھی انسان کی سربلندی اور عظمت کے گیت گائے ہیں۔ 'بدلی کا چاند' جیسی خوبصورت نظم کا آخری شعر ملاحظہ ہو

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انسان کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

یا 'ماتمِ آزادی' کے دو بند دیکھئے۔

بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار — سرو سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار
گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گل عذار — جیحوں نہ جامِ جم نہ جوانی نہ جوئے یار
وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ — اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ

جوش کی شاعری کا تذکرہ ان کی شاہکار نظم 'حرفِ آخر' کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ ان کی برسہا برس کی فکری کاوشوں اور تخلیقی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے اور کئی اعتبار سے اردو شاعری کی تاریخ میں الگ اور منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ تخلیق کا رکائنات اور شعورِ انسانی کے ارتقاء کو نئے علوم کی روشنی میں جوش صاحب نے جن حِسیاتی پیکروں اور حرکی تصویروں میں پیش کیا ہے وہ اچھوتی اور بے مثال ہیں۔ یہ اردو زبان کی ایک ایسی نادر اور بے مثل نظم ہے جس کے تنقیدی تجزیے کے لئے ایک علیحدہ مفصل مضمون درکار ہے۔ اس وقت تفصیل میں جانے کا موقع نہیں اس لئے بس اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ حرفِ آخر انسانی شعور کی طاقت، عظمت اور وسعت کا ایک غیر فانی نغمہ ہے۔ مجموعی اعتبار سے جوش کی شاعری ایک جلوۂ صد رنگ ہے جس کا سب سے گہرا اور بنیادی رنگ انسان دوستی کا رنگ ہے۔

علی احمد فاطمی

مارکسی تصوّرِ جمال اور جوش

اس کا کیا کیا جائے کہ اردو میں چند خوش قسمت یا بدقسمت شاعر ایسے ہیں اپنی آزادخیالی، بے باکی وبزاعی صورتوں کی وجہ سے ذمہ دار اور ایماندارانہ تنقید کا حصہ نہیں بن سکے یا ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا۔ غالباً جوشؔ ان میں سرفہرست ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو خود جوشؔ، دوسرا عہدِ جوشؔ۔ جوشؔ اور عہدِ جوشؔ دونوں کے تضادات و تصادمات باہم کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں اور کچھ ایسا کام کر گئے ہیں کہ ہم آج بھی بقول شارب ردولوی عہد جوش کے تعصبات سے نکل نہیں پائے ہیں۔ آج بھی ڈھکے چھپے انداز میں جوش کے ساتھ یہ مسئلہ بنا رہتا ہے کہ جوش ہندستان کے شاعر ہیں یا پاکستان کے۔ شیعوں کے شاعر ہیں یا سنیوں کے۔ لکھنؤ کے شاعر ہیں یا دہلی کے۔ اور جب ان دونوں مراکز پر جوش چھا گئے تو علی گڑھ اور اعظم گڑھ نے سر اٹھایا اور مضطرب روایت پرست جاگیردارانہ سوچ نے جگر کے حوالے سے اردو کی غزلیہ شاعری کی کلاسیکی جمالیات کی نئی نئی تعریف و توضیح کی۔ جبکہ نئی جمالیات کو جنم دے رہے تھے ترقی پسند شعراء اور بالخصوص

جوش۔ لیکن یہ وہ جمالیات تھی جو اس روایتی اسکول کی ہی نہیں بلکہ پوری اردو شاعری کی جمالیات کی نفی کرتی ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ اردو شاعری میں ابتدا سے ہی اخلاقی و اصلاحی عناصر رہے ہیں۔ بعض صوفی شعرا کے یہاں یہ میلان ملتا ہے۔ لیکن یہ میلان کبھی بھی اردو شاعری کا غالب میلان نہیں رہا۔ اس کا غالب میلان ورجحان حسن و عشق ہی رہا۔ حسن صورت اور حسن بیان اور وہ اگر حواس خمسہ کی گرفت میں نہ آئے تو اور بھی بہتر۔ بقول جگر:

حسن وہی ہے حسن جو ظالم
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

یعنی شاعری جمالیاتی سطح پر اسی وقت معیاری اور حسین ہوتی ہے جب اس میں صوتی وصوری حسن ہی حسن ہو۔ کیفیت ہو، جذبہ ہو، زمانے کی تلخیوں کو بھلا دینے والا سرور ہو۔ اس بات کا تو معتبر نقادوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اردو شاعری ابتداء سے ہی دو دھاروں میں تقسیم رہی ہے۔ ایک فکریہ شاعری کا، دوسرا جذباتی ورومانی شاعری کا۔ دوسرا دھارا کچھ زیادہ غالب رہا ہے۔ ایسے لاتعداد شاعر ہیں جو صرف جذبے، محبت اور رومان کے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ پوری ایک روایت ہے۔ ایک دبستان ہے۔ مومن، داغ، حسرت، جگر سے لے کر سیماب اور نوح ناروی تک، لکھنؤ اسکول کا بھی ایک طبقہ ہے، جس پر فیوڈل طبقہ کی سرپرستی وحکمرانی رہی۔ بہت سارے دیگر اسباب کے ساتھ ایک سبب یہ بھی ہے کہ حسن و جمال کے عیش پسندانہ ماحول میں فکر وخیال کی شاعری سر نہ اٹھانے پائے کہ فکریہ شاعری کی مار بے حد خطرناک ہوتی ہے اور تاج وتخت کو بھی ہلا دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

ملاحظہ کیجیے ایک طرف غزلیہ شاعری کی روایت دوسری طرف بیسویں صدی کے تیزی سے سر اٹھاتے ہوئے نئے نئے انقلابی تصورات ونظریات جس نے پوری دنیا کے

شاعروں ودانشوروں کومتاثر کررکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندستان کے کھلے ذہن کے شعرا پر ان تصورات کا اثر ناگزیر تھا۔ جوشؔ نے بھی ان تمام فرسودہ روایتوں کو خیر باد کر کے ارضیت و سماجیت کو گلے لگاتے ہوئے اپنے ترقی یافتہ ذہن اور وژن کے ذریعہ ایک نئے جمالیاتی شعور کے ساتھ نظم میں شاعری کی تو وہ خود رومان اور جمال کا ایک اسکول بن گئے۔ جوشؔ نے ایک طرف انسان اور معاشرہ کے مسائل ومصائب کا عرفان حاصل کیا دوسری طرف زبان کے تہذیبی وتخلیقی امکانات کو ذہن میں بسا کر انسانی نظریۂ جمال کے زیراثر جو شاعری کی تو نظمیہ شاعری ہی نہیں بلکہ پوری اردو شاعری میں ایک ابال پیدا ہوگیا۔ خصوصاً جمالیات کی سطح پر کیا کھردرے و سپاٹ موضوعات کی بھی اپنی جمالیات ہوتی ہے۔ نہ رومان نہ وجدان۔ لیکن سچ یہ ہے کہ حقیقت کی اپنی ایک جمالیات ہوتی ہے اور جوشؔ کی حقیقی شاعری جمالیات کے در کھول رہی تھی۔ (جس سے اردو کا طبقۂ اشرافیہ جان بوجھ کر بے خبر تھا) اس لیے کہ جوشؔ کی جمالیات زمینی، انسانی اور انقلابی تصورات کی جمالیات ہے اور اردو شاعری کی جمالیات عشق و عاشقی، لذت کوشی اور مایوسی کی جمالیات ہے۔ نظیرؔ، انیسؔ، اقبالؔ اس روایت سے الگ ہوتے ہیں صرف اس لیے نہیں کہ یہ سب نظم کے شاعر ہیں یہ ایک سچائی تو ہے ہی لیکن اس سے بڑی سچائی یہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ زندگی کو برتنے کا فن ہے۔ حوصلہ ہے، امید ونشاط ہے۔ جوشؔ اسی قبیل کے شاعر ہیں لیکن ان کی جمالیات بیسویں صدی کی ترقی یافتہ جمالیات ہے جس سے نظیر وانیس واقف نہ تھے اور ہو بھی نہ سکتے تھے۔ اس لیے اصل جوش شناسی کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک طرف بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کی سماجی اور سیاسی تاریخ کو ذہن میں رکھا جائے، دوسری طرف ان انقلابی افکار ونظریات کو بھی سمجھا جائے جو مغرب ومشرق میں داخل ہو چکے تھے اور تقاضائے عہد کے تحت دبے پاؤں ہندستان کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ ساتھ ہی جوش کو سمجھنے کے لیے اردو شاعری کی روایت بالخصوص نظم کی روایت

(نظیر سے اقبالؔ تک) کو بھی سمجھنا ضروری ہے و نیز اس جمالیات کو بھی سمجھنا ضروری ہے جس نے بیسویں صدی کے تمام ترقی پسند شعرا کو بالعموم اور جوشؔ کو بالخصوص متاثر کیا یعنی مارکسی جمالیات۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تفہیم جوش کے لیے صرف مارکسی جمالیات بھی کافی نہیں بلکہ ہندستانی جمالیات کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ جوش کی شاعری میں ہندستان اور اس کا حسن دھڑک رہا ہے۔ اس میں صرف صبح و شام، کھیت، باغ اور جنگل کے حسین مناظر ہی نہیں بلکہ بازار، چوپال، خانقاہ، مولوی، پنڈت، مہاجن، کسان اور عام آدمی کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ ہندستانی جمالیات اور مارکسی جمالیات کی خوبصورت آمیزش اپنے پورے فطری پن کے ساتھ جوشؔ کے یہاں نظر آتی ہے اور یہاں یہ بات کہنے میں حرج نہیں کہ ہندستانی جمالیات کو مارکس کی نگاہوں سے مارکس کے تصورات کو ہندستان کی معاشرت کے حوالوں سے دیکھنے کی پہلی بار کوشش کی گئی اور بڑی سرمستی و شاعرانہ فنی چابکدستی کے ساتھ کی گئی۔ فکشن میں تو اس کی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ کیا اردو شاعری میں جوش سے قبل ایسی کوئی مثال ملتی ہے؟

افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو میں جمالیات پر بہت کم کام ہوا اور جو کچھ ہوا ہے اس نے ایک طرف یہ اعتراف کیا کہ اردو میں جمالیات پر کام نہیں ہوا۔ ساتھ میں یہ بھی اعتراف کیا کہ ہندستان میں بھی جمالیات پر غور نہیں کیا گیا۔ مجنوں گورکھپوری تاریخ جمالیات میں لکھتے ہیں:

> ''ہم کو اس قدر ماننا پڑے گا کہ مشرق میں کوئی صاحبِ فکر نہیں ہے جو اپنے جمالیاتی افکار کے لیے مشہور ہو۔ جمالیات ایک جداگانہ فلسفے کے روپ میں یورپ کی پیدا کی ہوئی چیز ہے۔''

نصیر احمد ناصرؔ نے تاریخ جمالیات میں لکھ دیا:

> ''ایشیا جمالیات کے فکری گوشے میں بالکل اجنبی نظر آتا ہے۔

ہندو فلسفے میں جن پر کوئی بحث نہیں ملتی۔''

اس وقت ہندستانی جمالیات پر بحث کرنے کا محل نہیں ہے حالانکہ میرا خیال ہے کہ اس کو سمجھے بغیر مارکسی جمالیات کی ہندستانی تعبیر نہیں کیا جاسکتی یا ہندستانی شاعری اور بڑی حد تک جوشؔ کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جب تک آپ کے ذہن میں رس کا، بھاؤ کا، شرنگار کا ادنیٰ سا تصور نہ ہوگا آپ رام سیتا کا پیار اور تیاگ، کرشن اور گوپیوں کی لیلائیں، پنگھٹ پر گوریوں کا تبسّم و تکلم، ساون بھادوں کی رم جھم، پپیہے کی کوکو وغیرہ بھی نہیں سمجھ سکتے، تو پھر آپ فاختہ کی آواز کو کس طرح سمجھیں گے۔ جنگل کی شہزادی، خاتونِ مشرق اور اس طرح کی نہ جانے کتنی نظموں کی تفہیم ممکن نہیں۔ اسی طرح جب تک آپ کے ذہن میں مارکسی جمالیات کا جدید ترین تصور نہیں ہے، محنت و معاشرہ کا واضح تصور نہیں ہے آپ کسان، مہاجن اور مفلس، گرمی اور دیہات کا بازار جیسی نظموں کو بھی مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان نظموں کو اب تک سمجھا نہیں جاسکا یا اردو کے ترقی پسند نقادوں نے مارکس کے تصورِ جمال کو بہتر طور پر پیش نہیں کیا۔ سردار جعفری، احتشام حسین، محمد حسن، سید محمد عقیل، اصغر علی انجینیئر، قمر رئیس، محمد علی صدیقی، اکرام بریلوی، اقبال حیدر، اور ریاض صدیقی وغیرہ نے اس موضوع پر اچھے کام کیے ہیں اور جوشؔ کو بہتر طور پر سمجھا اور سمجھایا ہے لیکن اس کے برعکس کے معاملات ان علوم سے بے خبری ظاہر کرتے ہیں اور طے شدی ذہنیت کی غمازی کرتے ہیں۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مارکسزم چونکہ ایک معاشی و اقتصادی فلسفہ ہے اس لیے اس کا فن اور خاص طور پر جمالیات سے کوئی سروکار نہیں۔ مارکس کا دائرہ فکر بیحد وسیع تھا۔ ادب، تہذیب، جمالیات بھی اس کی غور و فکر کا حصہ بنے۔ جمالیات کے ضمن میں اس نے ہیگل سے نہ صرف بہت کچھ سیکھا بلکہ اس کے تصورات کو نئی تعبیرات کے ساتھ آگے بڑھایا۔ مارکس سے قبل جمالیات کا تصور بڑی حد تک تخیل و تصور تک محدود تھا۔ جس کا سماجی

ساخت اور تاریخی کلیت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ مارکس نے جمالیات کا سماجی محرکات سے ایک مضبوط رشتہ پیدا کیا اور صاف طور پر کہا کہ انسان کا احساس جمال محض پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ سماج سے اخذ کیا جانے والا جوہر ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کا خیال ہے کہ کوئی بھی جمالیاتی قدر سے سماجی قدر الگ ہو ہی نہیں سکتی مارکس کا یہ بھی کہنا ہے کہ جمالیاتی تصور مجرد نہیں ہوتا اس کا سماجی زندگی اور طبقاتی جدوجہد سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ اگرچہ اس تصور میں بھی حسن اظہار کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مارکس وادی خیال کو اکثر لوگ اس کے سیاسی خیال کا عکس مانتے ہیں اور یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ کیا کسی فن پارے کی سماجی سیاسی قدر اس کی جمالیاتی قدر سے زیادہ اہم ہوتی ہے؟ یہ سوال اس وقت اٹھتا ہے جب ہم سماجی قدر اور سیاسی قدر دونوں کو الگ الگ شکل میں دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور جمالیات کو بظاہر خوبصورت دیکھنے اور خارجی سطح پر محسوس کرنے کی چیز سمجھتے ہیں اور سماجی قدر کو غیر جمالیاتی بنا دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی سمجھتے چلنا چاہیے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں اقدار کی موجودگی کسی فن پارے کو بڑا بنانے میں مدد کرتی ہے اگر کوئی فن کار ترقی پسند فکر کا حامل ہے اور جمالیات کو بھی ایک خاص فکر سے دیکھتا ہے تو اس کا امتحان اور بڑھ جاتا ہے۔ مارکسی خیالات کے نہ جانے کتنے ادیب و شاعر ہیں لیکن پریم چند، جوشؔ اور فیضؔ سب نہیں ہو پائے۔ بالزاکؔ کو زولہؔ سے بڑا فنکار قبول کرتے ہوئے مارکس نے اس سچائی کو بھی قبول کیا تھا۔ اس طرح لینن نے بھی ٹالسٹائے کو اہمیت دی کہ بغیر فن کے کوئی بھی فن پارہ بڑا نہیں ہوتا خواہ اس میں کتنی ہی سیاسی اور جمالیاتی قدر موجود ہو۔ مارکسؔ نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا۔ حالانکہ مارکسؔ کے پورے فلسفے کو مخالفین مارکس نے غیر ادبی اور غیر جمالیاتی قرار دیا اگرچہ مارکسؔ نے قدم قدم پر ادب کی ادبیت اور شعر کی شعریت اور اس کی اعلیٰ و ارفع قدروں پر زور دیا ہے۔ ماؤزے تنگؔ کے یہ جملے ملاحظہ کیجیے:

"سیاست کو ادب کے برابر نہیں بٹھایا جا سکتا اور نہ ہی عام

سماجیات کو فنی تخلیقات کے برابر بٹھایا جا سکتا ہے۔ ایسا ادب خواہ
وہ کتنا ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو اگر اس میں فن نہیں تو اس میں کوئی
طاقت نہیں۔''

مارکسی جمالیات ہرگز ایسا نہیں سوچتی کہ اگر کسی فن پارے میں سماجی حقیقت نہیں ہے تو وہ ادب نہیں ہے۔ وہ رومان و وجدان کو اہمیت دیتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ادب کسی بھی شکل میں اپنی انسانی واخلاقی قدروں سے دامن نہیں بچا سکتا۔ اس لیے کہ ادب بہر حال کسی نہ کسی شکل میں معاشرہ میں اپنا ایک رول تو ادا کرتا ہی ہے۔ اس لیے وہ قنوطیت، یاسیت پیدا کرنے والے ادب سے انکار کرتا ہے اور امید ونشاط کو جگہ دیتا ہے۔ مارکسی جمالیات کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ تخلیق کے بطن سے زندگی، معاشرہ کے تئیں امنگ وحوصلہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ حسن کی تلاش ہونی چاہیے، یہیں سے اس کے رشتے انسان، معاشرہ اور تاریخ سے وابستہ ہوجاتے ہیں جن کی نزاکتوں کو سمجھے بغیر لوگ نئی جمالیات کو غلط معنی ومطالب پہنانے لگتے ہیں۔

مارکس کے مقلدین نے اسے مزید عقلی و معیاری بنایا یعنی جمالیات کو مزید حقیقت پرست بنادیا۔

ایونیز زلیس اپنی کتاب Foundation of Marksist Aesthetics میں ایک جگہ لکھتا ہے۔

''اب فن لچکدار ڈھانچے میں محصور نہیں رہا اور ارفع و اسفل کا تضاد ختم ہوگیا اس سے ہمیں اپنے دھرتی کے جمالیاتی ثروت کا نیا عرفان حاصل ہوا اور حقیقت پرست فن نے موضوع کے انتخاب میں اشرافی، نازک مزاجی اور خبط کو جو ماضی کا خاصہ تھا ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔''

اس سے ادب میں حسن، عشق، رومان و جمال کا تصور ہی بدل گیا۔ ہیروازم کا

تصور بدل گیا۔ اب عام آدمی ہیرو بننے لگا۔ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ تصور تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ چنانچہ جمالیات کا یہ نیا تصور انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت اور خصوصیت سے نکل کر عمومیت میں داخل ہوگیا، جس نے محنت، عمل، ترقی، تبدیلی وغیرہ کو نئے ابعاد دیے۔ محنت اور فن کے درمیان ایک انسلاک و اشتراک پیدا کیا۔ سانکیز وانکیز جو مارکسی جمالیات کا ماہر ہے اپنی کتاب Art of Society میں کہتا ہے:

> ''محنت یوں تو صرف قابل استعمال اشیاء کی ہی تخلیق نہیں جو مخصوص انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے کام آتی ہے بلکہ وہ انسانی مقاصد، تخیلات اور احساسات کو ٹھوس اور محسوس اشیاء میں ان کے ذریعہ خارجی (Objectifying) دینے کا بھی فن ہے۔''

اصغر علی انجینئر اپنی کتاب مارکسی جمالیات میں لکھتے ہیں:

> ''فن اور محنت میں اشتراک انسانی جوہر سے ان کے مشترکہ رشتے کے ذریعے پیدا ہوتا ہے، یعنی کہ یہ دونوں تخلیقی سرگرمیاں ہیں جن کے ذریعہ انسان ایسی اشیا پیدا کرتا ہے جو اس کے اصل جوہر کا اظہار ہوتی ہیں، اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فن اور کام (یا محنت) میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔''

چونکہ محنت اور فن دونوں ہی سرمایہ دارانہ نظام میں ٹکراؤ کی صورت رکھتے ہیں اور بعض ماہرین جمالیات نے دونوں کو الگ الگ شکل میں پیش کیا ہے اس لیے ظاہری سطح پر دونوں کا رشتہ ناقابل فہم نظر آتا ہے۔ مارکس کا کہنا ہے کہ دونوں میں معاندانہ رویہ اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب محنت انسانی کی اصل صلاحیت یا حقیقی قوت کا اظہار نہ ہو کر بیگانہ محنت (Aliented labour) کی صورت اختیار کر لے مگر تخلیقی اظہار کی صورت میں

یہ فرق ختم ہو جاتا ہے۔ محنت اور فن کے اس نازک امتزاج کو جوش نے کسان نظم میں پیش کیا ہے جو اُردو کی ایک شاہکار نظم ہے لیکن محنت کے جمالیاتی تصور سے معدوم، محروم معیار پرست طبقہ اسے محض الفاظ کا ذخیرہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایسا طبقہ نہ صرف جوش بلکہ پوری عوامی شاعری، ترقی پسند شاعری کی مخالفت کرتا ہے اس لیے کہ اس عیش پسندانہ مزاج نسرین ونسترن کی جگہ پر دھنیا اور زرق برق میں ڈوبے معشوق کی جگہ جنگل کی دوشیزہ کو دیکھنے کو تیار نہیں۔ محفل و مخمل کی جگہ گاؤں، اوراوسارا، کھلیان، کھیت، باغ، مزدور، کسان، مالن و بھنگن کو اپنانے کو تیار نہیں۔ اس طرح گھیسو، مادھو، کالو بھنگی اور منگو کوچوان جیسے کھردرے عوامی کردار سے بھی ملنے کو تیار نہیں۔ خیر یہ تو نثر میں تھے لیکن اردو شاعری کے رنگین اور رومان پرور ماحول سے نکلنے اور دن کی دھوپ میں آنے کو تیار نہ تھے۔ لیکن انکار بھی کریں تو کیسے کہ زمانہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، تصورات تیزی سے بدل رہے تھے چنانچہ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے طرح طرح کے حملے شروع کردیئے جس کا سب سے زیادہ شکار جوش ہوئے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے بدلتی ہوئی زندگی کی حقیقت اور مادیت کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور جنہوں نے ان ٹھوس اور متبدل تصورات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرلی تھی جو بڑے حقائق کی شکل میں صرف ادب اور ثقافت کو ہی نہیں بلکہ پوری حیات اور کائنات کو حکیمانہ طور پر بدل چکے تھے۔ ان کے لیے مسئلہ نہ تھا اس لیے وہ واقف تھے کہ یہ تبدیلی بذات خود ایک جمالیاتی عمل ہے اور انسان کا فطری ولاشعوری عمل گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اپنی زندگی کو بہتر وخوبصورت بنانے میں مصروف ہے اس لیے کہ فطرت اور انسانی فطرت اپنے نظام میں حسن ہی دیکھنا چاہتی ہے۔ بدلتے یا بدلتے ہوئے حسن کی یہ چاہت ماورائی نہیں ہوتی بلکہ جدلیاتی مادیت سے پیدا ہوتی ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے یہ ایک بڑی حقیقت ہے اور اسی حقیقت کا نام مارکسی جمالیات ہے۔ جس کی نزاکتوں کو سمجھے بغیر اس پورے عہد اور اس سے وابستہ ادب اور ادبی جمالیات کو سمجھنا ممکن نہیں۔

غزل میں وسیع تر سنجیدگی کی گنجائش نہیں جو نظم کے لیے موزوں ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور غزل پرچھائیوں سے روشن ہے اور اسے دن کی دھوپ پسند نہیں۔۔۔ غزل اور نظم دونوں میں ایک ہی فن تلاش نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ نظم کہنے والا غزل گو شاعر سے کسی طرح کم درجے کا شاعر نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ اپنے جدید ذہن اور نئے ادبی شعور کی وجہ سے بہتر، جامع اور ترقی یافتہ صنف کا علمبردار ہے۔ غزل کے ذریعہ سے ہم موجودہ نسلوں کی ذہنی عکاسی تو کر سکتے ہیں مگر ان کی قیادت نہیں کر سکتے۔ نظم اس ذہنی قیادت کے لیے موزوں ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری، چوتھی پانچویں دہائی میں غزل کے میدان میں فانؔی، اصغؔر، جگؔر، یگانؔہ، حسرؔت، فراقؔ جیسے جید شعرا کے ہوتے ہوئے اردو شاعری کی قیادت اقبالؔ، جوشؔ اور فیضؔ کے ہاتھوں میں آئی۔ اس کا مطلب ان غزل گو شعرا کی قدر کم کرنا نہیں بلکہ ظاہر کرنا ہے کہ جس دور میں یہ سب سانس لے رہے تھے وہ تصادمات کا دور تھا، افکار و نظریات کا دور تھا، سنگھرش اور جدو جہد کا دور تھا جو نظم کے لیے موزوں تھا۔ اس لیے کہ غزل میں ٹھہراؤ ہوتا ہے، غمنا کی ہوتی ہے اور نظم کا مزاج اس کے برعکس ہوتا ہے۔ تسلسل بیان اور ارتباط فکر اس کے اصل جوہر تو ہوتے ہی ہیں۔ زندگی کے پیچیدہ مسائل کے حل کی تلاش، نشاط زیست کی جستجو اسے ایک نئے جمالیاتی شعور سے آشنا کرتی ہے۔ جوشؔ چونکہ امید و نشاط، حوصلوں و امنگوں کے شاعر ہیں اسی لیے ان کی شاعری بقول اکرام بریلوی ماضی کی یاد اور ماتمی کے بجائے زندگی سے سرفروشانا پیکار سے عبارت ہے۔ اسی لیے ان کی غزل گویوں سے بنتی نہ تھی اور وہ جگر کے اس فلسفہ کی سخت مخالفت کرتے تھے:

دل گیا رونق حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

جوشؔ کی شاعری کے بارے میں دو باتیں اور سمجھنے کی ہیں:

پہلی یہ کہ بڑی شاعری کو کسی ایک نقطہ پر رکھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ انیسؔ، غالبؔ، اقبالؔ کے ساتھ ساتھ جوشؔ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ کثیر الجہت اور متنوع شاعری کی ایک خوبی یا خرابی یہ ہوتی ہے کہ قاری اپنے خیالات کو مجتمع نہیں کر پاتا۔ ایک بات اور کہ بڑا شاعر جس وحدت افکار کے ساتھ شاعری کرتا ہے، اس کی شاعری سامعین وقارئین کا بھی امتحان لیتی ہے اور جب ہم اس میں ناکام ہوتے ہیں تو فروعی بحث میں الجھ جاتے ہیں۔

جوشؔ نے روایتی طور پر غزلیں کہیں، نظمیں کہیں جو اعتراض کی زد میں آسکتی ہیں لیکن اصل جوشؔ تو وہاں سے نظر آنے لگتے ہیں جب ان کی شاعری کا مرکز ومحور انسان ہو جاتا ہے اور یہیں سے ان کی جمالیات کا رنگ بدلنے لگتا ہے اور یہی وہ موڑ ہے جو بقول اکرام بریلوی:

> ''یہ ان کی شاعری کا وہ موڑ ہے جہاں سے ان کی شاعری تجسیمی جمالیات کے بجائے غیر تجسیمی جمالیات کی نادرہ کاریوں میں ڈھل گئی۔''

اور یہی وہ راستہ ہے جو تمام طرح کی جمالیات کے ماورائی تصور سے آگے بڑھ کر انسان کو حقیقی جمالیات سے آشنا کراتا ہے اور یہیں سے بڑی شاعری کے انکھوے پھوٹنے لگتے ہیں۔ ادب کا یہ نظریہ، انسانی عظمت کا یہ ایقان اور آدمیت کا یہ احترام شاعر کو انسانی و کائناتی معاشرہ سے وابستہ کر دیتا ہے، جہاں شاعر زمان ومکاں کی حدیں توڑ کر عالم امکان میں جگہ بنا لیتا ہے۔

مراثیِ جوشؔ اور تحفظِ حقوقِ انسانی

جوشؔ ملیح آبادی نے ڈاکٹر ہلال نقوی کو انٹریو دیتے ہوئے ایک بہت اہم بات کہی تھی جو اُن کی مرثیہ نگاری کی محرک تھی۔ جوشؔ کا بیان ملاحظہ ہو:

''ایک دن ایک بہت بڑے انگریز افسر مسٹر Burn نے جو بہت بڑے عہدے پر فائز تھا اور عربی اور فارسی بھی جانتا تھا، مجھ سے کہا کہ جوشؔ صاحب آج محرم کی ساتویں تاریخ ہے۔ میں نے کہا، جی ہاں — کہنے لگا — آپ محرم سے واقف ہیں؟ میں نے اس سے کہا کہ صاحب آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟ کہنے لگا، ہاں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے حسینؓ کی شہادت سے کیا فائدہ اٹھایا، آپ صرف آنسو بہاتے ہیں۔ جوشؔ صاحب اگر صرف مٹھی بھر مسلمان حسینؓ کی سیرت (Sprit) کو سمجھ لیں تو برٹش امپائر (British Empire) تین مہینے میں ختم ہو جائے، یہی وجہ تھی کہ میں ایک نئے جذبے کے ساتھ 'مرثیے' کے میدان میں آیا'' [1]

جوشؔ مرثیہ گوئی کا مقصد صرف رونا رُلانا نہیں قرار دیتے بلکہ ذہنوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مرثیہ نگار کا فرض ہے کہ باطل سے ٹکرانے کی حرارت و جرأت، جابر سلطانوں کے سامنے حرفِ حق کہنے کا حوصلہ اور تاسی حضرت امام حسینؑ کا جذبہ پیدا رکھنے کا شعور بیدار کرے۔

حالاں کہ جوشؔ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں گریہ و بکا پر ختم ہونے والے مرثیے محبانِ اہلِ بیت رسولؐ کے لیے ایک سیاسی حربہ تھے۔ بنی اُمیہ کے ہاتھ میں طاقت آ گئی تھی اور عاشقانِ آلِ محمدؐ کے پاس کچھ نہیں رہا تھا چنانچہ انھوں نے آنسوؤں سے بنی اُمیہ کے تخت و تاج کو بہادیا۔[۲]

جوشؔ جدید مرثیہ نگاری کے سرخیل ہیں۔ ان کے پیشِ نظر جدید مرثیہ اُسے کہتے ہیں اور کہیں گے جو تاسیِ حسین ابن علیؑ پر اُبھارے اور وہ مراثی جو اس روح کو پیش کرنے سے قاصر ہیں لاکھ عہدِ حاضر سے متعلق ہوں، جدید نہیں کہلائیں گے۔[۳]

جوشؔ نے کل نو مرثیے لکھے ہیں جسے ان کے شاگرد ڈاکٹر ہلال نقوی نے شائع کر دیا ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

▸▸ آوازۂ حق	۱۹۱۸ء	۹۲ بند
▸▸ حسینؑ اور انقلاب	۱۹۴۱ء	۹۸ بند
▸▸ موجد و مفکر	۱۹۵۶ء	۱۱۶ بند
▸▸ وحدتِ انسانی	---	۷۶ بند
▸▸ طلوعِ فکر	۱۹۵۷ء	۱۱۰ بند
▸▸ عظمتِ انساں یا قلم	---	۸۸ بند
▸▸ آگ	۱۹۰۹ء	---
▸▸ زندگی اور موت آلِ محمد کی نظر میں	۱۹۶۵ء	۸۶ بند
▸▸ پانی	۱۹۷۱ء	۵۹ بند

درج بالا مراثی کو ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے بھی پاکستان سے بڑے اہتمام کے ساتھ جوشؔ کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کے ساتھ مع فرہنگ ۱۹۸۰ء میں شائع کر دیا ہے۔

جوشؔ نے صرف ایک مرثیہ اور پہلا مرثیہ ''آوازۂ حق'' قدیم انداز کا لکھا ہے، جس میں اجزائے ترکیبی بالترتیب برتے گئے ہیں، بقیہ تمام مراثی نئے شعور و افکار کا نتیجہ ہیں۔ یوں تو جوشؔ کی شاعری میں لیکن خصوصی طور پر مرثیہ نگاری میں عصری حسیت اور عوامی آگہی شعوری طور پر ملتی ہے۔ آفاقی مسائل اور بین الاقوامی موضوعات کو کربلا کے پس منظر میں فنی محسنات کے ساتھ پیش کرنے میں ید طولا رکھتے ہیں۔ دراصل جوشؔ کے مراثی اردو شاعری میں ایک بالکل نئی شاہراہ کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے مراثی نے اپنے اپنے زمان و مکان میں شعرا کے شعور و لاشعور کو تکان دی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جوشؔ کے ہنک دار لہجے کی صدائے بازگشت صرف دوسرے مرثیہ نگاروں میں ہی نہیں، بہت سے نظم نگاروں اور غزل گو شعرا کے یہاں بھی کبھی یہ گونج دھیمے اور کبھی بلند آہنگ میں ملتی ہے۔

آج جب کہ حقوقِ انسانی کے تحفظ (Human Right Commisson) کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر قائم کیے جارہے ہیں لیکن آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جوشؔ نے اذہانِ انسانی کو اس اہم ترین مسئلے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اقوام متحدہ، سلامتی کونسل دونوں دم توڑ چکی ہیں۔ لیگ آف نیشن پہلے ہی مرحوم ہو چکی ہے۔ ان حالات میں جوشؔ کے مراثی آج بھی تحفظ حقوقِ انسانی کے اہم منشور اور دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند بند:

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا، بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا
کہتا ہوں پھر کہ دل میں کدورت نہ چاہیے
وحدت کے سر پہ، ضربت کثرت نہ چاہیے

مطلق اکائی میں، غدویت نہ چاہیے
غیریت و شر و عصبیت نہ چاہیے
آفاق ایک جسم ہے، اور ایک ذات ہے
اے دوست، وہم غیر جہالت کی بات ہے

درج بالا دونوں بندوں میں قرآن مجید کی آیت لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم اور گیتا کی تعلیم کا خلاصہ نظر آتا ہے، گیتا میں بھی تمام انسانوں کو ایک خاندان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ उदार चरिता नाम वसुदेव कुटुमबुकम یعنی تمام روئے ارض پر بسنے والے انسان ایک ہی خاندان کے ہیں۔ انھیں علاحدہ علاحدہ خانوں میں تقسیم مت کرو۔ جوشؔ نے بھی مشرق ومغرب، شمال وجنوب، گورے اور کالے کے امتیازات اور تفریق کو غلط قرار دیا ہے اور وہ اس تفریق کو جہالت قرار دیتے ہیں۔

سرمایہ داری نے جس طرح سے انسانی سماج کا استحصال کر رکھا ہے وہ بالکل روشن ہے۔ نظام معاش کے سلسلے میں اگر سوال صرف سرمایہ داروں کے ختم کرنے تک کا ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ یہ نفرت کے جذبات اس گروہ کو ختم کر کے انسانیت کی کوئی مفید خدمت انجام دی جاسکتی ہوتی مگر اصل مسئلہ سرمایہ داروں کا ہے کیونکہ یہی بے قید سرمایہ داری انسان کو ظالم سرمایہ دار میں تبدیل کر دیتی ہے اور آدمی، آدمی سے ٹکرانے لگتا ہے اور پھر بغاوت کے طرفہ انداز سامنے آتے ہیں۔ جوشؔ نے اپنے مراثی میں اس سمت اشارہ کیا ہے:

ہو چکے ہیں غرق پھر شیرازہ بندی کے عروق
پھر رواں ہیں ذلتیں سوئے تنفر جوق جوق
پھر شریعت ہے، مساوات بشر کی بے وثوق
پھر خجل ہیں نوع انسانی کے بنیادی حقوق
پھر بغاوت کر رہا ہے زندگی سے آدمی
دیکھ پھر ٹکرا رہا ہے آدمی سے آدمی

ہونکتا پھرتا ہے پھر سرمایہ داری کا وقار

اٹھ چکا ہے پھر عوامی برتری کا اعتبار
پھر خزاں کی آستاں بوسی پہ نازاں ہے بہار
پھر خدا کا ذوقِ تخلیق بشر ہے شرمسار
پھر زبوں ہے نفسِ انسانی کی حالت یا حسینؓ
آ، کہ پھر دنیا کو ہے تیری ضرورت یا حسینؓ

(موجد و مفکر)

جوش کا سماجی اور سیاسی بیدار شعور اُن کے مرثیوں میں بھرپور توانائی اور رعنائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ آج کے اس دورِ جہل پرور پر بھی وہ تبصرہ کرتے ہیں اور بھرپور ضرب لگاتے ہیں۔ ہوش رُبا مہنگائی بھی اُن کے پیشِ نظر ہے اور عوام کی بے کسی و بے بسی کا المیہ بھی۔ فرماتے ہیں:

جُہّال کی زبان پہ ہوں لن ترانیاں
اشرار خود غرض کو ملیں حکمرانیاں
برسیں حقیقتوں کی زمیں پر کہانیاں
کھانے لگیں عوام کا گودا گرانیاں
سفلوں سے بھیک اہلِ سخا مانگنے لگیں
مرنے کی اہلِ علم دُعا مانگنے لگیں

یا

جہل پھر رکھے ہوئے ہے علم کے سر پر قدم
خاک میں پھر مل رہا ہے آدمیت کا بھرم
زندگی پر مارتے پھرتے ہیں ٹھونگیں پھر درم
کھل چکا ہے پھر دلِ انساں میں سونے کا علم
پھر دفِ زر بج رہا ہے، شور ہے اشرار کا
صف شکن یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا

(وحدتِ انسانی)

روئے ارض پر جب فتنہ وفساد پھیلایا جانے لگے، صحنِ انسانیت غبار آلود ہو جائے، معاشرہ شر و اشرار کی آماجگاہ بن جائے ـــــ اور جب حقوقِ انسانی ڈھائے جانے لگیں، اصول و آئینِ آدمیت توڑے جائیں اور ظلوم بوئے جانے لگیں اور جہول اُگائے جانے لگیں ـــــ اور پھر یہ منظر اس طرح کا ہو جائے، یعنی:

محلوں میں جلوہ ریز ہوں ارزالِ خیرہ سر
چالاک رہزنوں کو ملے منصبِ خضر
سفلوں کی ہو نشست سرِ تختِ سیم و زر
اقطابِ روزگار کے بستر ہوں خاک پر
اے اجل عوام کی جانوں کے واسطے
دنیا ہو صرف چند گھرانوں کے واسطے

جب یہ حالات ہو جائیں تو پھر ـــــ جوشؔ فرماتے ہیں:

اس وقت فرض ہے کہ برائے مفادِ عام
اک مردِ حق پناہ اُٹھے بہر انتظام
پہلے کرے زباں سے ہدایت کا اہتمام
مانے نہ پھر بھی کوئی تو لے کر خدا کا نام
پائے ہوس سے طاقتِ رفتار کھینچ لے
میدان میں نیام سے تلوار کھینچ لے

جوشؔ کے مراثی اردو مرثیے کی تاریخ کو ایک بالکل نئی شاہراہ سے متعارف کراتے ہیں۔ فکری عنصر کی شمولیت نے وسعتیں بخشی ہیں۔ جوشؔ نے پہلا مرثیہ ''آوازۂ حق'' ۱۹۱۸ء میں کہا تھا، اس وقت ہمارے ملک میں خلافت اور عدمِ تعاون کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں۔ جنگِ آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف جوشؔ نے اپنی شاعری سے کام لیا۔ واقعۂ کربلا کے علائم اور رموز سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا ـــــ آزادی کی جدوجہد سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے اس کارزارِ حیات کو ''تازہ کربلا'' سے موسوم کیا ہے اور ''عزمِ حسینؑ'' کے طلبگار بنے رہے۔ اسی لیے اُن کے مراثی جذبات کی گہرائی

کے ساتھ ساتھ عملی اور نظری وسعتوں کے بھی حامل نظر آتے ہیں، وہ اپنے مراثی سے معاشرے کی اصلاح کا کام بھی لینا چاہتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مراثیِ جوشؔ ہر دور کے تقاضوں کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ اپنے قارئین میں جوش، ولولہ، شجاعت، ہمت، استقلال وایثار کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

جوشؔ قوم پرستی (Nationalism) کا جذبہ بھی انسانی حقوق کے لیے مضر قرار دیتے ہیں۔ یہ جذبہ دراصل عالمگیر تباہی کا پیش خیمہ بن گیا ہے۔ دراصل یہ جذبہ جس قوم (Nation) کے ذہن کو متاثر کر دیتا ہے وہ جذبہ اپنے قوم کے لیے خواہ سودمند ہو یا نہ ہو، لیکن دوسری قوموں کے لیے تو یقیناً تباہ کن بن جاتا ہے۔ عصبیت جب حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو ہلاکت بار ہو جاتی ہے، جو قوم پرستی کی وجہ سے افراد میں پیدا ہو جاتی ہے۔ قومیت (Nationalism) اپنی جگہ پر بالکل فطری چیز ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر جب کوئی شخص یا کوئی قوم یہ اعلان کرنے لگے کہ میری قوم کے مفادات کے سامنے دنیا کی تمام قوموں کے مفادات یا میری قوم کے جذبات کے علاوہ دوسری قوموں کے جذبات کی کوئی حیثیت نہیں ہے تو یہیں سے انتشار اور خلفشار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ جذبۂ قوم پرستی ایسی بُری بلا ہے کہ جب یہ کسی قوم کے افراد کے سر پر سوار ہو جاتا ہے تو وہ قوم اپنی برتری کے لیے ہر جائز و ناجائز کی تمیز ختم کر دیتی ہے۔ جیسا کہ ایک سرمایہ دار ملک اس بُرے عمل کو انجام دینے میں سب سے زیادہ پیش پیش ہے اور اب تو اس کا صدر مہنگائی اور بھک مری کے لیے ہندوستان کو ذمہ دار ٹھہرانے میں چوک نہیں رہا ہے۔ یہ اسی قوم پرستی کے جذبے کا ہی بدترین نتیجہ ہے۔ جوشؔ نے اس پہلو پر گہرے تفکر سے کام لیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

یوں بہا کر رکھ دیے، آہوں نے دولت کے دیے
آنسوؤں میں بہہ گئے طبل و علم کے دبدبے
بیڑیوں کی گونج سے ایوان تھرانے لگے
ایک بی بی کی خطابت نے وہ ڈالے زلزلے

اشکِ خوں روشن ہوئے نظروں سے تارے گر گئے

خاک پر قصرِ حکومت کے منارے گر گئے

مختلف انداز سے جوشؔ نے عصرِ حاضر کے ظالموں سے نبرد آزما ہونے کے لیے للکارا ہے۔ یہ للکار "اُسوۂ حسینؑ" کی روشنی میں صلابتِ فکر کو مہمیز کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

زندگی شعلۂ جوالہ ہے گلزار نہیں
موت کا گھاٹ ہے یہ مصر کا بازار نہیں
اپنے آقا کی تاسّی پہ جو تیار نہیں
زندہ رہنے کا وہ انسان سزاوار نہیں
جو حسینیؑ بھی ہے اور موت سے بھی ڈرتا ہے
ہاں! وہ توہینِ حسینؑ ابن علیؑ کرتا ہے

علمائے سوء سے بھی سوال کرتے ہوئے جوشؔ پُر وقار نظر آتے ہیں اور انھیں متنبہ کرتے ہیں:

میں یہ پوچھوں جو خفا ہوں نہ رفیقانِ کرام
کہ لرزتے تو نہیں آپ حضورِ حکام
آپ سرکار میں جھکتے تو نہیں بہر سلام
آنکھ شاہوں سے ملاتے نہیں بہ اندازِ امام
رائے بکتی تو نہیں آپ کی بازاروں میں
آپ کا رنگ تو اُڑتا نہیں درباروں میں

جوشؔ "کربلا" کو مستقل انقلاب کی علامت قرار دیتے ہیں:

کربلا ایک تزلزل ہے محیطِ دوراں
کربلا خرمنِ سرمایہ پہ ہے برق تپاں
کربلا طبل پہ ہے ضربتِ آوازِ اذاں
کربلا جرأتِ انکار ہے پیشِ سلطاں
فکرِ حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی

جب تک اس خاک پہ باقی ہے وجودِ اشرار
دوشِ انساں پر ہے جب تک حشم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرمِ پیکار
کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار
کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

صلح کل، عالمی برادری، امن و آشتی، سماجی مساوات اور رواداری کا پیغام مراثی جوشؔ کی بنیادی خصوصیت ہیں۔ انسانی تہذیب وتمدن اور اس کی زندگی کی بقا کے لیے بھرپور سعی نظر آتی ہے:

اے دوست سعیِ امن سے ہو شاد و بامراد
انسان کے دماغ کا سرطان ہے عناد
روحِ بشر کی موت ہے خونخواری و فساد
اپنے غضب سے جنگ ہے، سب سے بڑا جہاد
لاکھوں میں بے نظیر، کروڑوں میں فرد ہے
جو مسکرائے طیش میں بے شک وہ مَرد ہے

جوشؔ نے سعیِ امن سے شاد و بامراد ہونے کی بات تو ضرور کہی ہے، لیکن جب تہذیب وتمدنِ انسانی مجروح و پامال ہونے لگے تو شمشیر بکف ہونے کے لیے بھی آمادہ کرتے ہیں:

پھر تمدن کی طرف پھنکارتا ہے ایک ناگ
جل رہا ہے پھر عروسِ زندگانی کا سہاگ
کانپتی راتیں صدائیں دے رہی ہیں آگ آگ
جاگ اے ابن علیؑ کے نوحہ خوانِ خفتہ جاگ
اُٹھ بھڑکتی آگ کو پانی بنانے کے لیے
کربلا آئی ہے بالیں پر جگانے کے لیے

عامۃ الناس اور دشمنوں کے لیے بھی جوشؔ عام انسانی اخلاقی قدروں کی پاسداری، تحفظ آدمیت کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں اور سیرت مولا کے متقیان کی روشنی میں تمام عالمِ انسانیت کو متوجہ کرتے ہیں:

قاتل بھی ہو رہا اگر پیاس سے نڈھال
پانی اُسے پلا کہ یہی ہے رہِ کمال
دشمن بھی گر رہا ہو تو ہاں دوڑ کر سنبھال
تھوکے بھی کوئی منہ پہ تو ماتھے پہ بل نہ ڈال
دل کی سپر پہ غیظ کا ہر وار روک لے
تارِ نگاہِ لطف پہ تلوار روک لے

جھکتا ہے فتنہ عفو و ترحم کے سامنے
گھٹتا ہے طعنہ حسنِ تکلم کے سامنے
تھمتا ہے شورِ جنگ ترنم کے سامنے
تلوار کانپتی ہے تبسم کے سامنے
بدلے کی رسم دینِ وفا میں حرام ہے
احسان اک شریف ترین انتقام ہے

جوشؔ عداوت کے شدید ماحول میں بھی معیارِ شرافت کے نقیب ہیں:

ہمدم ہو یا حریف کسی کو سمجھ نہ غیر
ہر آن جوئے مرحمت و آشتی میں پیر
لیکن یہ امر اے دلِ حق بین و عرش سیر
شخصی معاملات کی حد تک ہے امرِ خیر
نوعی معاملات کا انداز اور ہے
اس انجمن کے ساز کی آواز اور ہے

انفرادی اور شخصی معاملات میں عفو و کرم، چشم پوشی وغیرہ تو جائز ہے لیکن جہاں عالمِ انسانیت

اور دنیا کے آدمیت، فتنہ وفساد کی زد پر آ جائے اس وقت مہر ومحبت کی خو، جوشؔ گناہ قرار دیتے ہیں اور اس وقت پائے ہوس سے طاقتِ اعتبار کھینچنے اور میدان میں نیام سے تلوار کھینچ لینے کی ترغیب دیتے ہیں اور جوشؔ میرِ کربلا کو آواز دیتے ہیں:

ہاں جوشؔ اب پکار کہ اے میرِ کربلا
اس بیسویں صدی کی طرف بھی نظر اٹھا
ہاں دیکھ یہ خروش یہ ہلچل یہ زلزلہ
اب سینکڑوں یزید ہیں کل اک یزید تھا

طاقت ہی حق ہے شور ہے یہ گاؤں گاؤں میں
زنجیر پڑ رہی ہے پھر انسان کے پاؤں میں

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آج کے اس صنعتی اور تمدنی دور میں فتنہ وفساد کی جتنی بھی صورتیں ممکن ہوسکتی ہیں، انسانیت پر پوری طرح مسلط ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین اور مدبرین اس تباہیٔ عالم سے کافی پریشان اور متفکر ہیں۔ اخبارات ورسائل اور موقر جرائد میں ان کے بیانات سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح اس عالمگیر و ہمہ گیر بحران وفساد کے حل کے متلاشی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کہیں سے مذہب کا واسطہ دیا جاتا ہے، کہیں سے انسانیت کے نام پر بھائی چارے کی دعوت دی جاتی ہے۔ کوئی معاشی نظام کی طرف بلاتا ہے، کوئی انتہائی سنجیدگی سے "ایک حکومت" کا نعرہ لگاتا ہے، کوئی معاشی عدمِ توازن کو سببِ فساد قرار دے کر کمیونزم کو حل کے طور پر پیش کرتا ہے اور کوئی سرمایہ دارانہ جمہوریت کو تریاق قرار دیتا ہے ــــ لیکن تاریخ عالم گواہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی موجودہ مسائل کا حل نہیں ہے، اس لیے کہ دنیا کی قیادت جس کے ہاتھوں میں ہے، جو امن کے ذمہ دار بنے بیٹھے ہیں ان کے دماغ ودل ماؤف اور فکر وعقل معطل ہیں۔ اور خود ساختہ ضامنِ امنِ عالم خود فساد کا سبب ہیں۔ ایسے عالم میں جوشؔ کے مراثی ہماری رہنمائی کرتے ہیں جو ایک ایسے رہبرِ حق کی نشاندہی کرتے ہیں جو مذہب وملت، مشرق ومغرب اور سنین وشہود سے بلند و برتر ہوکر

پیغامِ امن اور مژدۂ انسانیت دے رہا ہے:

زد پہ ہے وہ جرس کی کہ ٹھکانے نہیں ہیں ہوش
بھٹکے ہوئے انا پہ معلّق ہیں چشم و گوش
پھر آدمی ہے صُلح نما و جدل فروش
سینے خزف بدست، زبانیں گہر بدوش
آ، اور زلفِ لیلیٰ ہستی سنوار دے
ڈوبی ہوئی ہیں وقت کی نبضیں ابھار دے[1]

یا

پھر حیاتِ نوعِ انسانی ہے کجلائی ہوئی
گل پڑے ہیں ولولے، جرأت ہے مرجھائی ہوئی
پھر زمین و آسمان پر موت ہے چھائی ہوئی
موت بھی کیسی خود اپنے ہاتھ کی لائی ہوئی
چہرۂ امید کو رخشندگی دے، یا حسینؑ
زندگی دے، زندگی دے، زندگی دے یا حسینؑ[2]

حواشی:

1. جدید مرثیے کے تین معمار، ہلال نقوی، ص ۱۲۔
2. ایضاً، ص ۲۳۔
3. ایضاً، ص ۳۲۔

سلیمان اطہر جاوید

جوشؔ اور حیدرآباد

۱۹۲۲ء کے آس پاس کا زمانہ ـــــ تحریک عدمِ تعاون، خلافت کی تحریک، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام، آزادی کی تیز اور شدید ہوتی ہوئی جدوجہد، عوام کا ایثار اور اُن کی قربانیاں ـــــ اور پھر دوسری طرف پہلی جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں، معاشرتی انتشار، سیاسی خلفشار، معاشی ابتری، کساد بازاری، استحصال۔ غرض ایک بکھراؤ کی سی کیفیت۔ برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیاں، مکر وفریب، وعدے اور پھر وعدوں سے انحراف ـــــ ایسے میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے تن من دھن سے خود کو ملک وقوم کے لیے وقف کر دیا اور وہ بھی جو اِن مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوٹ مار کو بڑھاوا دیتے رہے۔ ضمیر فروشی کی اور عوام کے مفادات اور قومی تقاضوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنی جھولیاں بھرنی شروع کیں اور ان کا نشانہ ـــــ ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے کے مصداق ہر کہہ ومہہ اس معاشرتی اختلال اور معاشی بدنظمی کا شکار ہوا اور جوشؔ بھی۔

جوشؔ صاحب حیثیت، مالدار اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے آباو

اجداد کبھی کیسے رہے ہوں لیکن زمانے کے نشیب و فراز اور خوب و خراب سے ان کا بھی متاثر ہونا لازمی تھا، وہ متاثر بھی ہوئے ــــ اس بدلتے منظر نامے کے باعث جوشؔ کو خیال آیا کہ ان کی جائیداد کی نگرانی کرنے والے بتدریج ان کی جائیداد کو ختم کرتے جارہے ہیں، اگر یہی صورتِ حال رہی تو اُن کے پاس نہ جائیداد رہے گی اور نہ دولت۔ ایسے میں انھیں ملازمت کی سوجھی۔ جوشؔ کسی ملازمت کے لیے کس حد تک اہل ثابت ہو سکتے تھے یہ بات اپنی جگہ، لیکن انھوں نے ملازمت کے لیے تگ و دو شروع کردی اور اُن کی نظر پڑی حیدرآباد پر۔ یہ زمانہ حیدرآباد میں اردو ادب کا عہدِ زرّیں تھا۔ بادشاہِ وقت خود بھی شاعر تھے، شعر و ادب کے دلدادہ اور مشاعروں اور ادیبوں کے سرپرست اور مربّی۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آچکا تھا، دارالترجمہ کا کام تیزی سے جاری تھا۔ اردو زبان، ادب اور تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے ریاستی خزانے کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے اہلِ علم اور اہلِ قلم کی بڑی تعداد کشاں کشاں حیدرآباد کا رخ کررہی تھی، جوشؔ نے بھی حیدرآباد کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں جوشؔ اپنا ایک خواب بیان کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں:

> ''خواب دیکھا کہ ایک تابناک چہرے کے مردِ بزرگ میرے سامنے کھڑے ہوئے اور چاند اُن کا طواف کررہا ہے۔ میں نے اُن کی طرف نگاہ اٹھائی، آنکھوں میں خیرگی آئی۔ بار بار میں نے آنکھیں ملیں، غور سے ان کو دیکھا۔ پل بھر میں حافظہ جگمگا اٹھا۔ میں پہچان کر اُن کے قدموں پر گر گیا اور منہ ملنے لگا اُن کے نعلین پر۔ انھوں نے ہاتھوں کا سہارا دے کر مجھے اٹھالیا۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا: 'کیا آپ وہی میرے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جنھوں نے اپنا دیدار لڑکپن میں مجھے دکھایا تھا' یہ سن کر وہ مسکرائے اور ارشاد فرمایا، ہاں میں وہی تمھارے پہلے خواب کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔ یہ سنتے ہی میں اُن کے قدموں پر گر کر اور اُن کے نعلین سے منہ رگڑ رگڑ کر رونے لگا۔

میرے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، اُٹھ کھڑے ہو، میں ہاتھ باندھ کر اُن کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے کہا، تم ہنسنے کے لیے بنے ہو روتے کیوں ہو؟ اور یہ کہتے ہی میرے پائنتی کی جانب اشارہ کر کے حکم دیا کہ تم اس شخص کے پاس چلے جاؤ۔ میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو یہ دیکھا کہ ایک بادشاہ سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ 'اے میرے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ کون ہے؟' انھوں نے ارشاد فرمایا یہ نظام دکن ہے۔ تم کو دس برس تک اس کے زیر سایہ رہنا ہے''۔[1]

بعض لوگوں نے جو بھی مشورے دیے ہوں جوشؔ نے دل میں ٹھان لی۔ اس دوران جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر وحید الدین صاحب سے خط و کتابت کی اور مہاراجا سر کشن پرشاد کے موسومہ علامہ اقبال، مولانا عبدالماجد دریابادی، اکبرالہ آبادی اور مولانا سلیمان ندوی کے سفارشی خطوط لے کر ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حیدر آباد پہنچ گئے۔ اس وقت جوشؔ کی عمر 28 سال تھی اور اُن کی صرف ایک کتاب شائع ہوئی تھی 'روحِ ادب'۔

جوشؔ حیدر آباد میں سب سے پہلے مہاراجا کشن پرشاد سے ملتے ہیں۔ مہاراجا ان دنوں نظام کے معتوب تھے۔ وہ ازراہِ مصلحت منظر پر نہیں آئے بلکہ انھوں نے اکبر حیدری کے نام خط لکھا۔ مہدی یار جنگ نے بھی اپنے والد عماد الملک سے ملایا اور سر امین جنگ کے نام اُن سے خط حاصل کیا۔ تب کہیں نظام کے دربار میں حاضری ہوئی۔ نظام دکن نے جوشؔ کی ہمت افزائی کی اور فرمایا کہ عماد الملک نے بھی لکھا ہے کہ نوجوان ہونے کے باوجود تمھاری شاعری میں اساتذہ کی سی پختگی پائی جاتی ہے۔ جوشؔ نے اس موقعے پر اپنا کلام پیش کیا۔ مطلع پڑھا:

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

جوشؔ لکھتے ہیں: ''مطلع سنتے ہی نظام کے چہرے پر پسندیدگی کا رنگ دوڑ گیا۔ زیر لب 'واہ' کہا

اور بعد کے اشعار پر 'بہت اچھا، بہت اچھا'۔'' اس غزل کا ایک اور شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا تمام زورِ شباب تیرا

جوشؔ جب حیدرآباد آئے تو ابتداً اُن کے تعلق سے یہ افواہیں گرم تھیں کہ وہ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر بنادیے جائیں گے لیکن یہاں پہلے ہی سے دو اسسٹنٹ پروفیسر سیّد سجاد اور مولوی وحیدالدین سلیم موجود تھے۔ جوشؔ کی پروفیسری کی بات آگے نہیں بڑھ پائی۔ بعد ازاں یونیورسٹی کالج کی پرنسپل شپ کے لیے جوشؔ کا نام لیا جاتا رہا۔ قبل ازیں سرسیّد کے پوتے سرراس مسعود (راس مسعود جنگ) یونیورسٹی کالج کے نگراں پرنسپل رہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا تقرر ہوا، وہ بھی ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہوکر چلے گئے، لیکن جوشؔ کے حصے میں یہ منصب بھی نہیں آیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالترجمہ نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اس کے مترجم کے لیے تجویز ہوئی کہ حیدرآباد کے ایک بہت ہی لائق پارسی مسٹر کیقباد کو مترجم بنایا جائے۔ تحریک حضورِ نظام کے ملاحظہ کے لیے پہنچی۔ حضور نظام نے غالباً یہ خیال کرتے ہوئے کہ انگریزی داں پارسی آدمی ہیں انھیں اردو فارسی سے کیا نسبت۔ چناں چہ نظام نے کیقباد کی اس تحریک پر کچھ اس قسم کا حکم تحریر کیا کہ ''دارالترجمہ کے لیے اس پارسی کا نام کیوں پیش ہوا ہے جب کہ شبیر حسن خاں جوشؔ جیسا لائق آدمی موجود ہے''۔

حضور نظام کے الفاظ خواہ کچھ ہوں ان کا جوشؔ کی تائید میں لکھ دینا ہی جوشؔ کے تقرر کے لیے کافی تھا۔ اور کیا چاہیے تھا جوشؔ دارالترجمہ میں فوراً مترجم بنادیے گئے۔ دارالترجمہ کے ناظم اس وقت عنایت اللہ دہلوی تھے۔ جوشؔ کو فرمانِ شاہی کے مطابق پہلے پولیٹیکل اکانومی کے مترجم کی حیثیت سے مامور کیا گیا۔ جوشؔ کا اس موضوع سے چوں کہ کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے انھیں بعد میں انگریزی ادب کے ترجمے کا کام سونپا گیا۔ علامہ سیّد علی حیدر نظم طباطبائی اُن دنوں دارالترجمہ سے وابستہ تھے۔ انھوں نے جوشؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے مرہٹوں سے آصف جاہ کے ایک معرکہ کے حالات منظوم کرنے کی

فرمائش کی۔ جوشؔ نے اس کو نہایت عمدگی کے ساتھ منظوم کیا جس پر طباطبائی نے خوش ہوکر جوشؔ کے بارے میں اچھی رائے لکھ بھیجی۔ تھوڑی ہی مدت گزری ہوگی کہ علی حیدر نظم طباطبائی وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ اکبر یار جنگ کی مساعی کی بدولت جوشؔ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ناظر ادبی بنادیے گئے جس کی تنخواہ ۵۰۰ روپے تھی۔

اس دور کے دارالترجمے کے بارے میں جوشؔ لکھتے ہیں: ''یہ مقام دفتر کم اور دارالتفریح زیادہ تھا''۔ لیکن جوشؔ نے دارالترجمہ کے ماحول سے علمی، ادبی اور تہذیبی سطحوں پر بہت زیادہ استفادہ کیا۔ جوشؔ نے نہایت کھلے دل کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے:

> ''شعبۂ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی، علامہ طباطبائی اور مرزا محمد ہادی رسوؔا کے فیضانِ صحبت نے مجھ بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کرکے مجھ کو ذوقِ مطالعہ پر مامور کردیا اور صحتِ الفاظ ونجابتِ لہجہ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سرزمین پر اگایا تھا اگر طباطبائی، میرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بارآور نہ ہوتا''۔

ان کے علاوہ جوشؔ کو حیدرآباد میں جن ممتاز ادبی شخصیات کی رفاقت حاصل رہی ان میں منشی ذکاءاللہ دہلوی، سیّد ہاشمی فریدآبادی، شاہد احمد دہلوی، حیرت بدایونی اور ضیاءالدین احمد برنی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اور یہ بھی سماعت فرمایئے اس دور کے حیدرآباد کے بارے میں جوشؔ ترقیم کرتے ہیں:

> ''ہائے کیوں کر بیان کروں اس وقت میرا حیدرآباد کیا چیز تھا۔ ارزانی اور اس پر دولت کی فروانی۔ ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔ امراء کے دروازوں پر صبح وشام نوبت بجا کرتی تھی۔ آئے دن جلسے، مجرے اور مشاعرے ہوتے''۔

اور وہ دور بھی آیا کہ حضور نظام کے شہزادوں اعظم جاہ اور معظم جاہ نے بھی جوشؔ کو یاد کرنا

شروع کر دیا اور جوشؔ اور فانی تقریباً ہر روز شہزادوں کے درباروں میں جاتے۔ شعری محفلیں جمتیں۔

حیدرآباد میں جوش کی اچھی گزری اور اچھی گزر جاتی لیکن درباری سازشیں، جوڑتوڑ، مخالفت۔ جوش پر الزامات عائد کیے گئے کہ جوشؔ دہریے اور لامذہب ہیں۔ معظم جاہ کے دربار میں بھی طرح طرح کی بے ہودگیوں کے قصے مشہور کر دیے گئے لیکن ان کی لامذہبیت اور معظم جاہ کے دربار میں بے ہودگیاں —— ان کو تو محض بہانہ بنایا گیا اور لوگ بھی اس نوع کی باتیں کرتے ہوں لیکن حقیقتِ حال کچھ اور تھی۔ جوشؔ نے 'ساقی' کے جوشؔ نمبر میں لکھا ہے:

> ''دکن سے میرے اخراج کی علت معظم جاہ کے دربار کی بے ہودگیاں نہیں تھیں بلکہ نظامِ دکن کے خلاف میری نظم 'غلط بخشی' تھی جس کو میں نے جاگیرداروں اور وزیروں کے ایک بڑے اجتماع میں سنایا تھا''۔

حیدرآباد میں جوشؔ کے مخالفین نے جن میں ہوشؔ بلگرامی قابلِ ذکر ہیں، اس نظم کو رائی کا پربت بنا دیا۔ محمد حبیب اللہ رشدی اور علامہ حیرت بدایونی نے بھی جوشؔ اور ہوشؔ بلگرامی کی چشمکِ باہمی کو جوشؔ کے ملک بدر ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔ ہوشؔ بلگرامی کو دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھوں نے نظامِ دکن کے کان بھرنے شروع کر دیے کہ اس نظم میں روئے سخن ان کی طرف ہے چنانچہ نظام اس سازش کا شکار ہو گئے۔ اس نظم کے یہ تین اشعار:

اُٹھی وہ گھٹا رنگ سامانیاں کر	گہر باریاں کر گل افشانیاں کر
مٹا داغِ ہوش اور مدہوش بن جا	اُٹھا جام زر اور سلطانیاں کر
کبھی جوشؔ کے جوش کی مدح فرما	کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

ہوش یار جنگ نے تو حد کر دی کہ یہ نظم اشاعت کے لیے 'نگار' کو بھیج دی۔ وہ تو چاہتے تھے کہ نیازؔ فتح پوری کو اپنا بنا کر جوشؔ کے خلاف محاذ قائم کریں۔ وہ اپنی سازش میں کامیاب رہے، چنانچہ جلد ہی ایک تنبیہی فرمان جاری ہو گیا اور آخر کار اگست میں فرمان صادر ہوا کہ جوش پندرہ دن کے اندر ممالک محروسہ سرکارِ عالی کے حدود سے چلے جائیں۔ (مخالفین نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ جوشؔ کو بارہ گھنٹوں کے اندر حیدرآباد سے باہر چلے جانے کا حکم دیا گیا ہے)۔

ایسا لگتا ہے کہ جوشؔ سے بدظن ہونے کے باوجود نظام دکن جوشؔ کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ انھوں نے تیاریِ سفر کے لیے پندرہ دن کی مہلت دی اور موٹر کار کو ساتھ لے جانے کی اجازت بھی۔ پندرہ دن کی مہلت غالباً اس لیے دی گئی تھی کہ ممکن ہے جوشؔ نظام سے معافی مانگ لیں لیکن شاعر کی انا نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ معافی نہیں مانگی، ملک بدر ہونا گوارا کیا ـــ غرض جوشؔ ۲۸/اگست ۱۹۳۴ء کو بعمر ۳۸ سال حیدرآباد سے واپس ہوتے ہیں۔ جوشؔ کا مصرعہ ہے:

ع: شہر کا محبوب ہوں اور شاہ کا معتوب ہوں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ شاہ کے معتوب رہے ہوں، شہر کے محبوب رہے اور یہ شہر بھی جوشؔ کو محبوب رہا۔ حیدرآباد کے بارے میں اُن کے جذبات ملاحظہ ہوں:

> "حیدرآباد میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے کو دس برس تک اپنے سایے میں پروان چڑھایا۔ تو نے مجھ کو کبھی غیر ملکی نہیں سمجھا۔ تو نے مجھ کو کتب بینی کی دعوت دی۔ تو نے میری شاعری کو آب و رنگ بخشا۔ تو نے مجھے علم و فکر کا راستہ دکھایا۔ تو نے مجھے کاتبِ کاکُل اور کائنات کے مطالعے پر مامور فرمایا۔ کتاب نے میری آگاہی میں اضافہ کیا۔ کاکلوں کی چھاؤں نے مجھ کو جمالیاتی شاعری کا خزانہ بخشا۔ کائنات کے مسائل نے مجھ میں تفکر کا مادہ پیدا کیا۔ تفکر نے میرے علم میں اضافہ کیا۔ علم کے اضافہ نے مجھ پر یہ تلخ حقیقت عیاں کر دی کہ میں سراسر جاہل ہوں اور اس عرفانِ جہل نے مجھ کو وادیِ حیرت کی جانب موڑ دیا"۔

حیدرآباد میں جوشؔ نے ایک بھرپور اور لائق رشک زندگی گزاری۔ ان کا قیام طویل مدت تک نامپلی کے ایک مکان میں رہا۔ یہ مکان ایک باغ میں تھا جو آج بھی اندر جیت کا باغ کہلاتا ہے۔ جوشؔ ہر صبح چہل قدمی کے لیے نامپلی کے قریب واقع باغِ عام آیا کرتے تھے، شام میں ان کی محفلیں جوشؔ کے خانہ باغ یا ویکاجی ہوٹل کے صحن میں دائیں بازو کی

جھاڑیوں میں جمتیں۔ یہ گوشہ ان لوگوں کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا۔ اسی زمانے میں فانیؔ بھی حیدرآباد آگئے، ابتدا حیدرآباد ریلوے اسٹیشن کے قریب صلح سرائے میں مقیم تھے بعد میں جوشؔ کے مکان کے قریب ناپلی آگئے۔

حیدرآباد میں جوشؔ کا تخلیقی سرمایہ قابلِ لحاظ اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ حیدرآباد میں اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں انھوں نے نظم 'پروگرام' لکھی جو حبیب اللہ رشدی کے الفاظ میں ''محض سخن گستری نہیں ہے بلکہ اس زمانے میں اُن کی روزمرہ زندگی کا ریکارڈ ہے''۔ اس کے علاوہ جوشؔ نے قیامِ حیدرآباد کے دوران جو نظمیں تخلیق کیں ان میں 'جشنِ نو'، 'خواب کی پرچھائیاں'، 'تیرے لیے'، 'آتے نہیں ہو تم'، 'احسان نہ کیجیے'، 'مستقبل کے غلام'، 'غدار سے خطاب'، 'دامِ فریب'، 'مقتلِ کانپور'، 'لمحہ آزادی'، 'کوہستانِ دکن کی عورت' اور 'جوانی کا تقاضا' کے علاوہ ان کے تیسرے مجموعۂ کلام کی بیشتر تخلیقات۔

۱۹۲۴ء میں ملیح آباد سے حیدرآباد آتے ہوئے جوشؔ نے نظم 'الوداع' لکھی تھی جس میں انھوں نے ملیح آباد سے اپنی وابستگی کو نہایت شدت اور والہانہ پیرایے میں پیش کیا ہے۔ جذبات کی شدت اور فراوانی کے زاویے سے یہ نظم اپنی مثال آپ ہے۔ بقول اقبال، جذبات کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا، جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات۔ اس نظم کے مطالعے کے بعد یہی کہا جاسکتا ہے۔ اس نظم کا آخری بند ہے:

اے امانی گنج کے میدان، اے جانِ وطن ۔۔۔ آ گلے مل لیں خدا حافظ گلستانِ وطن

السلام، اے صحبتِ رنگین، یارانِ وطن ۔۔۔ الوداع اے لالہ زار و سنبلستانِ وطن

حشر تک، ہنے نہ دینا تم دکن کی خاک میں

اپنے شاعر کو دفن کرنا وطن کی خاک میں

لیکن جب حیدرآباد پر پولس ایکشن (۱۹۴۸ء) کے چند سال بعد جوشؔ حیدرآباد آئے تو انھوں نے حیدرآباد کے تعلق سے ایک نظم لکھی، یہ نظم بھی جذبات و احساسات کی تیزی اور تاثیر میں اپنی مثال آپ ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

حیدرآباد، اے نگارِ گُل بداماں السلام

السلام، اے قصۂ ماضی کے عنواں السلام

تو نے کی تھی روشنی، میری اندھیری رات میں
مہر و مہ خوابیدہ ہیں اب بھی ترے ذرّات میں

میرے قصرِ زندگی پر اے دیارِ محترم
تو نے ہی کھولا تھا ذوقِ علم کا زریں علَم

تو نے ہی بندہ کو بخشی تھی کلید اسرار کی
تو نے ہی زلفیں سنواری تھیں مرے افکار کی

جوشؔ نے خواہ کسی پس منظر میں ہو ترکِ وطن کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ تا حشر دکن کی خاک میں نہ رہیں اُن کی یہ تمنا تو پوری ہوئی لیکن وہ وطن کی خاک میں دفن نہ ہو سکے۔ انھوں نے غریب الوطنی کی زندگی گزاری اور دکن اور وطن دونوں سے دور، بہت دور پاکستان میں ۲۳ر فروری ۱۹۸۲ء کو آخری سانس لی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔ رہے نام اللہ کا!

زبیر رضوی

جوش کا تخلیقی وفور

اپنے اس مضمون میں میری دلچسپی یہ ہے کہ میں یہ دیکھوں کہ جوش جنہیں اردو دنیا نے شاعر انقلاب کہا تھا وہ جب ۱۹۵۵ میں پاکستان ہجرت کر گئے تو پاکستان میں اپنے قیام کے ۲۷ برسوں میں انہوں نے اپنے انقلابی، باغیانہ اور کف در دہاں والے، اس شعری لہجے کو کیسی اور کتنی آب دی جو ان کے پہلے شعری مجموعے روحِ ادب (۱۹۲۰) سے ۱۹۵۴ تک شائع ہونے والے اُن کے چودہویں مجموعے 'سموم وصبا' میں حاوی طور پر جاری وساری رہا تھا۔ جوش نے پاکستان میں رہ کر جو کچھ بھی کہا تھا اسے اخبار جنگ نے 'محراب و مضراب' کے نام سے سات سو صفحات کے ایک ضخیم شعری مجموعے کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ 'محراب و مضراب' کو جوش کی پوتی تبسم اخلاق ملیح آبادی نے اپنے والد سجاد حیدر خروش کی سرپرستی میں مرتب کیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ فروری ۱۹۹۳ میں شائع ہوا اور اس کی پیشانی پر لکھا ہے ''غیر مطبوعہ مجموعہ کلام''۔

جوش آزادی کے بعد کے دنوں میں کوئی آٹھ برس ہندستان میں رہے اور ۱۹۵۵

میں وہ کراچی جا کر ایک مہاجر شاعر کے روپ میں آباد ہو گئے۔ جوشؔ نے انہی برسوں میں خود کو 'مرحوم' کہنا اور لکھنا شروع کر دیا تھا۔ محراب و مضراب کا آغاز اس رباعی سے ہوتا ہے

حیران و پریشان و تپاں ہوں اے جوش
اک عمر سے ہر سونگراں ہوں اے جوش
یہ مردہ بدستِ زندہ کی بات نہیں
میں زندہ بدستِ مردگاں ہوں اے جوش

اسی کیفیت کی کئی رباعیوں میں ایک رباعی ہے.

دل نقدِ حیات کھو رہا ہے اے جوش
بیڑا اپنا ڈبو رہا ہے اے جوش
ہونے ہی پہ ہے پاک حسابِ مہ و سال
کھاتہ اب بند ہو رہا ہے اے جوش

جوشؔ جس خوشحالی اور طرب آگیں ماحول کے سایے میں پلے تھے زندگی کی نعمتیں جس ادا فروشی کے ساتھ ان کے حسنِ طلب کے روبرو تبسم ریز رہی تھیں ماہ جبینوں اور توبہ شکن انگڑائیوں کے درمیان ان کے رُت جگوں نے جو سرشاریاں اور دلداریاں اپنا حصہ بنتے دیکھی تھیں ان سے محرومی کے احساس نے جوش کو زندگی بھر مضطرب اور افسردہ رکھا۔ پاکستان آ کر محرومی اور ناقدری کا احساس اور بھی بڑھ گیا۔ جوشؔ نے اپنی شاعرانہ عظمت اور آن بان اور کئی طرح کی شناخت اور پہچان کے ساتھ پاکستان میں قدم رکھا تھا۔ اپنی صدی کا حافظ و خیام پکارنے والے جوشؔ نے خود کو متضاد اوصاف کا حامل قرار دیتے ہوئے خود کو فاسق متقی، درویش صفت رند، باطل نواز خاور شکن، مے خوار زاہد، جھوٹی عادت کا سچا گواہ اور سرتا سر ایک مقدس گناہ، سیہ کار قدسی اور قدح خواہ پیر، کارواں سے تعلق بُریدہ اور کثرتِ ظہور سے نادیدہ اور شدتِ وجود سے ناآفریدہ والی پہچان اور شناخت کا حامل شاعر کہا تھا۔

جوشؔ متضاد انسانی رویوں طریقت اور سماجی علتوں کو قابل قبول سمجھنے والے ایک رواداراور سخی انسانی مشاعرے کے زندگی بھر آرزومند رہے جو ان کے پورے شاعرانہ وجود کو نہ صرف تسلیم کرے بلکہ اُس کی پذیرائی میں ہمہ وقت سجدہ ریز رہے۔ ہندستان میں انہیں بڑی حد تک ایک رواداراور روشن خیال ایسا معاشرہ میسر تھا جو ان کی شراب نوشی، شاہد بازی، عیش طلبی اور الحادی رویے کو ان کی شاعری کو پسند کرنے کی بناء پر نظر انداز کرتا رہا تھا۔ اردو معاشرے کی اس کشادہ ذہنی اور شاعر نوازی کا تمام تر سہرا دراصل غالب کو جاتا ہے جس نے اپنے حسب و نسب کے طمطراق کو داؤ پر لگاتے ہوئے اپنی شاعرانہ کمزوریوں کی بنا پر دوبار جیل جانے کو Killing Honour کا مسئلہ نہیں بننے دیا۔ اس کی ایک اور وجہ وہ معاشرتی رویہ بھی تھا جو حسب نسب دربار سے قربت اور منصب داریوں کو سماجی چھوٹ دینے میں وزن دیتا تھا اور کج کلاہی اور کج روی پر ملامت کے چابک برسانے سے گریز کرتا تھا۔

جوشؔ جیسے ایک بڑے شاعر کا جسے انقلابی اور باغی شاعر والی محبوب پہچان حاصل تھی ایک سیکولر اور جمہوری قدروں میں یقین رکھنے والے وطن کو چھوڑ کر آمریت اور اسلامی آئینِ سیاست اور ثقافت میں یقین رکھنے والے ملک کو اپنا دوسرا مسکن بنانے کا عمل دونوں ملکوں کے سوجھ بوجھ رکھنے والے طبقے کے لیے حیران کن مسئلہ بنا رہا تھا۔ اپنی ایک طویل نظم آفاتِ گوناگوں میں جوشؔ نے بڑی وضاحت سے وطن چھوڑ کر پاکستان جانے کا جواز دینے سے پہلے ناز و نعم میں پلے اپنے بچپن کا مرصع شعری اظہار اس طرح کیا ہے

مری شاموں کو مخمل میں لپیٹا
مری صبحوں کو اطلس سے منڈھایا
غروب مہر کی اقلیم بخشی
طلوع صبح کا سلطاں بنایا
مری سرکار میں بہ صد تحکم

غرورِ گل رخاں کا سر جھکایا
کبھی سارنگیوں کے زیر و بم سے
مری ہر رات کو جھولا جھلایا

اب اس نظم کی گریز بھی سنیے:

وطن نے جب بجھادی شمعِ اردو
تو میں کم بخت پاکستان آیا
وہاں اسلام کی تہمت تھی مجھ پر
یہاں الحاد کا بانی کہایا
گرو نے دھرم کا بدخواہ سمجھا
ولی نے دین کا دشمن بتایا
ادھر مندر میں سادھو الٗ آلا!
ادھر مسجد میں ملا غُرغُرایا
اُدھر جن سنگھیوں نے دھول اڑائی
اِدھر مودودیوں نے غل مچایا
اُدھر چٹیوں نے جھاڑو مجھ پہ تانی
اِدھر داڑھیوں نے پنجے اٹھایا
نہ پائی پہلوئے کاشی میں راحت
نہ قُربِ کعبہ مجھ کو راس آیا

جوشؔ کا خیال ہے کہ پاکستانی معاشرے میں اس ساری مزاحمت اور ناپذیرائی کے باوجود انہوں نے پاکستان کے اربابِ جہل کو رموزِ عقل سمجھانے کا منصب نہیں چھوڑا ربوبیت اور الوہیت کا علم گوش گزار کرنے کی کوشش کی، حیات و موت کا فلسفہ سمجھایا مگر

متاع زندگی صد حیف کھودی   قیامت ہے کہ پھر بھی کچھ نہ پایا

جوش کی وہ نظمیں جو انہوں نے پاکستانی معاشرے کی سرد مہری کو نشانہ بنا کر لکھی ہیں ان میں ظلم، وحشی ماحول، کیا ہوگا، مہیب سناٹا، کیا کروں، فرمانِ اجتناب اور ہچکیوں کا قہقہہ کو پڑھیے تو لگتا ہے کہ جوش پاکستان میں ناقدری پر بے حد نالاں ہیں یوں بھی جوش عنفوان شباب کے عرصہ رنگین سے نکلنے کے بعد کے زمانوں میں اپنی شاعری، دانشوری اور سماجی قدر و منزلت کے اظہار میں خاصے بلند بانگ رہے ہیں وہ خود کو فہم و فراست اور علم و آگہی کا ایک نشانِ امتیاز سمجھتے ہوئے کوتاہ قدروں میں اپنی بلند قامتی کا قصیدہ پڑھتے رہے ہیں۔

ممنوع ہے درآمدِ فکر و نظر جہاں   اُس ملکِ نارساں میں بسایا گیا ہوں میں

جوش کی پاکستانی زندگی کے ۲۷ برسوں میں پاکستان میں تین بار ۱۹۶۸، ۱۹۷۲ اور ۱۹۷۷ میں مارشل لاء لگایا گیا۔ مارشل لاء کے آمرانہ اور فسطائی فرمانوں پر کیا کروں، جیسی نظموں میں اس طرح کے ردِعمل ملتے ہیں۔

پُشتِ باطل پر ہے اَعیانِ سیاست کی سپاہ   کیا کروں اے آرزوئے حق پناہی کیا کروں

نظم ایک سرو ہزار کوہ سار میں جوش کا لہجہ اور ردِعمل زیادہ کاٹ دار ہے:

یہ دستِ جبر و وضع کے پاتھے ہوئے سلام   یہ شیشۂ فریب کے ترشے تکلفات
ٹھنڈی لگاوٹوں کی یہ ٹھٹری ضیافتیں   ٹوٹے معاہدوں کے یہ جھوٹے تعلقات
یہ جنگِ اقتدار کہ حاصل نہیں ہنوز   انسان کی گرفت سے انسان کو نجات
یہ معنوی ملال یہ لفظی کدورتیں   قومی یہ دارو گیر یہ نسلی مناقشات
رنگوں پہ یہ فساد عقیدوں پہ یہ جہاد   یہ دینوی قتال یہ دینی مجاہدات
کاندھوں پہ روز اُٹھتے جنازوں کے کارواں   کافور کی ہوا میں یہ لپٹے تاسفات

جوش ایسی نظموں میں اپنے اُس طرزِ گفتار اور اظہار کا سارا اثر اور قوت سمو دیتے ہیں جو ان کے شعری لہجے اور دکشن کا حسنِ اعتبار رہا ہے۔ جب ان کی آنکھ کی پتلیوں میں ماہ

وسال کے گرداب شور کرنے لگتے ہیں۔ صدیوں کا عرض وطول ان کی نگاہ میں سمٹ آتا ہے۔ حکمرانِ وقت جب عوام کے دکھ درد سے بے خبر ہوکر اپنی نوازشوں، عنایتوں اور محبتوں سے انہیں سرفراز کرتے ہیں جن کے حصّے میں صرف کانٹے آنے چاہئے تھے امیر وقت کی عنایتوں کے طفیل انہیں شب بسری کے لیے خیاروں کے سائبان میسر ہوتے ہیں تو جوش نوازشوں اور زندگی کی ضروری آسائشوں سے محروم کردیے گئے لوگوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے وہ احساس دلاتے ہیں زندگی پھولوں کے رنگوں ہی میں نہیں وہ کانٹوں میں ہی نمو پاتی ہے۔ زندگی خُم بلور ہی نہیں وہ رگِ سنگ میں بھی اپنا حسن دکھاتی ہے۔ زندگی نہ محض ایمان ہے اور نہ ہی کفر یہ قدرت کا دیا ہوا ایک زمزمہ جاں پرور ہے اگر تسخیر مہر و ماہ ہو بھی جائے تب بھی قدرت انسان کی بے پناہی کی آبیاری نہیں کرپاتی ہے اور جب زندگی انسان کی بسیط اور لامتناہی تسخیرات میں اس کی ہم قدم نہیں ہو پاتی تو پھر اندھی قبر انسان کی جائے پناہ بن جاتی ہے۔ سیدھے نشانے سادھنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اپنے اس لہجے کو خوب آب دیتے ہیں۔ جو بڑی حد تک نظیر کے لہجے کی یاد دلاتا ہے ان کی ایسی نظمیں ہر سطح پر دلچسپی سے پڑھی گئی۔ ایسی نظموں میں ان کی مقبول نظم ہچکیوں کا قہقہہ ہے۔

اب نہ دریا میں گل زار چنا جور گرم
کوئی مونس ہے نہ غم خوار چنا جور گرم
اب نہ مکھڑوں کے سمن زار،
اب نہ پازیب کی جھنکار
اب نہ وہ مصر کے بازار
زندگی اب ہے طرح دار
چنا جور گرم بابو میں لایا مجے دار چنا جور گرم
اب تو ہر سانس ہے ایک معرکہ بدر وحنین

شورِ طوفانِ عدوات ہے میانِ قطبین
مجھ پہ حملے کے لیے فوج عدو ہے بے چین
یوں کراچی میں ہوں جس نہج سے مقتل میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم

نظم ''نالۂ مہاجرت'' جوش کی سب سے افسردہ لہجے کی نظم ہے جس میں ہجرت پر اُن کا پچھتاوا اعتراف گناہ بن کر سامنے آتا ہے جن دوستوں نے اپنی وفاؤں کا اور حسنِ سلوک کا یقین دلایا تھا۔ وہی بیچ منجھدار میں ڈوبتا چھوڑ گئے یہ وہ موڑ ہے جب زندگی مجسم محرم کی داستان بن جاتی ہے۔ جوش اپنے اس احساس کو بار بار دہراتے ہیں کہ وہ جو انہوں نے الحاد اور انکار کی اور انسان پرستی اور آدمیت کو اپنا عقیدہ اور مسلک ماننے کی جو راہ اپنائی تھی اس کی بنا پر ہی انہیں ملا اور پنڈت دونوں کے نفرت اور عناد کے تیر و نشتر سہنے پڑے ہیں۔

وطن میں بستۂ ناقوسیاں تھا — یہاں آمردۂ اہلِ اذاں ہوں
مجسم نغمہ تھا اور اب خموشی — سراسر شعلہ تھا اور اب دھواں ہوں
وہ دن بھی تھے کہ میر کارواں تھا — یہ دن بھی ہیں کہ گردِ کارواں ہوں
اندھیرا الاماں اتنا اندھیرا — کدھر ہوں کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں؟

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ جوش کے پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کے برسوں میں تین بار شدید نوعیت کا مارشل لا نافذ کیا گیا ان مارشل لاؤں کے فرمان، اظہار خیال کی آزادی پر تلوار بن کر لٹکتے رہے تھے۔ شاعر اور افسانہ نگار جو ہمیشہ عوام دوست رہا ہے اور جس کی ارباب حکومت کے ساتھ معرکہ آرائی کی فضا تناتنی کی صورت میں زندہ رہی ہے اس نے شدید قید و بند میں بھی اظہار کی آزادی کو عزیز رکھا اور قلم کو ضمیر کے خلاف لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ پاکستان کے ادیبوں نے ان مارشل لاؤں کے خلاف خاص طور سے ۱۹۷۷ء والے ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف کافی کچھ لکھا۔ کیوں کہ اس مارشل لاء

کا کوئی سیاسی یا آئینی جواز ہی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ۱۹۷۳ء کے متفقہ طور پر منظور شدہ آئین کی خلاف ورزی تھی جسے پاکستانی عوام کی اکثریت کے ساتھ ساتھ وہاں کا تخلیقی ذہن بھی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا اس مارشل لا کے کوئی آٹھ ماہ بعد ہی اعجاز راہی نے مزاحمتی اور احتجاجی رنگ اور لہجے کی حامل نظموں اور افسانوں کا ایک مجموعہ، گواہی کے نام سے شائع کردیا۔ یہ مجموعہ پاکستان میں مزاحمتی ادب کی پہلی نیو کی اینٹ تھی۔ اس کی دوسری کڑی اس وقت سامنے آئی جب ضیاء الحق نے خود پاکستان اور دنیا کے انصاف پسندوں کی اپیل کو نظرانداز کر کے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیدی۔ عبداللہ ملک نے اس کے خلاف لکھا گیا احتجاجی ادب، احتساب کے دو شماروں میں جمع کر دیا تھا۔ یونس ادیب اور سلیم شاہد نے 'خوشبو کی شہادت' دو جلدوں میں اور ولی الرحمٰن ناصر نے 'نئی سحر کی چاپ' کے نام سے تسلسل سے لکھے جارہے احتجاجی ادب کا یہ مجموعہ شائع کردیا اسکے بعد کے برسوں میں جب پنجابی شاعر فخر زماں اکادمی ادبیات پاکستان کے سربراہ مقرر ہوئے تو اُن کے ایما پر مزاحمتی ادب کے عنوان سے ایک ضخیم مجموعہ رشید امجد نے ۱۹۹۵ میں مرتب کیا اور ایک طویل دیباچہ اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت پر لکھا۔ اسی شمارے میں مزاحمتی ادب کے عنوان سے ابرار احمد کی ایک بے حد اہم تحریر بھی شامل تھی جسے میں نے 'ذہن جدید' کے ایک خاص شمارے میں شائع کیا تھا۔ مارشل لاء کے خلاف ان سارے اشاعت پذیر مجموعوں میں رشید امجد والے مجموعہ میں جوش کی ایک غزل نما نظم ہی شامل تھی:

خداوند سفر دشوار رکھا جائے گا کب تک
مرے جادے کو ناہموار رکھا جائے گا کب تک
اِن اَبنائے جہالت حاکمانِ زِشت فطرت کو
مرا آقا مرا سردار رکھا جائے گا کب تک
مجھے ان جاہلان و سوقیان سفلہ پرور میں
خداوندا ذلیل و خوار رکھا جائے گا کب تک

مرے ہیجانِ زر افشانی و ذوق سخاوت کو
بغیر درہم و دینار رکھا جائے گا کب تک
ارے اِن کعبہ و کاشی کے دیوانوں کے نرغے میں
مجھے منجملہ انکار رکھا جائے گا کب تک

جوش مارشل لا اور آمریت کے خلاف مذکورہ غزل سے کہیں زیادہ طاقتور اور اثر آفریں لکھ چکے تھے نظم 'کیا ہوگا' ایوب خاں کے مارشل لا کے خلاف لکھی نظم ہے۔ جس میں جوش کا ابتدائی اجتہادی اور ظلم وستم کے آگے سینہ سپر ہو جانے کی تلقین کرنے والا لہجہ عود کر آیا ہے۔

غرورِ قلعہ شکن وقت کا تقاضا ہے
سجودِ بار گہِ خسرواں سے کیا ہوگا
سرِ یزید اُتارے بغیر اے یارو
فقط حسین پر آہ و فغاں سے کیا ہوگا
جو مرد ہو تو چنیں و چناں کو زیر کرو
اس احتجاجِ چنین و چناں سے کیا ہوگا
سنو سنو کہ یہ گردوں سے آ رہی ہے صدا
کہ ذوالفقار سے بولو زباں سے کیا ہوگا

میرے لیے یہ بات تعجب کی اور تشویش کا باعث بنی کہ جب جب پاکستان میں مزاحمت، احتجاج اور آمریت کے مسائل پر لکھا ادب کسی کتاب یا مجموعے کی صورت سامنے آیا تو اس میں جوش کے مشتہر اور ساختہ رباعی اور احتجاجی شاعر کے ذکر کو صرف کچھ سطریں ہی حوالے کے طور پر ملیں یہ تو صحیح ہے کہ جوش نے جس تسلسل اور تخلیقی طمطراق کے ساتھ اپنی رومان پرور شبابی اور نشاطی زندگی اور اس کے نور و نار سے بھرے شبستانوں پر بے حساب نشاطیہ ادب لکھا ہے اور جس کروفر اور شان کے ساتھ انہوں نے فیوڈل معاشرے کی آسایشوں، رونقوں نمود ونمائش اور جاہ و ثروت کو اپنے ماضی کا ناقابل فراموش باب

بنا دیا ہے وہ بدلتی ہوئی ادبی اقتدار کے دائرے میں سدا ہی داد کا سزاوار کب رہ پائے گا۔ پھر جوش بڑی حد تک اپنے معاشرے، ثقافتی اور ادبی ماحول کو اپنے تخلیقی اور سماجی منصب، مرتبے سے کم سمجھنے اور خود کو قابل فخر قرار دینے سے نہیں چوکتے۔ یہ رویہ غالب میں بھی تھا کیوں کہ اس وقت دربار اور منصب کے بغیر معاشرے میں آپ کی امتیازی پہچان ممکن نہ تھی مگر غالب اپنے زیادہ تر سماجی رویوں میں زمینی تھے وہ کرایے کے مکانوں میں رہے اور قرض اور ادھار پر ساری زندگی گذار دی۔ جوش بیسویں صدی کے شاعر تھے اور اپنے وطن کو غلامی سے آزاد ہوتے بھی دیکھ چکے تھے لیکن اپنے سماجی رویے میں فیوڈل معاشرے سے باہر نہ نکل سکے اور ایک ایسے سماج کے قیام کی تمنا کرتے ہوئے عمر گذار دی جس میں ان کے الحاد، شاہد بازی، حسن پرستی اور ان کی انا پسندی کو بلا روک ٹوک قبول کر لیا جاتا۔ اسی لیے وہ فرد کو ملا، پنڈت، کوتاہ قد، غیر مستحق کے خانوں میں بانٹتے رہتے تھے۔ اقبال کے برخلاف جوش نے اپنی شاعری کا کوئی ایک مرکزی دھارا کوئی ایک غالب رو بننے نہیں دی۔ جوش کے شعری ظرافت کی نمایاں خامی یہ بھی تھی کہ انہوں نے نفس مضمون سے کہیں زیادہ زبان اور آہنگ کے شکوہ اس کی آرایش و زیبائش، حرف و لفظ اور ہیئت اور اسلوب کے اپنے محبوب اظہار پر زیادہ زور دیا۔ اقبال کے برخلاف جوش سماجی اور فکری موضوعات کی حنابندی اور تختہ بندی ایسی نہیں کر سکے کہ ان کے فکر و خیال کے تانے بانوں کی گرہ کشائی میں لطف آتا۔ جوشؔ نے اگر ایک طرف شاعر کو معاشرے کا ایک اعلیٰ تخلیقی مظہر قرار دیا تو دوسری طرف اسے فریبی اور ناقابل اعتبار بھی کہہ دیا۔ شاید اسی لیے سبط حسن جیسے فکر و سوچ کے حامل شخص کو ''ذکر بہتے خون کا'' کے دیباچے میں لکھنا پڑا

> ''ایوب خاں کے عہد آمریت میں دو شخصیتوں نے قوم کی عصمت و آبرو بچائی تھی ایک جسٹس کیانی مرحوم اور دوسرے حبیب جالب نے''

رشید امجد ''مزاحمتی ادب'' والے دیباچے میں لکھتے ہیں

''بلاشبہ ہمارے عہد کے اہم ترین شاعروں میں سے ہیں اور ان
کی شاعری مزاحمت اور احتجاج کا نہایت کامیاب فنی اظہار ہے
وہ تاریخی عمل کے شعور کی بدولت حال کا تجزیہ مستقبل سے آگاہی
کی بنیاد پر کرتے ہیں۔''

اس طویل دیباچے میں جوشؔ کا ذکر غیر اہم شعر بھی جگہ نہ پا سکا۔

اس سارے پس منظر میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایوب خاں کے عہد آمریت میں بقول رشید امجد نئے ادب کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ چونکہ اس عہد اور بعد کے مارشل لائی عہد میں اظہار اور زبان پر قدغن لگتی رہی تھی اور فرد بے توقیر ہو کر اپنے معاشرے کی حقیقی دھار سے مختلف رکاوٹوں کے ذریعے الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ ایک داخلی بحران اور انتشار کی صورت احتجاج اور مزاحمت کی شکل میں ڈھلتا رہا۔ ایک اندھیرے سے دوسرے اور تیسرے اندھیرے میں اترتے رہنے والی سیاسی صورت حال نے ادب میں مزاحمت اور احتجاج کی انسانی تجربے میں آنے والی ایک ایسی تخلیقی حیثیت پیدا کی جو ایک فکری تسلسل کے ساتھ اپنی مخصوص زبان اور ڈکشن میں علامتی اور رمزی انداز میں فروغ پاتی رہی۔ پاکستان کی تقسیم نے وطنیت اور حب وطن کے روایتی تصور کو بھی بدل کے رکھ دیا اور مزاحمتی اور احتجاجی ادب کے ساتھ ساتھ ایک اور ادب بھی پاکستان میں کافی بڑے پیمانے پر لکھا گیا جسے سقوطی ملال کا ادب کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جوشؔ کا باغی اور انقلابی لہجہ اپنے سیاق و سباق کے ساتھ پاکستانی ادب کی نئی حسیت کو نہ تو متاثر کر سکا اور نہ ہی اس کے سیاسی بحران اور ثقافتی ملال اور مزاحمت کی ترجمانی کے لیے اپنی موزونیت کا احساس ہی دلا سکا۔ پاکستان میں جبر اور فوجی آمریت کا ایک لمبا عرصہ علامتوں اور رمزیت کے انداز میں مزاحمتی احتجاجی اور زندانی ادب لکھنے کی فضا بنا رہا تھا جو پاکستان

کے تخلیقی ذہن کے لیے ایک مختلف تخلیقی تجربہ تھا۔ جوشؔ کا تخلیقی وفور اس نئی حسیت اور نئے سیاسی تجربے کا اس طرح حصہ نہیں بن سکا جس طرح فیضؔ کی شاعری نے اسے اپنا تخلیقی کشت زار بنالیا تھا۔

جوش کے دو عشق

جوشؔ نے ''یادوں کی برات'' میں اپنے اٹھارہ معاشقوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن جوشؔ کے دو عشق ایسے ہیں جن کا ''یادوں کی برات'' میں براہ راست تو کوئی تذکرہ نہیں تاہم جوشؔ کا کلام جن کے نشے سے سرشار ہے۔ ایک تو ان کا وہ عشق ہے جس نے ان سے کہلوایا:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

یا پھر ایک جگہ اوران کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ:

گل پر ہیں نقوشِ دست باری اب تک
جنباں ہے دل باد بہاری اب تک
انساں کی پیمبری کا در ہے مسدود
فطرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

فطرت سے ان کا یہ والہانہ عشق انہیں تاکید کرتا ہے

ادب سے دیکھ چمن میں بہار پھولوں کی
جھلک رہی ہیں یہ پیشانیاں رسولوں کی

جوشؔ کا دوسرا معشوق جس سے انہیں والہانی عشق تھا۔ ایک ایسا شخص تھا جس نے جوش کے کلام کو باطل کے خلاف ایک مستقل اعلان جنگ کا درجہ دے دیا اور جس نے اُن سے یہ کہلوایا:

اوہام کو ہر قدم پہ ٹھکراتے ہیں
ادیان سے ہر گام پہ ٹکراتے ہیں
لیکن لیتا ہے جب کوئی نام حسین
ہم اہل خرابات بھی جھک جاتے ہیں

جوشؔ ایسا ہمہ گیر شاعر۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں مشکل ہی سے ملے گا، انسانی زندگی کا کون سا ایسا پہلو ہے اور انسانی جذبات کی کون سی ایسی نزاکت ہے جسے جوش نے اپنے سحر آفریں کلام کی کمند میں گرفتار نہیں کیا۔

''ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے''

جوشؔ کو ''شاعر شباب''، ''شاعرِ انقلاب''، ''مصور شباب''، ''شاعر اعظم'' ایسے القاب سے نوازا گیا ہے، لیکن جوشؔ کا صحیح مقام ہے:

شاعر فطرت اور شاعر حریت

شباب۔ اور انقلاب تو آنی جانی ہے لیکن فطرت، اور حریت زندہ اور پائندہ ہے اور جوش نے اس ضمن میں جو کچھ کہا اور جس انداز سے کہا ہے وہ جب تک فطرت موجود اور حریت مقصود ہے۔ زندہ اور پائندہ رہے گا۔

جوشؔ کے یہ دونوں عشق ان کے بچپن سے شروع ہو گئے تھے اور ان کے پاکیزہ شاعرانہ خمیر میں رچ بس گئے تھے۔ فطرت سے تو ہر شاعر اپنی قربت کا اعلان کرتا ہے۔ علاوہ

جذبی کے جنہوں نے بڑے پتہ کی بات کہہ دی ہے کہ:

فطرت کے پجاری کچھ تو بتا کیا حسن ہے ان نظاروں میں
ہے کون سی رعنائی آخر ان پھولوں میں ان خاروں میں

لیکن جوش کا فطرت سے لگاؤ، زندگی کے تقاضوں کی جس طرف جذبی نے اشارہ کیا تردید نہیں بلکہ ان کی تصدیق ہے۔ جوش کی فطرت زندگی کی عکاس اور زندگی کی ترجمان ہے۔ جوش کی فطرت رومانی خودفراموشی سے عبارت نہیں بلکہ ٹھوس خودآگاہی کی نشاندہی کرتی ہے۔ جوش کی فطرت کے پردے پر بہار بھی ہے۔ خزاں بھی۔ گرمی بھی ہے۔ سردی بھی۔ جیٹھ اساڑھ بھی ہے اور ساون بھادوں بھی۔ جوش کے اس Canvas پر جہاں حسینائیں اور دوشیزائیں جلوہ افروز ہیں۔ وہاں بوڑھے سودخواروں کی نگاہیں بھی کارسوز ہیں۔ اس میں ساون کے جھولوں کی چہل پہل بھی ہے۔ اور بن باسی بابو کی تنہائی بھی۔ اس میں ''جامن والیاں'' بھی ہیں اور ''اداس بیوہ'' بھی۔

اس میں ''نغمہ سحر'' بھی ہے۔ اور ''شام کی بزم آرائیاں'' بھی۔

اس میں ''آواز کی سیڑھیاں'' بھی ہیں اور ''مغموم درخت'' بھی۔

اس میں ''البیلی صبح'' بھی ہے اور ''روحِ شام'' بھی۔

اس میں ''ربودگی'' بھی ہے اور ''گم شدگی'' بھی۔

اس میں ''شب ماہ'' بھی ہے اور ''بیابن فاگن رات'' بھی۔

اس میں ''بہار کی ایک دوپہر'' بھی ہے اور ''لو کی آمد آمد'' بھی۔

اس میں ''بجھا ہوا دل'' بھی ہے اور ''فاختہ کی آواز'' بھی۔

اس میں ''دعائے سحری'' بھی ہے اور ''گریۂ مسرت'' بھی۔

اس میں ''گاتی ہوئی راہیں'' بھی ہیں اور ''دیہاتی بازار'' بھی۔

اس میں ''حور کے اشارے'' بھی ہیں اور ''رقیب فرشتے'' بھی۔

اس میں ''بدلی کا چاند'' بھی ہے اور ''سیر گرداں'' بھی۔

اس میں ''بربادلمحوں سے خطاب'' بھی ہے۔اور ''مبہم پیام'' بھی۔

اس میں شاعر۔منہ داھیرے شعر کہنے کے لیے اٹھتا ہے (جوش کے لیے شعر کہنا سانس لینے کے مترادف تھا۔اور سحر خیزی کے بھی جوش بچپن سے گرویدہ تھے) تو گویا ''تیرگی بہ نور کے دریا میں بہنے کے لیے'' اٹھتا ہے۔اور اپنے چاروں طرف کیا دیکھتا ہے۔کہ

بوئے گل، رنگ افق، ناز صبا، بانگ ہزار
واہ کیا سامان ہیں بشاش رہنے کے لیے
مسکراتی آرہی ہے صبح کی مشعل لیے
حور فطرت مجھ سے اپنے راز کہنے کے لیے
وہ کلی چٹکی، وہ برسا رنگ وہ پھوٹی کرن
ہنس کے وہ انگڑائی لی، دریا نے بہنے کے لیے

جوشؔ کے یہ ذی حیات مناظر۔یہ جیتی جاگتی۔سانس لیتی ہوئی فطرت، یہ سارے عنوان جن میں سے چند میں نے اس وقت دہرائے۔محض جوشؔ کے ایک مجموعے کے ایک چھوٹے سے حصے کی نظموں کے عنوان ہیں۔

''رنگ و بو'' کے یہ مہکتے دمکتے گلدستے''،''شعلہ و شبنم'' کی چھوٹی چھوٹی نظموں سے آراستہ کیے گئے ہیں۔اور ہر نظم ایک شاہکار ہے۔خاموشی سے آہستہ آہستہ پڑھیے۔ ایک ایک لفظ۔ایک ایک ترکیب۔ایک ایک فقرہ۔جیسے لکھا نہیں گیا۔بلکہ خود اپنی معنویت ساتھ لیے کاغذ پر اتر آیا ہے۔جوشؔ کی فطرت کے ذی حیات مناظر کی دلیل خود ان کی ایک نظم میں بڑے قابل کن پیرائے میں پیش کی گئی ہے۔

ذی حیات مناظر

خامُشی دشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے
عمر بھر جو نہ سُنی ہو وہ صدا آتی ہے
بھینی بھینی سی مچلتی ہے فضا میں خوشبو
ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ ساحل سے ہوا آتی ہے
دشتِ خاموش کی اُجڑی ہوئی راہوں سے مجھے
جادہ پیماؤں کے قدموں کی صدا آتی ہے
پاس آ کر مرے گاتی ہے کوئی زُہرہ جمال
اور گاتی ہوئی پھر دُور نکل جاتی ہے
آنکھ اُٹھاتا ہوں تو خوش چشم نظر آتے ہیں
سانس لیتا ہوں تو احباب کی بُو آتی ہے
دشنہ رکھ دیتا ہے گھبرا کے رگِ جاں پہ کوئی
جب کلی خاک پہ دم توڑ کے گر جاتی ہے
مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹا میں بجلی
آنکھ سی کوہ بیاباں کی جھپک جاتی ہے
کرنے لگتے ہیں نظارے سے جو بادل مایوس
برق آہستہ سے کچھ کان میں کہہ جاتی ہے
جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے
دلِ شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سائے باتیں
ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے
گنگناتے ہوئے میدان کے سناٹے میں
آپ ہی آپ طبیعت مری بھر آتی ہے
یوں نباتات کو چھوتی ہوئی آتی ہے ہوا
دل میں ہر سانس سے اک پھانس سی چُبھ جاتی ہے

جب ہری دُوب کے مڑ جاتے ہیں نازک ریشے
شیشۂ قلب میں اِک ٹھیس سی لگ جاتی ہے
بانسری جیسے بجاتا ہو کہیں دور کوئی
یوں دبے پاؤں بیاباں سے ہوا آتی ہے
حسرتیں خاک کی غنچوں سے اُبل پڑتی ہیں
رُوح میدان کی پھولوں سے نکل آتی ہیں
طبعِ شاعر کو، روانی کا اشارہ کر کے
نہر شاخوں کے گھنے سائے میں سو جاتی ہے
ان مناظر کو میں بے جان سمجھ لُوں کیوں کر؟
جوشؔ! کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے

جوشؔ کی ایک اور نظم آپ کو سنواؤں۔ ''بدلی کا چاند''

ہندستان میں ہم بدلی کا چاند روز دیکھتے تھے کہ کیسے کیسے کھیل آسمان میں کھیلتا ہے۔ یہاں تو بدلی کا چاند کیا، کوئی بھی چاند دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ جب چندر ما بادلوں میں اٹھکھیلیاں کر رہا ہوتا ہے تو ہم لوگ یہاں سینٹرل ہیٹنگ (Central heating) کھول کے۔ ٹیلی وژن کے سامنے آنکھیں پھاڑے ہوئے جامد و ساکت بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن ذرا اپنے حافظے پر زور دیجیے۔ اپنے بچپن یا اپنی جوانی کو آواز دیجیے۔ اپنے وطن کی شامیں یاد کیجیے۔ جب دونوں وقت گلے ملتے تھے۔ اندھیرا ہونے لگتا تھا۔ اور بجلی کی افسوں شکن روشنی مداخلت نہیں کرتی تھی۔ اس وقت بدلی کا چاند کیسی آنکھ مچولیاں کھیلتا تھا۔ تو سنیے

''بدلی کا چاند''

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا

مہتاب، وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا
وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا
لو، ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دَوڑ گئے
لو، پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرّانے لگا
بادل میں چھپا، تو کھول دئے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا، تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا
ہمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہَوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا
غرفوں سے جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا
پردہ جو اُٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسُّم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا
اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی، ڈوبا، تو فلک بے نور ہوا
اُلجھا، تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا
کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے، کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

۱۹۳۰ء

ایک تو فطرت کا اتنا نازک مشاہدہ۔ پھر جوشؔ کی گنگا جمنی زبان۔ ہندوستان کی زبان، وہ زبان جس نے فارسی، عربی اور ہندی زبانوں کا رس نچوڑ کر اپنے اندر بھرلیا ہے۔ جوشؔ کی ایک نظم ہے جس میں یہ گنگا جمنی زبان مزا دے جاتی ہے:

"ساون کے مہینے"

فردوس بنائے پرے ساون کے مہینے
اک گلرخ و نسریں بدن و سرد سہی نے
مینھہ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار
اتنے ہی زمیں اپنے اُگلتی تھی دفینے
گیتی سے اُبلتے تھے تمنا کے سلیقے
گردوں سے برستے تھے محبت کے قرینے
بارش تھی لگاتار تو یوں گرد تھی مفقود
جس طرح مئے ناب سے دُھل جاتے ہیں کپڑے
شاخوں پہ پرندے تھے جھٹکتے ہوئے شہپر
لہروں میں بطیں اپنے اُبھارے ہوئے سینے
گلریز تھے ساحل کے لچکتے ہوئے پودے
گلرنگ تھے تالاب کے ترشے ہوئے زینے

یہ محاکات، یہ منظرکشی، یہ ترشی ہوئی ترکیبیں، یہ رس میں ڈوبے ہوئے الفاظ، یہ سعدیؔ اور جامیؔ کا سنگم اور یہ انیسؔ والی سلاست۔ آپ کو اردو کے دوسرے بڑے شاعروں میں کم ملے گی اور معاشرے کی مختلف تصویروں کا اتنا مکمل البم صرف جوش کے یہاں ہے۔ یا پھر نظیر اکبرآبادی کے یہاں لیکن خیر یہ دوسری بحث ہے۔ بات یہاں صرف فطرت کی ہو رہی تھی۔ دوسرے موضوعات جب جوش لکھتے ہیں (اور کس موضوع کو جوشؔ نے نظم نہیں کیا) تو ان کی زبان۔ خصوصاب ان آخری اور فلسفیانہ دور کی زبان کسی قدر گاڑھی، بلکہ کبھی کبھی تو ناقابل برداشت حد تک مقدس ہے لیکن فطرت کا ذکر کرتے وقت۔ جوشؔ خالص اردو کے شاعر ہو جاتے ہیں۔ سنیے۔ ایک چھوٹی سی نظم۔

”لُو کی آمد آمد“

طے صُبح کی راہ کر چکی ہے　　دیواروں سے دھوپ اُتر چکی ہے
خنکی کی اُلٹ پُلٹ ہے مسند　　مَیداں میں ہے لُو کی آمد آمد
آتی ہیں ہوائیں سنسناتی　　پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی
دوزخ میں بہشت ہے غزلخواں　　شاخوں پہ چہک رہی ہیں چڑیاں
چوپائے ابھی سے ہانپتے ہیں　　ہیبت سے درخت کانپتے ہیں
ہر سُو ہیں رَواں دواں ہوائیں　　لرزاں ہیں طیور کی صدائیں
تھم تھم کے نکل رہے ہیں شُعلے　　انبار ہے خشک پتیوں کے
تیمی سے ہوائیں آ رہی ہیں　　سَن سَن کی صدائیں آ رہی ہیں
یُوں گرد و غبار چھا رہا ہے　　میداں کے حواس اُڑا رہا ہے
ہلکی سی فلک پہ کچھ گھٹا ہے　　خورشید، ذرا سا چھپ گیا ہے
مَیداں بدل رہا ہے کیا رُوپ　　سایہ تھا ابھی، ابھی کڑی دھوپ
پُر ہول ہوا کے ارغنوں ہیں　　آموں کے درخت سرنگوں ہیں
گھبرائے ہوئے ہیں باغ والے　　ہو جائیں کہیں نہ خشک تھالے
پھرتے ہیں ادھر اُدھر کھلے سر　　کاندھوں پہ گھڑے، نظر فلک پر
سُوکھی ہوئی گھانس ہے فسردہ　　افسردہ نہ کہیے، بلکہ، مردہ
دوزخ کی نظر ہے، بزم جاں پر　　وحشت ہے زمین و آسماں پر
پہلو سے، زمیں بدل رہی ہے　　ذرّوں سے وندگ نکل رہی ہے

گرمی کی ہے باڑھ پر جوانی
ہر ذرہ پکارتا ہے، 'پانی'

جوشؔ جس انس و محبت۔ جس غنائیت اور اپنائیت، جس لطافت اور نزاکت بلکہ جس معرفت سے فطرت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ دراصل حقیقت میں جوشؔ ہی کا حصہ ہے۔ ان کی ایک نظم ”پیغمبر فطرت“ کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

کُندن سے یہ کلس، یہ دل آویز کوہسار
یہ دل کشا چمن، یہ فرح بخش لالہ زار
شاخوں کا دلبری سے لچکنا یہ بار بار
یہ مہر کا جمال، نہ پنہاں، نہ آشکار
یہ آسمان، جلوہ گری پر تُلا ہوا!
یہ حسنِ لازوال کا پرچم کھلا ہوا
یہ آب و تابِ چادرِ آب رواں، یہ نور
نزہت کا یہ ہجوم، لطافت کا یہ وفور
یہ دامنِ نسیم میں، سرمایۂ سرور
بکھرے ہوئے زمین پہ موتی یہ دُور دُور
یہ جھلکیاں سی پردۂ ظلمت میں نُور کی
یہ معرفت میں غرق، صدائیں طیور کی
اے شیخ! تُو نہیں ہے حقائق سے بہرہ یاب
فطرت پرست جوش پر اور اس قدر عتاب
فطرت بھی تیری طرح سے ہے صاحبِ کتاب
اس دین کا صحیفہ زریں ہے آفتاب
خاشاک کہہ رہا ہے جِسے تُو، وہ پھول ہے
ناداں! صباحِ غنچہ کُشا بھی رسول ہے!

۱۹۲۶ء

جوش کی فطرت آفاقی ہونے کے ساتھ ساتھ خالص ہندستانی ہے۔ جوش آفاقی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خالص ہندستانی شاعر ہیں۔ وہ ہندستان جسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جو ایک

ہزار سال سے زیادہ کے اختلاط ایک ہزار سال سے زیادہ کی باہمی دوستیوں اور رنجشوں، باہمی شکایتوں اور حکایتوں، باہمی شکستوں اور کامیابیوں، باہمی نفرتوں اور محبتوں۔ ایک دوسرے کے مسرت وغم میں شرکتوں اور ایک دوسرے کے رسم ورواج میں حصہ داریوں سے بنا ہے۔ جس کی زندہ مثال ہماری اردو زبان ہے جو ایسی میراث ہے جس کے اقبالؔ اور چکبستؔ۔ فیضؔ اور فراقؔ، جوشؔ اور محرومؔ، آزادؔ اور سردارؔ، مساوی حقدار ہیں۔ اور جس میں سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر، انتظار حسین اور راجندر سنگھ بیدی، پریم چند اور قرۃ العین حیدر، بالک رام اور آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ سب کا برابر کا حصہ ہے۔ خیر یہ پھر ایک علیحدہ بحث ہے۔ میں اپنے نفسِ موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے آپ کو جوشؔ کی ایک اور نظم کے چند اشعار کی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ جوشؔ کی ایک شاہکار نظم ''کسان'' آپ کہیں گے کہ اس کا فطرت سے کیا تعلق۔ تو میں عرض کروں گا کہ یہ نظم فطرت میں ڈوبی ہوئی نظم ہے۔ کسان تو اس نظم میں بعد میں آتا ہے، اور جب آتا ہے تو فطرت کا پیکر بن کر آتا ہے۔ لیکن کسان کے نمودار ہونے سے پہلے۔ جوشؔ نے دیہات کے جھٹپٹے کا جو منظر کھینچا ہے وہ اردو شاعری کے اعلیٰ ترین نمونوں میں رکھا جا سکتا ہے بلکہ اردو کی قید ہی کیوں لگائی جائے۔

خیر، تو یاد کیجیے، اس نظم کا پہلا شعر جس میں محض چند الفاظ میں بلا کسی فعل کا استعمال کیے۔ ایک پورا منظر، ایک پورا ماحول، ایک پوری کیفیت طاری کر دی گئی ہے۔

جھٹپٹے کا نرم رَو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

ذرا ایک مرتبہ پھر پڑھیے اور غور کیجیے کہ اس نسبتاً طویل بحر کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ الفاظ کون سے نہیں، بلکہ کس قسم کے استعمال کیے گئے ہیں۔ کشیدہ اور کھلے ہوئے الفاظ جو ہمارے ذہن پر ہمارے احساس پر شام کی غنودگی کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ کائنات میں ایک ٹھہراؤ

ہے۔زندگی آہستہ خرام ہے۔ ہر چیز کو جیسے نیند سی آرہی ہے۔

جھٹپٹے کا نرم رَو دریا شفق کا اضطراب

کھیتیاں، میدان، خاموش، غروب آفتاب

ہرلفظ، کشیدہ اور کشادہ۔ پہلے ہی شعر میں الفاظ، مگر بڑے مناسب اور چیدہ چیدہ الفاظ کی مدد سے ان کی معروضیات کو سمیٹ لیا گیا۔ اور پھر دیکھیے Canvas پر اس ماسٹر اسٹروک (Master stroke) کے بعد کس کس طرح سے اور کس مہارت سے اس پینٹنگ (painting) میں رنگ بھرے گئے ہیں۔

کِسان

جھٹپٹے کا نرم رَو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروب آفتاب
دشت کے کام و دہن کو، دن کی تلخی سے فراغ
دُور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ
زیرِ لب، ارض و سما میں باہمی گفت و شنُود
مشعلِ گردُوں کے بُجھ جانے سے اک ہلکا سا دُود
وسعتیں میدان کی، سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر، خواب آفریں ہلکا سا رنگ
خامُشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دِن کی گرمی کا گِلا
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیان کا فاصلا
خارو خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان

بامِ گردوں پر کسی کے رُوٹھ کر جانے کی شان
دُوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر، سُرخی، سُرخیوں میں کچھ دُھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں
پتّیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

اب اس کے بعد، کسان، پردۂ سیمیں پر آتا ہے۔ نظم کیا ہے۔ وائڈ اسکرین (Wide screen) پر ایک شاہکار رنگین فلم ہے۔ جس کا ایک ایک فریم (frame) جیسے کسی بڑے امپریشنسٹ (impressionist) آرٹسٹ نے اپنے ہاتھ سے بھرا ہے۔ اور اب دیکھیے کیسے موڈ بدلتا ہے۔

یہ سماں اور ایک قومی انسان، یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار

ابھی یہ کلوز اپ (Close up) نہیں ہے۔ پردے پر دور سے اس کی امیج (image) نظر آتی ہے۔ اور فلم ڈائرکٹر۔ الفاظ کی موسیقی سے اس کا آپ سے تعارف کرتا ہے۔ یہ قومی انسان کون ہے؟ ارتقا کا پیشوا۔ تہذیب کا پروردگار

اور پھر جوشؔ نے کسان کی شان میں جو اشعار لکھے ہیں۔ بائیس (۲۲) اشعار اُن میں سے ایک ایک شعر اپنی جگہ مکمل اور معنویت سے مالا مال ہے۔ کسان پر یہ منظم صحیفہ۔ خود اپنی جگہ ایک شاہکار ہے۔

میں جوشؔ کی اس نظم کو فنی اعتبار سے دنیا کی بہترین نظموں میں رکھتا ہوں۔ سُنیے ارتقا کے اس پیشوا، تہذیب کے اس پروردگار، کی شان میں بائیس اشعار میں سے محض چند:

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بُو، گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم
محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشیدِ زرافشاں کا علم
محنتِ پیہم کا ''پیماں'' ''سخت کوشی کی قسم''
قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلۂ لُو جھونکوں کا ہمدم، تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں

اور اب دیکھیے وہ کسان قریب آ گیا۔ کلوز اپ (Close up) پورے اسکرین کو بھر دے گا

دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منھ، گھر کی جانب ہے رواں

اور یہ دل و دماغ پر نقش ہو جانے والا۔ زبردست کلوز اپ (Close up)

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

الفاظ کی صوتی اقدار بھی ذہن میں رکھیے۔ یہ بڑی ڈاؤن ٹو ارتھ (Down to earth) تصویریں ہیں۔ بڑی ٹھوس تصویریں۔ لکڑی اور لوہے کی۔ ڈھور اور ڈنگر کی

ٹوکرا سر پر۔ بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پہ مضبوط ہل

ٹوکرا، جوڑی، پھاوڑا

اس کسانی کلوز اپ کے لیے یہ کھردرے الفاظ، وہی فنکار استعمال کر سکتا ہے جو اپنے فن پر پوری طرح حاوی ہو۔ مثلاً انیس۔

الفاظ کے علاوہ فقروں کے تناسب پر بھی غور کیجیے۔ پورے شعر میں صرف پانچ فقرے ہیں۔ تین مصرعہ اولیٰ میں اور دو مصرعہ ثانی میں۔ لیکن کیسے سانچے میں ڈھلے ہوئے اور ترازو میں تلے ہوئے فقرے ہیں،

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پر بل

اور پھر ''بل'' کے بیان میں آٹھ شعر ہیں۔ جو اس آخری مصرعے پر ٹوٹتے ہیں

جس کا لوہا مان کر، سونا اگلتی ہے زمین

یہی وہ زمین ہے جس سے جوشؔ کی فطرت پھوٹ نکلی ہے، جو زندہ ہے۔ جاندار ہے۔ جس کا ایک ایک ذرہ۔ ایک ایک پودا۔ ایک ایک پھول سانس لے رہا ہے۔

آج ہنگام سحر اے ہمدم آگیا ایک پھول زیر قدم
پھول اور موت کے اٹھائے ناز ''کچ'' سے اک آئی دردناک آواز

ہائے کیا قہر تھی یہ پامالی
میں نے اک زندگی کچل ڈالی

اور جوشؔ کی اس ذی حیات فطرت کی انجمن میں مئے معرفت سے لبریز ایک رباعی سنیے:

جب رات کو جھومتے ہیں بادل کالے ظلمت میں ٹپکتے ہیں دلوں کے چھالے
قرباں ترے اس وقت کی تاریکی میں انگشتِ سحر سے دل کو چھونے والے

اور جب یہ رند سحر خیز، صبح کی مسحور کن فضا میں آنکھ کھولتا ہے تو ایک آواز اس کے دل کے ستار پر مضراب کا کام کر جاتی ہے۔

اُفق سے سحر مسکرانے لگی مؤذن کی آواز آنے لگی
یہ آواز ہر چند فرسودہ ہے جہاں سوز صدیوں سے آلودہ ہے
مگر اس کی ہر سانس میں مُتصل
دھڑکتا ہے اب تک محمدؐ کا دل

اور یہیں سے میں جوشؔ کے دوسرے عشق کی سمت رجوع کرتا ہوں۔ عبداللہ کے بیٹے محمدؐ سے جوشؔ کو گہری عقدیت تو تھی ہی لیکن محمدؐ کے نواسے پر جوشؔ جان دیتے تھے۔

حسینؑ ابن علیؑ سے جوشؔ کا جو لگاؤ تھا، وہ صرف عقیدے کی بنا پر نہیں تھا۔ حسینؑ کے کردار کا جوشؔ نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور جذباتیت سے بلند ہو کر کیا تھا۔ حسینؑ کی موہ لینے والی شخصیت کے جس پہلو نے جوشؔ ایسے رندِ خراباتی کو الفت کا نشہ پلایا۔ وہ حسینؑ کی حریت پسند اور باطل دشمنی تھی۔ عالمی تاریخ کے جس دور میں جوشؔ سانس لے رہے تھے اس میں ان کو یزیدیت ہر سمت اپنا جال پھیلاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ اگر حسینؑ کی مثال سامنے نہ ہو تو اس یزیدیت کی یلغار کو روکنے کی کوشش بے سود لگے اور اس سے سمجھوتہ کر لینے کا منصوبہ دانشمندی۔ اور آج بھی جب یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کون ہیرو ہے اور کون ویلن۔ جب کل کے تازہ دم نوجوان انقلابی، آج بوڑھے کھوسٹ سود خواروں کے آگے کاسہ بدست بھیک مانگنے آ رہے ہیں۔ جب لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون کرنے والے ہری بھری کھیتیوں کو پھونک ڈالنے والے۔ آباد شہروں کو کھنڈر بنانے والے، خود کو ایک نئے عالمی نظام کا معمار قرار دیتے ہیں۔ جب آزادی کا گلا گھونٹنے والے، آزادی کا جھوٹا دم بھرتے ہیں۔ تو اقبال کا یہ شعر کس قدر حسب حال معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

ان حالات میں جوشؔ ایسے حساس اور منہ پھٹ شخص کو اگر حسین کا سہارا نہ ملتا تو عجب نہیں جو جوشؔ اپنا توازن کھو کر مغلظات پر اتر آتے۔ ایک تو الفاظ کا وہ خزانہ جو جوشؔ کی ملکیت تھا اور پھر مزاج کی وہ گرمی اور احساس کی وہ شدت جو جوشؔ کو ودیعت کی گئی تھی۔ ان کو آپے سے باہر کر دیتی۔ جس کی بعض مثالیں ان کی نظموں میں جا بجا ملتی ہیں۔ جن میں جوشؔ کا لہجہ، شاعرانہ لہجے سے ہٹ کر دشنام طرازی بلکہ کہیں کہیں تو ہاتھا پائی پر اتر آتا ہے۔

ان بزدلوں کے حسن پر شیدا کیا ہے کیوں

نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں

لیکن چیخنے چلانے کے بعد گھوم پھر کر ہانپتے کانپتے وہ واپس حسینیت کے سایے تلے آکر دم لیتے ہیں اور ان کا لہجہ اپنی شدت کھوئے بغیر مہذب اور کہیں زیادہ موثر ہو جاتا ہے اور اُن سے ایسے آفاقی حقایق قلم بند کراتا ہے جس سے دماغ بھی روشن ہو اور خون کی حرکت بھی تیز ہو۔ جوشؔ اپنی پوری قوتِ بیان کے ساتھ کربلا کے میدان میں اتر آتے ہیں۔ اور باطل کے خلاف اس چھوٹی سی حسینی فوج میں خود بھی صف آرا ہو کر یزیدیت پر ایسے بھرپور وار کرتے ہیں کہ ہمیں انسان کے مستقبل پر اعتماد آنے لگتا ہے۔ جوشؔ کا کربلا وہ کربلا نہیں جس کا ہر سال دس روز تک تو زار و قطار تذکرہ ہو لیکن جس کے اصل پیغام کو ہم باقی وقت فراموش کر دیں۔ جوشؔ کا کربلا انہیں کے الفاظ میں برق و آتش کا ایک ابلتا ہوا فوارا ہے۔ خونِ شہدا کا ایک سڑتا ہوا دھارا ہے۔ جہاں آج بھی جہانداروں کا رنگ اڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جہاں آج بھی تلواروں کا مینہہ برستا ہے۔

کربلا آج بھی ہے ایک لگاتار پکار ہے کوئی پیروِ ابنِ علیؑ پر طیّار

عصرِ حاضر میں یزیدوں کا نہیں کوئی شمار تم مُصلوں پہ دوزانو ہو، مسلّح اشرار

شورِ ماتم میں کہیں تیغ کی جھنکار نہیں

لب پہ نالے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں

کربلا کو جوشؔ استعارے کی بیساکھی کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔ وہ صاف

الفاظ میں اشاروں اور کنایوں سے قطع نظر ڈنکے کی چوٹ سے کہتے ہیں کہ کربلا تعصب کے خلاف جنگ ہے۔ حق تلفی کے خلاف جنگ ہے، ظلم و تشدد کے خلاف جنگ ہے، ملوکیت اور شہنشاہیت کے خلاف جنگ ہے۔

کربلا ایک تزلزل ہے محیطِ دوراں — کربلا خرمنِ سرمایہ پہ ہے برقِ تپاں
کربلا طبل پہ ہے ضربتِ آوازِ اذاں — کربلا جراتِ انکار ہے پیشِ سلطاں

فکرِ حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی

جب تک اس خاک پہ باقی ہے وجودِ اشرار — دوشِ انساں پہ ہے جب تک حشم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرمِ پیکار — کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار

کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

اور جوشؔ کو حسین سے جو رابطہ ہے۔ وہ گویا ایک Hot line کی اہمیت رکھتا ہے۔

کس کی یارب یہ صدا ہے کہ فضا ہے خاموش
میں حسین ابن علی بول رہا ہوں اے جوشؔ
بخش دے آگ مرے سرد عزاداروں کو
ہاں جگا، ڈاب میں سوئی ہوئی تلواروں کو

اور واقعہ تو یہ ہے کہ جوشؔ اپنے حتی الامکان یہ فرمان بجالائے۔ جوشؔ کے حسین محض مظلوم حسین نہیں۔ جوشؔ کے حسین ایک انقلابی حسین ہیں جن کا ہر موئے تن اور جن کی ہر سانس ایک دعوتِ عمل ہے۔

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا، وہ حسینؑ — خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسینؑ
اک دینِ تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ — جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسینؑ

جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا

جو رُوحِ انقلاب کا پروردگار تھا

اور گھیرے میں جاتے ہوئے جوشؔ لکھتے ہیں:

ہاں وہ حسینؑ، جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات
اک کارسازِ ذہن ہے، اک ذی شعور ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو ''مسجود'' کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے ''معبود'' کی طرف

اور یہ دیکھیے کیسی ٹھوس بات جوشؔ نے کہی ہے:

عالم میں ہو چکا ہے مسلسل یہ تجربا
قوت ہی زندگی کی رہی ہے گرہ کشا
سر ضعف کا ہمیشہ رہا ہے جھکا ہوا
ناطاقتی کی موت ہے، طاقت کا سامنا
طاقت سی شے مگر خجل و بدنصیب تھی
ناطاقتی حسینؑ کی کتنی عجیب تھی

طاقت کے حالیہ زبردست، بدہیبت اور گھناؤنے مظاہروں سے مایوس ہو کر بیٹھ جانے والوں کے لیے جوش بار بار حسینؑ کی مثال پیش کرتے ہیں:

طاقت سی شئے کو خاک میں جس نے ملا دیا
تختہ اُلٹ کے، قصرِ حکومت کو ڈھا دیا
جس نے ہوا پہ، رعبِ امارت اڑا دیا
ٹھوکر سے جس نے گنبدِ شاہی گرا دیا
اس طرح جس سے ظلم، سیہ فام ہو گیا
لفظِ یزید، داخلِ دشنام ہو گیا

اور پھر یاد دلاتے ہیں:

پانی سے تین روز ہوئے جس کے لب نہ تر
تیغ و تبر کو سونپ دیا جس نے گھر کا گھر
جو مرگیا ضمیر کی عزّت کے نام پر
ذلّت کے آستان پہ جھکایا مگر نہ سر
لی جس نے سانس، رشتۂ شاہی کو توڑ کر
جس نے کلائی موت کی رکھ دی مروڑ کر

اور دیکھیے یہاں کس محبت سے جوشؔ اپنے معشوق کا تذکرہ کرتے ہیں:

تجھ سا شہید کون ہے عالم میں اے حسینؑ — تو ہے ہر ایک دیدۂ پُرنم میں اے حسینؑ
زُہّاد ہی نہیں ہیں ترے غم میں اے حسینؑ — ہم رند بھی ہیں حلقۂ ماتم میں اے حسینؑ

آزاد جو خیال میں ہیں اور کلام میں
وہ بھی اسیر ہیں تری زلفوں کے دام میں

آخر میں جملہ معترفہ کے طور پر مرثیے کی صنف کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اور اردو کے ممتاز نقاد اور استاد اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مرحوم مجتبیٰ حسین کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جنھوں نے مرثیے کے بارے میں بڑی خیال افروز باتیں کی ہیں۔ مجتبیٰ لکھتے ہیں:

''تاریخ میں آدمی کی بے حرمتی کب تک گوارا کی جائے گی۔ ملوکیت اور سرمایہ کب تک آدمیوں کو بے گھر، بے در اور پائمال کرتا رہے گا۔ پانی پر کب تک ظلم کا پہرا رہے گا اور نوع انسانی کب تک پیاسی رہے گی۔ مرثیوں نے انہیں سوالوں کو پیش کیا ہے۔ اس لیے مرثیے جدید ہوں یا قدیم، کبھی باسی نہیں ہوتے۔ یہ آدمی کی اس المیہ داستان کو مسلسل پیش کرتے ہیں جو ظالم حکمرانوں کی دینی اور سیاسی تاویلات سے مرتب ہوتی رہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مرثیے ایک تاریخ پر مبنی ہیں جو پیغمبر اسلام سے شروع ہو کر کربلا پر ختم ہوتی ہے۔ مگر مرثیوں نے تاریخ نہیں کہی ہے۔ انہوں نے تاریخ کے ضمیر کو نظم کیا ہے۔ اس آواز کو سنا ہے اور اس پر لبیک کہا ہے جو آدمی کے دل سے نکلتی رہی ہے۔ اس لیے مرثیوں میں آدمی کا جلال اور جمال، ثبات عزم، صبر و حلم،

ایثار و شہادت سب کچھ ہے، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ چیز ملتی ہے جس سے آدمی، آدمیت کی تصدیق بن جاتا ہے۔ وہ ہے باپ کی شفقت، ماں کی مامتا، بہن بھائیوں کی محبت، دوستوں کی وفا، زندگی انہیں رشتوں پر پروان چڑھتی اور نکھرتی ہے۔ یہی رشتے طہارت اور انہیں رشتوں کو برقرار رکھنا عبادت ہے۔ اس لیے شاعر مرثیوں کی فضا میں زندہ آدمیوں سے ملتا ہے۔

مرثیوں کو سودا نے مشکل ترین صنف قرار دیا ہے۔ اگر ہم مرثیے کی اس فضا کو مدِ نظر رکھیں تو معلوم ہو جائے کہ اچھا مرثیہ کہنا۔ شاعر کا امتحان ہے''

جوشؔ نے اس امتحان میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔

جوشؔ کے مرثیوں کے عنوانوں سے جوشؔ کے ظرف کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

'آوازۂ حق'۔ 'حسین اور انقلاب'۔ 'موجد و مفکر'۔ 'وحدت انسانی'۔ 'طلوع فکر'۔ 'موت و حیات'۔ 'عظمت انساں'۔ ان میں ہر مرثیہ ایک شاہکار نظم ہے۔ جس پر اردو زبان فخر کر سکتی ہے۔ اور ہر بند ایک مستقل دعوت فکر و عمل ہے۔

جوشؔ ہر بڑے شاعر کی طرح اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے۔

لیکن میں اسے اپنی انتہائی خوش قسمتی تصور کرتا ہوں کہ میں وقت سے پیدا ہو گیا اور میں جوشؔ کا دور دیکھ لیا اور لکھنؤ، الٰہ آباد اور پونا میں ہندستان کے اس ولولہ انگیز عہد میں، اُن سے قربت کا شرف حاصل ہوا۔ جب وہ اپنی صلاحیتوں کے نقطۂ عروج پر تھے اور جب آزادی کے خواب نے شرمندہ تعبیر نہ ہو کر جوشؔ کو یہ کہنے پر مجبور نہ کیا تھا کہ

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

لیکن جوشؔ نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی کبھی ہمت نہیں ہاری، اور یہی کہتے رہے کہ

گلوں میں اور خار میں، خزاں میں اور بہار میں
ازل کے دن سے آج تک بشر کے انتظار میں
کھڑی ہیں کائنات کی جوانیاں بڑھے چلو

مجھے یقین ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا اور جلد آئے گا۔ جس دن کے لیے جوشؔ نے یہ کہا ہے کہ:

یہ جو مچل رہی ہے صبا، پھٹ رہی ہے پو ۔۔۔ یہ صبحِ انقلاب کی جو آجکل ہے ضو
در پردہ یہ حسینؑ کے الفاظ کی ہے رو ۔۔۔ یہ جو چراغِ ظلم کی تھرّا رہی ہے لو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اُسی جری کی ہے آواز دوستو

یہی وہ شاعری ہے جسے جزوِ پیمبری کہا گیا ہے۔ جہاں صریرِ خامہ نوائے سروش ہے اور شاعر بجا طور پر کہتا ہے۔

پرتو یہ پڑا پشت سے کس کا سرِ جام ۔۔۔ کل رات گئے عین طرب کے ہنگام
سرکارِ فلک کے نام کوئی پیغام؟ ۔۔۔ تم کون ہو؟ جبرئیل ہوں، کیوں آئے ہو؟

جوش کی شاعری کا فکری نظام

جوش کی نظمیہ شاعری اس وقت اپنے قارئین کا حلقہ وسیع کر رہی تھی جب اقبال کی فلسفیانہ اور دینی جمالیات کی شاعری کی دھوم تھی۔ اقبال نے کہا تھا:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف برہنہ جسے کہہ نہ سکے روبرو

تو گویا یہ اعلان کیا تھا کہ فلسفہ اور شعر کے مزاج میں مجاز کا رنگ پایا جانا ایک فطری امر ہے۔ جوش نے اپنی شاعری میں جذبے کو بنیادی قدر جانتے ہوئے شاعری برائے تفلسف کے نظریئے سے خود کو دور رکھنا چاہا۔ یہ الگ بات ہے کہ قارئین ان کے متون کی قرأت کے استعارے کے طور پر ان کے یہاں فلسفہ اور فکر کا ایک نظام دریافت کر لیں کیونکہ جوش نے اقبال کی طرح قصداً اپنی شاعری میں کسی قسم کی منضبط فکر کی تشکیل میں دلچسپی نہیں لی ہے، جس طرح اقبال کی شاعری میں وطن، قوم، تصور انسان، خودی اور بے خودی، عقل و عشق، نظریۂ تعلیم اور فنون لطیفہ وغیرہ جیسے فلسفیانہ تصورات، شعری صداقتیں بن کر سامنے آئے

ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ جوش کے یہاں اپنے عہد کے فلسفے اور فکر کی پر چھائیاں نہیں ملتیں یا ان کے یہاں صدیوں سے چلی آرہی فلسفیانہ روایتوں کی ردِّ تشکیل کے نمونے نہیں ملتے۔ انہوں نے تو اپنی شاعری کو اس وقت فلسفہ اور فکر کی سطح پر منفرد بنالیا تھا جب اقبال کی شعری کائنات کے آگے بڑے بڑوں کا چراغ گل ہو گیا تھا۔

جوش نے ایسے دور میں اپنی آواز کو منفرد بنانے کے لیے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اتباع توارد سے کام لیتے ہوئے فکر اور اسلوب کی سطح پر خود کو الگ کر لیا اور جذبے کو فلسفے کے مقابلے اہم قدر جانا۔ اس لیے اقبال کی طرح جوش کی شاعری میں کسی مربوط فلسفیانہ نظام کی تلاش ان پر ظلم کرنے کے مترادف ہوگا۔ پروفیسر ممتاز حسین نے اپنے مضمون ''جوش فکر و فن کے آئینے میں'' لکھا ہے:

> کسی بھی شاعر سے منضبط فکر کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ بنیادی حیثیت سے شاعر ہوتا ہے نہ کہ مفکّر۔ اس کا فن اپنی فکر (تجربات و جذبات) کو ایک محسوس صورت دینے کا ہے، اور جب وہ یہ عمل شاعری کے ذریعے انجام دیتا ہے تو اسے اپنے خیال کو نغماتی بھی بنانا پڑتا ہے۔ یعنی اُسے نغماتی فقروں میں سوچنا پڑتا ہے۔ (نقد حرف، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص: ۴۷)

یہ بات صحیح بھی ہے کہ شاعر کے یہاں کسی مضمون نگار یا فلسفی کی طرح کسی ایک موضوع پر لکھنے کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ وہ تو لمحہ لمحہ، دن بہ دن، ماہ بہ ماہ اور اپنی پوری عمر میں نہ جانے کن کن تجربوں سے گزرتا ہے، احساسات کی ان گنت اور بے نام گلیوں سے گزرتا ہے اور انہیں لفظوں کا جامہ پہناتا رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی شاعر کے یہاں کچھ ایسا خیال یا نکتہ بار بار آئے کہ قاری اسے ایک فلسفیانہ نظام کی صورت میں پیش کر دے۔ جوش نے خود لکھا

ہے:

میرے شعروں میں فقط ایک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے کچھ عاشقانہ رنگ ہے
کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل کچھ خیال
اک اچٹتا سا جمال اک سر بہ زانو سا جلال

جوش یہ پوچھے جانے پر کہ آپ کا مقصد شاعری کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں:

''پھول کھلتا ہے کسی مقصد نہیں نہیں، چاندنی کھلتی ہے کسی مقصد سے نہیں۔ اس طرح سے ایک ذہنی ولولہ ہے جس سے شعر نمودار ہو جاتا ہے۔ اب جب بار بار خیالات آئے تو ان کی تکرار سے قارئین اس کا اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کا انداز فکر کیا ہے اور کیا چاہتا ہے۔'' (مکالمات جوش، ترتیب راغب مرادآبادی/سید اقبال حیدر دیکھیں عصری آگہی، قمر رئیس، مجلہ ۲، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۶۔۱۲۱)

جوش نے بڑی باریکی سے یہ بتا دیا ہے کہ آپ چاہیں تو میرے یہاں سے بھی ایک خاص فلسفیانہ نظام دریافت کر سکتے ہیں لیکن بحیثیت قاری جوش سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہ باتیں انہیں کے متن کی روشنی میں چھوٹی ہو گئی ہیں۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ جواب یہ ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں ایک Stand لے لیا کہ عقل عشق کے مقابلے ایک طفل مکتب ہے یا عقل عشق کی اور عشق عقل کی ضد ہے تو وہ اسی خیال پر اپنی پوری شاعری میں زور دیتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس جوش کا سیمابی ذہن ایک مسئلے پر تادیر ٹکتا ہی نہیں۔ ان کے بنائے ہوئے تصورات خود انہیں کے متن سے رد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ عمل جوش کی شاعری کی بہت بڑی کمی ان لوگوں کے نزدیک قرار

پاتی ہے جو لوگ ادب کو سماجیات اور سیاسیات کا شاخسانہ یا شاعری کو مقالہ گردانتے ہیں۔
میرے نزدیک جوش کا کسی ایک خیال یا فکر پر تا دیر قائم نہ رہنا یا اُسے آخری سچائی نہ سمجھنا یا اس فکر کو حتمی سمجھنے سے گریز کرنا اپنے متن کو بند متن ہونے سے بچانا ہے اور قاری کو سوچنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ جوش نے ایسا ایک اور وجہ سے بھی کیا ہے اور وہ یہ کہ یہ ایک فطری عمل نہیں کہ ایک آدمی پوری عمر ایک ہی راگ الاپتا رہے۔ انسان کا ذہن انتہائی چنچل ہوتا ہے اور حالات اور سیاق کے اعتبار سے انسان ایک ہی شئے کے بارے میں ایک خاص زمان میں کچھ اور تو دوسرے زمان میں کچھ اور طرح سے رائے قائم کرتا ہے جوش نے اسی لیے کچھ اہم فلسفیانہ مسائل پر مثلاً عقل اور عشق کے بارے میں کچھ اسی طرح سے سوچنے کی مثالیں فراہم کی ہیں جن کا ذکر ابھی آیا۔ گویا جوش کے یہاں تضاد ایک ایسی قدر ہے جس کو تقریباً سبھی نقادوں نے ان کی شاعری کا بڑا عیب گردانا ہے بالخصوص اس تضاد نے ان کے یہاں کم از کم ایک فارمولائی ارتقایا خیالات کی تنظیم کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایسا کلیم الدین صاحب، حضرت رشید حسن خاں وغیرہ وغیرہ لوگوں کا ماننا ہے۔ الغرض طوطے نے یہ پاٹھ مغرب سے پڑھا کہ نظام، تنظیم کائنات یا متن میں از خود موجود ہوتا ہے۔ یا فن کار اور صرف فن کار ہی پیدا کرتا ہے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں اشیاء میں تنظیم کی صورت دیکھنے والے کی مرہون منت ہے یا متن بغیر پڑھنے والے کے ادھورا ہے پھر اس کی تنظیم خود کار کیسے ہو سکتی ہے۔ متن کی فطرت کیا ہوتی ہے اس پر ان نقادوں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ جوش ہی کا متن کیا مادّی اعتبار سے ہر متن نامکمل اور متضاد ہوتا ہے۔ کم از کم بیک وقت دو آئیڈیولوجی کے اثر سے تیار ہوتا ہے ورنہ کیا بات ہے کہ آپ فیض کے یہاں کلاسیکی فکر، رومانی افکار کے ساتھ ساتھ مارکسی آئیڈیولوجی کی بازگشت بیک وقت محسوس کرتے ہیں۔
متن میں پائے جانے والے تضادات کو فن کار ہیئت کے انتخاب کے ذریعے قابل قبول بناتا ہے یعنی فکر کو خالص نثری یا شعری صداقتوں میں ڈھال دیتا ہے۔ پتہ یہ چلا

کہ ادبی متن بغیر آئیڈیولوجی کے اثر سے تیار ہو جائے ممکن ہی نہیں۔ ایسے میں اب یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہ رہا کہ جوش کے یہاں فلسفیانہ افکار ہیں یا نہیں۔ تضاد ہے یا نہیں کیونکہ کسی آئیڈیولوجی سے خالی متن کا تصور ہی محال ہے اور جہاں آئیڈیولوجی ہے وہاں تضاد کا ہونا لازمی ہے۔ ایسے میں ایک بات پھر ذہن نشیں رہے کہ شاعر یا ادیب کبھی کبھی اپنے متن کو آئیڈیولوجیکل سطح پر لاؤڈ بنا دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ قاری آسانی سے اُسے مفکر شاعر کے روپ میں پیش کر دیتا ہے جیسے اقبال۔ بہت سے ایسے شعرا بھی ہیں کہ جن کے یہاں فلسفہ وفکر یا آئیڈیولوجی کے بجائے جذبہ لاؤڈ ہو گیا ہے اور اس کی وجہ سے لہجہ بھی لاؤڈ ہو گیا ہے۔ نیتجتاً آئیڈیولوجی تہہ نشیں قدر بن گئی ہے اور گھن گرج میں فکر کانوں پڑی آواز سنائی نہ دینے کے مثل ہے۔ ایسے شاعر جوش ہیں جن کی گھن گرج اس لیے ان کی پہچان بن گئی کیونکہ جب بھی وہ انسانوں پر ظلم اور بربریت کے نظارے دیکھتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے حسین گلوں کی کیاریوں پر تیزاب چھڑک دیا ہے۔ ایسے میں وہ چیختے نہیں بلکہ سر کو ذرا اونچا کر دیتے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ جن لوگوں سے وہ مخاطب ہیں اس سماج کے لوگوں کے کانوں میں بے حسی، خود غرضی اور لالچ کی روئی ٹھونس دی گئی ہے۔ جوش ایک غلام ملک میں غربت، مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ، انسان کی اخلاقی گراوٹ کو دیکھ رہے تھے ایسے میں وہ نرا فلسفہ اپنی شاعری میں بگھار ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کا وجود اپنے عہد میں اسی لیے ایک مجسم جذبہ نظر آتا ہے۔ جذبوں کی تہذیب کے لیے جوش نے اپنی شاعری میں تو ان کے ساتھ کچھ Physical Signifiers فلسفیانہ یا مابعد الطبیعاتی مدلولات کو از سر نو Deconstruct کیا ہے۔ یہ فلسفیانہ مدلولات ان کی شاعری میں Ideologem یعنی فکری ذرات کی شکل میں گردش کرتے نظر آتے ہیں جو ان کے متن کے ڈسکورس کی معنی خیزی میں عمل آرا رہتا ہے جسے قاری متضاد بیانات کی صورت میں پاتا ہے اور اس میں تنظیم از روئے تقاضائے قرات تلاش کر لیتا ہے۔

جوش کے یہاں پائے جانے والے یہ فکری ذرات اپنے عہد کی سماجی، اقتصادی، سیاسی مسائل اور بحران کی سطح سے ملحق ہے اور یہ فکری ذرات جوش کے متن میں جذبے کی سطح پر ابھرے ہیں۔ غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ جوش کے متن میں تعین کنندہ کا رول سیاست ادا کرر ہا ہے یا کوئی اور آئیڈیولوجی یا جوش کو سرسری طور پر بھی پڑھنے والا قاری یہ کہہ سکتا ہے کہ جوش کی شاعری میں تعین کنندہ کا رول سراپا جذبات سے لبریز ایک راوی کرر ہا ہے۔ جس کے بیانات میں تضادات کی ایک کڑی سی پائی جاتی ہے۔ جنہیں قاری اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی ساختوں کی رو سے حل کر سکتا ہے جیسے ان کی شاعری کا ایک اہم (Metaphysical signifier) مابعد الطبیعاتی مدلول عقل و عشق ہے جو شعروادب نیز فلسفے میں صدیوں سے بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ آیئے جوش کی شاعری میں عقل و عشق سے متعلق تصورات پر ایک نگاہ ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ ان دونوں میں وہ کس کے حق میں ہیں یا کبھی حق میں یا کبھی خلاف ہیں یا وہ دونوں کی ضرورت اپنے اپنے سیاق یا اپنی ضرورت کے اعتبار سے سمجھتے ہیں اور قاری ان متضاد رویوں سے بددل ہو جاتا ہے یا وہ ان تصورات کی کوئی فلسفیانہ تاویل ڈھونڈھ لیتا ہے۔ مثلاً اس ضمن میں کئی ایک اشعار پیش کیے جائیں گے اور ان کا تجزیہ کیا جائے گا۔

آیئے ان کے فکری تضادات کی نوعیت کا تجزیہ کریں۔ سب سے پہلے عقل اور عشق سے متعلق ان کے متضاد شعری بیانات ملاحظہ فرمائیں۔ پہلا شعر دیکھیں

(ا)

فریاد ہو رہے ہیں اہلِ ہوس میں زائل
یہ عقل کے مبحث، یہ عشق کے مسائل

(نظم: ''فریاد'' مجموعہ ''سموم وصبا'' ص: ۷، جوش ملیح آبادی، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ، مفید عام پریس، دہلی)

(۲)

پھر عشق ناصبور کا پرتو ہے روح پر
پھر دل حضور عقل، پشیماں ہے کیا کروں

ایضاً،ص:۳۳،نظم:''کیا کروں''

۳۔

عقل اول کانپتی رہتی تھی جس کے روبرو
آج وہ دیوانگی خود لرزہ براندام ہے

نظم:''انجام''،ص:۵۲

۴۔

وہ ضرب عقل، بہ ایمائے دروریٔ بشر
بہ فرق بندگی ابلہانہ یاد کرو

نظم:''یاد کرو''ص:۴۸

۵۔

اب بھی حاوی ہیں علم پر اوہام
اب بھی طاری ہیں عقل پر جذبات

نظم:''وہی رفتار''،ص:۵۹

۶۔

ہر گماں میں اک یقین سا، ہر یقیں میں سو گماں
ناخن تدبیر بھی خود اک گتھی بے اماں

نظم:''اعتراف عجز''،ص:۱۲۵

۷۔

عقل کی دھوپ ڈھلی عشق کے تارے نکلے
برف مہتاب سے پگھلی تو شرارے نکلے

نظم: ''اعتراف عجز''، ص: ۱۲۵

یہ جملہ اشعار فقط ''سموم وصبا'' سے ماخوذ ہیں جو ان کی مذکورہ بالا نظموں میں عقل اور عشق سے متعلق فکری ذرّات (Ideologenic) کی صورت میں بکھرے ہوئے ہیں جنہیں قاری یکجا کر کے ایک رائے عقل و عشق کے فلسفے سے متعلق قائم کر سکتا ہے۔ عقل سے متعلق یہ اشعار ان کی نظموں میں کسی سیاق میں بجلی کی طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں آگے ان پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ نظموں سے ماخوذ مذکورہ بالا نظمیہ اشعار کے بعد کچھ اور نظموں کے بندوں اور اشعار پر غور کرتے ہیں۔ نظم ''نقاد'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

۸۔

شعر کیا عقل و جنوں کی مشترک بزم جمال
شعر کیا؟ عشق و حکمت کا مقام اتصال

(انتخاب: کلیات جوش، ڈاکٹر فضل امام، وجے پبلشر، گولا مارکیٹ، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص: ۹۰)

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

۹۔

اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کیے جاتا ہے

جوش کے ناقدین نے جوش کو رباعی کا اہم شاعر گردانا ہے اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جوش کے افکار اور ان کی شاعری کی رفعت دیکھنی ہو تو ان کی رباعیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پیش

خدمت ہیں کچھ رباعیاں جن میں عقل و عشق کے مابین موازنے کی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

۱۰۔

ہاں عقل سے ہشیار حکیمان کبار
کرتے ہیں یہ اعلان ہمارے دیں دار
اُتنا ہی بڑھے نرخ متاع ایماں
جتنا بھی ہو دیں کا حماقت مدار

۱۱۔

مقراض خود اپنے کو کتر جاتی ہے
جم جاتی ہے لو، آگ ٹھٹھر جاتی ہے
جتنا بھی ابھارتی ہے جس چیز کو عقل
اتنا ہی وہ غار میں اتر جاتی ہے

اور رباعی کا یہ شعر کہ:

۱۲۔

اشیا کے خواص تک ابھی آئی ہے عقل
اشیاء کے حقائق ہیں بہت دور ہنوز

اور پھر جوش کا یہ مشورہ ملاحظہ فرمائیں:

۱۳۔

احساس سے سوچیں نہ نظر سے سوچیں
گردے سے، نہ دل سے، نہ جگر سے سوچیں
سینے میں نہیں فکر تامل کا مقام
سینے سے نہیں، جناب سر سے سوچیں

("سموم وصبا" ص:۳۸۴)

عقل کو کیوں کر رہبر مانا جائے۔ جوش سے سنیے:

۱۴۔

اللہ رے خواہشوں کا اندھا طوفاں
حسرت، بلّوہ، ہراس، ہلچل، ہیجان
اُٹڈے ہوئے جذبات ہیں پیغام فنا
جب تک کہ نہ ہوں عقل کے زیرِ فرمان

(سموم وصبا،ص:۳۹۲)

عشق کی مذمت اور اہلِ عشق کی مذمت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

۱۵۔

یا حلم کی منزلوں میں گھبراتے ہیں
یا علم کی وادیوں سے کتراتے ہیں
کیوں شرم نہیں آتی نہیں اے عقل سلیم
جو لوگ ''عشق''، ''عشق'' چلاتے ہیں

(ایضاً،ص۳۹۳)

۱۶۔

دے بادہ کہ ہو عقل معطّل ساقی
اک شئے بھی نہیں یہاں مکمل ساقی
تفصیل کی مملکت میں دل تنگ ہوں میں
اجمال کی سلطنت میں لے چل ساقی

مذکورہ بالا نظمیہ اشعار اور رباعیوں کو ایک عام قاری بھی پڑھ لے تو آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ جوش عقل کی حمایت آنکھ موند کر نہیں کرتے اور دوسری بات یہ کہ ہم لوگ ان

کے اشعار کا مطالعہ اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ انہیں ہم تعقل پسند فلسفی مانیں یا نہ مانیں۔ جوش کی بڑائی اس میں نہیں کہ وہ نیچری ہیں یا غزالی کی طرح عقل پرست بلکہ جوش کی معنویت اور اہمیت اس لیے ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے فلسفوں کو شعری تفاعل میں پیش کرتے ہوئے اسے ایک شاعرانہ سوچ میں ڈھالا جس میں فلسفے کی سی خشکی نہیں ہے جبکہ احساس کی گرمی اور شعری جمالیات سے مثلاً شعر (۱) پر نگاہ دوڑائیں۔ فریاد کا اہل ہوس کی جماعت میں زائل ہونا اور ساتھ ہی ساتھ عقل کے مباحث اور عشق کے مسائل کا بھی زائل ہو جانا دراصل خفیف طنز بھی ہے اس امر پر کہ لوگ فلسفے تو بگھارتے ہیں اصل مسئلے یا زندگی کے مسئلے کا حل نہیں ڈھونڈھتے۔ گویا جوش کے نزدیک عقل اور عشق ہماری بحث کا محض ایک موضوع ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ عقل کو بحث کے کھاتے میں یعنی علم کے زمرے میں رکھا ہے اور عشق کو مسئلے کے زمرے میں رکھا ہے یعنی عشق کو سماجی قدر مانا ہے۔

کوثر مظہری

جوش کی فکری کشمکش

جوش کا نام آتے ہی ''شاعر انقلاب'' اور ''یادوں کی بارات'' یہ دونشانات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اگر اختصار سے کام لیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ چوں کہ ایک طرف ان کی شعری کائنات میں جوش و ولولہ، شوکت وطنطنہ ہے، اس لیے انھیں شاعر انقلاب کہا گیا۔ دوسری طرف چوں کہ ''یادوں کی برات'' ان کی زندگی کے نشیب وفراز اور سچ اور جھوٹ کا کچا چٹھا ہے۔ اس لیے ان دونوں کی حیثیت ان کے فن اور ان کی زندگی کے اہم Codes کی ہوگئی ہے۔ یہاں ''یادوں کی برات'' سے دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) ''شخصیت شناسی بھی بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے اور سالہا سال کی بے تکلف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا شرمیلا پن کم نہیں ہوتا۔ ...مجھ سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ تو اپنے آپ کو بھی جاننے کی طرح جانتا ہے؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ ہر چند بچپن سے لے کر پیرانہ سالی تک میں علی الاتصال و بہر دقیقہ اپنے ساتھ رہا ہوں، لیکن قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ در

حقیقت میں ہوں کیا:

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے

بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں''

(ص:۱۹۹)

(۲) ''جی ہاں میں نے عیاشی کی ہے، جی بھر کر۔ لیکن عشق بازی کی ہے جی سے گزر کر۔ عیاشی نے میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں۔ عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں۔ عیاشی نے لذت حواس سے دوچار کیا۔ عاشقی نے نشاط شعور سے سرشار کیا۔ عیاشی نے گردن کو نقرئی بانہوں سے اجالا۔ عاشقی نے گردن میں قوسِ قزح کا زرّیں ہار ڈالا۔'' (ص:۶۴۰)

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں جوش کا ذہنی میلان اور افتادِ طبع دونوں سمجھ سکتے ہیں۔ جوش پوری زندگی گزار، وہ بھی علی الاتصال بہر دقیقہ، یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کون ہیں۔ مگر جوش صاحب کو یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ وہ جس قطعیت کے ساتھ خود کو جاننا چاہتے ہیں وہ عرفانِ ذات کی منزل ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ جو لذت حواس اور جسم کی کھیتیاں لہلہانے کی غرض سے عشق کرے وہ عرفان ذات کی بات کیسے کر سکتا ہے؟ بات سطحی عشق کی ہے۔ ذوق بازارو ہے، خواہ خوبصورت اور ریشمی لفظوں کے پیرہن ہی میں کیوں نہ پیش کیا جائے۔

سچے اور گہرے عشق کا اظہار میر تقی میرؔ یوں کرتے ہیں:

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں

معلوم اب ہوا کہ بہت میں ہی دور تھا

یہ وہی خودی ہے جس کے گرد شاعر مشرق علامہ اقبال کی فکر اور شاعری گھومتی ہے۔ مان لیا جائے کہ جوش سطحی شاہد باز تھے مگر مشرقی تہذیبی قدروں کے پیش نظر اپنے نرے تجربات کا

یوں کھلا اظہار ضروری نہ تھا۔ یہ جرأت کی بات بھی ہو سکتی ہے مگر ایسی جرأت اظہار سے کیا حاصل جو نئی نسلوں کے ذہنوں کو منحرف کر دے؟ آیئے جوش کے چند اشعار دیکھیں جن میں منظر کشی اور حسن کا بیان ہے:

اپنی بیتی ہوئی راتوں کا خیال آتا ہے	جھومتی جب بھی اٹھتی ہے گھٹا قبلے سے
جس حال میں ہوں، حسن مرے پیش نظر ہے	لیلائے شب تار ہے یا حور سحر ہے

پروفیسر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''جوش نے حسن کو ایک مثبت اثر تصور کیا ہے جو جبلت کی پیداوار ہے، حسن سے انبساط حاصل ہوتا ہے تو اس کی واحد وجہ یہ۔ ہے کہ یہ خدا ہے، خالق ہے، حسن خدا ہے اور خدا حسن، ہر شے میں اسی کی تصویر نظر آتی ہے۔''

(آج کل، جوش نمبر، اپریل ۹۵ ص:۶۴)

اب ذرا غور کریں کہ شکیل الرحمٰن صاحب نے جس متصوفانہ تصور حسن کا ذکر یہاں کیا ہے، کیا اس کا اطلاق جوش جیسے ڈیڑھ درجن عشق فرمانے والے شاعر پر ہو سکتا ہے جس کا ذکر اوپر ''یادوں کی برات'' کے حوالے سے آچکا ہے۔ اس کے ذیل میں یہ ذکر کرنا کہ حسن سے انبساط اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ حسن خدا ہے اور خدا حسن یعنی اللّٰہ جمیل و یحب الجمال پھر یہ کہنا کہ ہر شے میں اسی کی تصویر نظر آتی ہے، درست نہیں، کیوں کہ یہ خالصتاً تصوف کا مسئلہ ہے جو جوش کی حد فکر سے باہر ہے۔ یہ بات بھی مطالعے سے مجھ میں آتی ہے کہ مذہبی اور سماجی قدریں جوش کی زندگی میں لغو کے مترادف تھیں اب آپ اسے کیا کہیں گے، کہ انہوں نے خود لکھا ہے:

''میرے باپ نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی مجھ کو ''وہ'' (مخنث) بنا دینے میں۔ میرے باپ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور قدرت کی حکمت و غیرت نے یہ بات کسی طرح بھی گوارا نہیں فرمائی کہ

میں شاعر کے بجائے مولانا بخش اللہ بن کر رہ جاؤں۔ مطرب کو چھوڑ کر موذن سے دل لگاؤں۔ مکھڑے کے تلوں سے نظر پھیر کر تسبیحوں کے دانے گھماؤں۔ صہبا کے شیشوں سے قرابت کا رشتہ کاٹ کر استنجوں کے ڈھیلوں سے اپنا شجرۂ نسب ملاؤں، شراب کے پیمانوں میں تیرنے کے بدلے وضو کے بدھنوں میں غوطے کھاؤں اور کالی زلفوں کی چھانوں سے بھاگ کر سفید داڑھیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤں۔'' (یادوں کی برات)

جملوں میں عجیب ربط ہے، مگر ہذیان سرائی بھی اسی کا نام ہے۔ مذہبی رواداری کا فقدان تو قابل گرفت نہیں مگر اس طرح مذہبی اقدار کی پامالی افسوس ناک ضرور ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی کٹر دہریہ شاعر بھی ایسی مربوط ہذیاں سرائی کر سکتا ہے۔ ناکامی اور انفعالیت اگر ان کی شاعری میں نہیں تو تعجب نہیں۔ یاس اور غم میں ٹسوے بہانا جناب جوش کا کام نہیں۔ اگر ان کی شاعری میں آہ و فغاں اور سوز و گداز نہیں تو اس کے اسباب میں انہوں نے ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے اٹھارہ بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے رہے تھے جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا۔ اس کا اظہار انہوں نے پروفیسر احتشام حسین کو لکھے ایک خط میں کیا تھا جو ان کی کتاب ''ذوق ادب اور شعور'' میں موجود ہے۔ اس طرح کے بیانات سے اور ''یادوں کی برات'' کے صفحات سے جوش کی شخصیت کا جو روپ ہمارے سامنے آتا ہے وہ ایک طنطنہ دار اور شوخ وشنگ عاشق کا روپ ہے، جس کی ذہنی ساخت میں آزاد خیالی اور سماجی قیود، نیز مذہبی عوامل کی بندشوں سے بے فکری ظاہر ہوتی ہے۔ استنجوں کے ڈھیلوں، تسبیح کے دانوں اور وضو کے بدھنوں سے اپنا رشتہ جوڑنا کارِ عبث تو سمجھتے ہی ہیں ساتھ ہی اس ڈگر پر چلنے کو وہ ''مخنث'' بننے کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ ان

کا نظریۂ خودی اقبال کی طرح نہیں کہ اعلان کرتے پھریں:

خودی کا سرِنہاں لا الٰہ لا اللہ
خودی کا تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اور نہ ہی جہانِ عشق و محبت میں وہ میر تقی میر کی طرح منہ لٹکائے کوبہ کو بھٹکنے کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ میر کی طرح یہ نہیں کہتے کہ:

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

جوش کے یہاں دراصل "عشق" کا مفہوم "عیاشی" ہے۔ میرؔ بے چارے عشق کو "عشق" سمجھتے ہیں بلکہ کہیں کہیں "عبادت" کے برابر بھی تصور کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے میر زندگی بھر گھل گھل کر پگھلتے رہے اور جوش اٹھارہ میں سے ۱۷ (سترہ) معشوقوں کی نقرئی بانہوں کے ہالے میں محصور رہے۔ جسم کی کھیتیاں لہلہاتی رہیں اور وہ نشاطِ شعور سے سرشار ہوتے رہے۔

میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ جوش کی شخصیت مجروح کی جائے۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس کا جواز جوش کی شاعری اور نثری تحریروں میں موجود ہے۔ چند خطوط بھی اس نقطۂ نظر کی غمازی کرتے ہیں مگر ان منفی رویوں کے باوجود جوش کی فطرت کا عقدہ کھلتا نہیں۔ انہوں نے جس طرح اسلامی عقائد اور عوامل کا مذاق اڑایا ہے اس سے لگتا ہے کہ ان کے دل پر مہر سی لگ گئی تھی۔ مگر جب بھی وہ اللہ کی آیات و صفات کا ذکر کرتے ہیں تو ایک بار پھر اپنے نقطۂ نظر پر غور کرنا پڑتا ہے۔ نظم 'مناجات' کا یہ حصہ دیکھیے:

یہ سب ایک ہی اصل کے ہیں جہات — حجابات، آیات، اسماء، صفات
یہ تابندہ شبنم، یہ رقصندہ آب — یہ گل ریز گلشن، یہ گلگوں سحاب
یہ اعلان و اظہار و کشف و ظہور — یہ دراج و طاؤس و مرغ و طیور

خیابان و بستان وہ. کوہ و کمر یہ لولو و مرجان و لعل و گہر

قوالی اور عرس کو بھی اسلامی تہذیب کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ جب کہ اسلامی زندگی اور رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرام کے زمانے میں ان باتوں کا گزر نہیں۔ جوش کو بھی یقین ہے کہ اس سے وحدانیت مجروح ہوتی ہے اور ربوبیت کا چہرہ مسخ ہوتا ہے۔ قوم کے ٹھیکہ داروں کی اس روش پر جوش نے کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کی نظم ''کافر نعمت مسلماں'' (شعلہ و شبنم سے ماخوذ) سے چند مصرعے پیش کیے جاتے ہیں:

آج کتراتا ہوا وحدانیت کی راہ سے
یہ مرادیں مانگتا ہے کون غیراللہ سے
جھومتا ہے کون قوالوں کے ہر اک بول پر
کون یہ عرسوں پہ پہروں ناچتا ہے ڈھول پر
مومن و مسلم کا بخشا تھا تمہیں اس نے خطاب
شیعہ و سنی کا نازل کر لیا تم نے عذاب
بندگی اصنام کی ٹھہرائی تھی اس نے حرام
اور تم ہر مقبرے کو جھک کے کرتے ہو سلام

اس کے علاوہ جوش ماتم حسین کرنے والوں کو بھی متنبہ کرتے ہیں جہاں سیاسی رنگ میں شور و شین دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی نظم ''اے مومنان لکھنو'' سے یہ دو مصرعے:

منبر سبط نبیؐ پر اور سیاسی شور و شین
مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ سوگوارانِ حسینؑ

''امام باڑہ'' آج بھی سیاحوں کی تفریح گاہ ہے۔ جوش امام باڑوں کی حرمت کو پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ محرم کی آٹھویں اور نویں کو چراغاں کیا جانا اور بڑے پیمانے پر امام باڑے میں اہتمام کیا جانا اور صاحب لوگوں کے لیے ہی اس کا مختص کیا جانا، ایک عبرت ناک پہلو ہے۔ جوش کی نظم ''متولیان وقف حسین آباد سے خطاب'' سے یہ حصہ

ملاحظہ کیجیے:

مشعلوں میں جس جگہ خونِ شہیداں کا ہو رنگ
سیر کرنے کو بلائے جائیں واں اہل فرنگ
یہ تملق یہ خوشامد، یہ زبوں اندیشیاں
غم کدہ مسلم کا ہو نصرانیوں کا بوستاں
داغ ہائے دل میں کھولا جائے میخانہ کا باب
قہقہے ہوں آنسوؤں کی انجمن میں باریاب
بام شیون پر کھلے موج تبسم کا علم
خون کے قطروں پہ اور ارباب عشرت کے قدم
کشتیِ صہبا چلے اہل وفا کے خون میں
آخری ہچکی بھری جائے گر یموفون میں

جوشؔ کے دل میں کہیں نہ کہیں اسلامی تہذیب اور ثقافت نیز سچی وحدانیت کی ضو سویر چھپی تھی جو ابھر کر نہ آسکی۔ وہ عملی طور پر اسلامی امور کے پاسدار تو نہ تھے لیکن وہ تاریخ اسلامی سے ایک طرح کی عقیدت رکھتے تھے۔ نظم ''نوحہ آگاہی'' کا مقطع دیکھیے:

جوش سا کافر و کافر گرو کافر گفتار　　　　فطرتاً صاحب ایماں ہے یہ معلوم نہ تھا

وہ رسول اللہؐ کے بارے میں کہتے ہیں:

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری　　　　رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری

اس کے علاوہ بہت سی نظمیں اور بہت سی نظموں کے کچھ حصے ایسے ملتے ہیں جن سے ان کے اسلامی افکار سے گہرے شغف کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے سورۂ رحمٰن کی چند آیات کا آٹھ بندوں میں منظوم ترجمہ بھی پیش کیا تھا۔ ایک بند ملاحظہ کیجیے:

یہ سحر کا حسن یہ سیارگاں اور یہ فضا

یہ معطر باغ یہ سبزہ یہ کلیاں دل ربا
یہ بیاباں یہ کھلے میدان یہ ٹھنڈی ہوا
سوچ تو، کیا کیا، کیا ہے تجھ کو قدرت نے عطا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

تعجب ہے اللہ کے آیات وصفات کا شمار کرنے اور تاریخ اسلامی اور رسول اکرمؐ سے عقیدت کا اظہار کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں:

مگر اے خداوند رب جلیل
ملی مجھ کو اب تک نہ کوئی دلیل
کہ ہو جس سے آئینہ راز صفات
کہ ثابت ہو جس سے تری پاک ذات

فکری کشمکش کی مثال نظم ''کیا معلوم'' بھی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

کوئی دارائے جاں ہے؟ کیا معلوم — یا فقط داستاں ہے؟ کیا معلوم
کیا حدودِ یقیں میں ہے خلّاق — یا سراسر گماں ہے؟ کیا معلوم
آرزو تھی خدا کو یا حاجت — کیوں وجود جہاں ہے؟ کیا معلوم

اسی طرز فکر کو دیکھتے ہوئے:

''احتشام حسین جوش ملیح آبادی. انسان اور شاعری میں لکھتے ہیں:

''جوش کی شاعری ان کے ذہنی ارتقا کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کے جلال و جمال، حسن و قبح اور بلندی و پستی کو بڑی خوبی سے منعکس کرتی ہے۔ ان کی ذہنی کشمکش، فکری واماندگی، تصور پرستی، سماجی عقاید ہر ایک کی جھلک ان کی ہزار ہا نظموں میں بکھری پڑی ہے۔'' (ص:۱۱۵)

اور آگے بڑھیں تو ہم پھر وہیں چلے آتے ہیں جہاں سے جوش کے ذہنی میلان کا ذکر شروع

ہوا تھا۔ عجیب طرح کی کشمکش موجود ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جوش پوری زندگی تذبذب اور کشمکش کے دائرے سے باہر نہیں آسکے تو بے جا نہ ہوگا۔ کبھی وحدانیت اور رسالت کا اقرار ہے تو کبھی کھلم کھلا انکار۔ جسے لوگ جوش کی انقلابیت کہتے ہیں دراصل اس آدمی کی ذہنی و فکری کشمکش کا المیہ ہے کہ جگنو کبھی اس ڈال پر چمکتا ہے تو کبھی اُس ڈال پر۔ جوش پھر وہیں آجاتے ہیں جہاں سے چلے تھے:

یقین بن کے جب تک نہ آئے گا تو
تو اے وہمِ دیرینۂ اہل ہو
رہِ کفر کی خاک چھانے گا جوش
نہ مانا ہے تجھ کو نہ مانے گا جوش

جوشؔ کی رباعیاں

جوشؔ بیسویں صدی کے نمائندہ اور رجحان ساز شاعر ہیں۔ وہ اردو ادب میں لہجے کی صلابت، موضوعاتی تنوع، متضاد رویہ، جذبہ، تشکیک اور بے پناہ لفظی سرمایے کی بنا پر منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ جوشؔ صحیح معنوں میں اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں نوکلاسیکیت (Neo-Classics) کے آثار ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موجود کلاسیکی اور جدید رویوں کے خوبصورت امتزاج کے ساتھ لہجے کی جو صلابت ملتی ہے وہ نئے شعری آہنگ کے لیے راہیں ہموار کرتی ہے۔

جوشؔ نے اردو ادب میں تقریباً تمام مروجہ اصناف اور شعری ہیئتوں کو تخلیقی اظہار کے لیے بروئے کار لایا ہے۔ غزل، نظم، مرثیہ، قطعہ اور رباعی کا اتنا وقیع سرمایہ انھوں نے اردو ادب کو دیا ہے جس سے ادبی تاریخ مرتب کرنے والا کبھی اغماض نہیں برت سکتا ہے۔ ان کی فنی اور فکری تربیت اگرچہ لکھنؤ کے روایتی دبستان کے تحت ہوئی ہے اس کے باوجود ان کی غزل میں نیا لب ولہجہ اور ایک نوع کی تازگی نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیں فکروفن کی پختگی اور تازہ کاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں اور موضوعاتی سطح پر وسیع کینوس رکھتی ہیں۔ جدید مرثیے

کی بنیادیں مستحکم کرنے میں جوشؔ نے انتہائی اہم رول ادا کیا ہے۔ بقول فضل امام:

> ''جوشؔ نے نئی راہ نکالی اور اردو مرثیے کو عصری حسیت اور تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کی افادیت اور اہمیت کو بیسویں اور اکیسویں صدی کے لیے بھی لازوال بنادیا۔ اس طرح سے جوشؔ نے اردو مرثیے کی تاریخ کو بیکراں وسعتوں سے ہمکنار کر دیا ہے''۔[1]

جوشؔ اردو ادب میں جس طرح منفرد نظم گو شاعر ہیں اسی طرح وہ اہم رباعی نگار بھی ہیں۔ انھوں نے جس سلیقہ مندی سے دیگر مروّجہ اصناف اور شعری ہیئتوں کو تمام تر فنی لوازمات کے ساتھ اپنے تخلیقی اظہار کے لیے اپنایا ہے بالکل اسی طرح انھوں نے صنفِ رباعی کے لامحدود امکانات کو بھی تخلیقی اظہار کے لیے آزمایا ہے۔ داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت امتزاج، بندش کی چستی، وحدتِ تاثر، لطفِ بیان، تسلسلِ فکر، نادرہ کار تشبیہات اور حسین استعارات جوشؔ کی رباعیوں کے خاص اوصاف ہیں۔ انھوں نے اس صنفِ سخن کو نہ صرف ایک محدود فضا سے باہر نکال کر موضوعاتی تنوّع پیدا کیا بلکہ انسانی جذبات و احساسات، عقل و وجدان اور جنون و خرد کی نئی نئی جہتیں تلاش کر کے ان کے تمام پہلوؤں کو اجاگر بھی کر دیا۔ جوشؔ نے صحیح معنوں میں رباعی کو جدید نظم کے برابر کھڑا کر کے اس میں زندگی کی وسعت پیدا کر دی ہے۔

جوشؔ حقیقی معنوں میں اعلیٰ پائے کے رباعی نگار ہیں۔ انھیں اردو شعرا میں یہ امتیازی وصف حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ امداد امام اثرؔ نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی رباعی کو مدِ نظر رکھ کر یہ رائے دی تھی:

> ''حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر دو بزرگوار رباعی نگاری کے اعتبار سے بہت قابلِ قدر ہیں بلکہ اردو شعرا میں بھی یہی حضرات ہیں جنھوں نے رباعی نگاری کی شرم رکھ لی ہے''۔[2]

اگر اُن کے پیشِ نظر جوشؔ کی رباعیاں ہوتیں تو وہ ضرور اپنی اس رائے پر نظرِ ثانی کرتے۔

جوشؔ کی رباعیوں میں دو پہلو ایک فنی (Artistic) اور دوسرا جمالیاتی

(Aesthetic) موجود ہیں۔ ان میں ایک طرف اصول، شعور، غور و فکر اور معنی کے تشریحی نظام سے، دوسری طرف جمالیاتی قدروں کے تحت وجدان، ذوق، لاشعور، جذبۂ احساس، کلچر اور زبان کی روایت اور مزاج سے بھی واسطہ جا بجا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ ان کی رباعیوں میں فنی دقائق تخلیقی تجربوں کے تابع مہمل بن کر اُبھر آتے ہیں۔

جوشؔ کی رباعیاں زبان اور بیان کی سطح پر اعلیٰ اور معیاری ہیں۔ وہ ایک ایسے ادبی ماحول کے پروردہ ہیں جہاں لفظ اور محاورے کے محل استعمال پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ادبی خانوادے کے چشم و چراغ بھی تھے۔ ان کے پردادا فقیر محمد خاں گویاؔ نہ صرف صاحب دیوان شاعر تھے بلکہ ایک علمی شخصیت اور وہ ناسخؔ کے خاص شاگرد بھی۔ ان کے دادا اور والد بھی سخن داں و سخن شناس تھے۔ اس طرح زبان کی صفائی، بندشِ الفاظ، تراش خراش اور محاورہ بندی ان کو وراثت میں ملی تھی۔ اس ادبی اور لسانی پس منظر کے بارے میں جوشؔ کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

طبعِ رسا کی زلف دوتا میں گندھا ہوا
میرا تسلسلِ ادبِ خانداں بھی ہے
تہذیبِ فکر کشورِ دہلی کے ساتھ ساتھ
فردوسِ لکھنؤ کی کھنکتی زباں بھی ہے

جوشؔ کو ابتدائی مشق کے دوران لسان الہند عزیزؔ لکھنوی سے مشورۂ سخن کرنے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ وہ لکھنؤ کے قدیم رنگِ سخن کی آخری یادگار تھے، انھیں نہ صرف زبان و بیان پر کامل قدرت حاصل تھی بلکہ اپنے پیش رو اساتذہ کی طرح شستہ و رفتہ زبان استعمال کردی ہے اور لکھنؤ کی مستند اور ٹکسالی زبان کو اپنے اظہار کے دوران ترجیح دی۔ اس فنی اور فکری ماحول میں جوشؔ نے مرصع کاری کا فن سیکھا۔ البتہ ہر بڑا تخلیقی ذہن اپنے تخلیقی اظہار کے لیے خود اپنی زبان خلق کرتا ہے، جوشؔ نے بھی وہی کیا۔ ان کی زبان اتنی پختہ اور شستہ و رفتہ ہے کہ معاصر ادب میں اس کی نظیر ملنا محال ہے اور ہمارے موجودہ دور کے تخلیق کاروں نے ان سے لسانی داؤ پیچ سیکھے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد حسن کی رائے سے مزید وضاحت ہوتی ہے:

''جوشؔ کا کلام لفظوں کی انمول اور بے مثال قوسِ قزح ہے رنگ،
احساس اور تصور کا ایسا خزانہ جس کی مثال سوداؔ، نظیرؔ اور انیسؔ کے علاوہ
ہزار سال کے ادب میں ناپید ہے''۔[۳]

ظفر اقبالؔ کے مجموعے 'گلافتاب' کی غزلوں کی زبان اور جوشؔ کی نظم 'پند نامہ' اس کا بیّن ثبوت ہے۔ جوشؔ نے زبان و بیان کے جو تجربے کیے ہیں اس کی کامیاب تقلید 'گلافتاب' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد حسنِ بیان اور لطفِ زبان کے علاوہ ٹکسالی اور مستند زبان سے اگر کسی رباعی نگار نے اپنی رباعیوں کو آراستہ کیا ہے تو وہ جوشؔ ہیں۔ نئے نئے الفاظ اور محاوراتی زبان کو جس سلیقے سے انھوں نے رباعی میں جگہ دی ہے وہ ان کا فقید المثال کارنامہ ہے۔ یگانہؔ چنگیزی نے بھی لکھنؤ کے مخصوص محاوروں کو اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے مگر وہ ان سے لطفِ سخن پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ ایک خود آگاہ تخلیق کار کی طرح جوشؔ اپنے اس منفرد کارنامے سے ضرور واقف تھے، ان ہی باتوں کو مدِ نظر رکھ کر جوشؔ نے کہا ہے:

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
ذرّات کو چھوڑ کر حریفوں کے لیے
خورشید پہ بڑھ کر ہات ڈالا ہم نے

باقی نہیں ایک شعور رکھنے والا
صہبائے کہن سال کا چکھنے والا
کیا اپنے معانی کا میں رونا روؤں
الفاظ نہیں کوئی پرکھنے والا

جوشؔ کو زبان و بیان پر زبردست قدرت حاصل ہے اسی وجہ سے ان کی ہر رباعی فنی ارتکاز، وحدتِ فکر، بے ساختہ پن، زورِ بیان اور قادرالکلامی کا ایک خوبصورت مرقع بن کر ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ جس موضوع کو بھی اپنی رباعیوں میں پیش کرتے ہیں ان کو فنی

تمثیلیت اور بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

ممنوع شجر سے لطف پیہم لینے
عصیاں کی گھنی چھاؤں میں پھر دم لینے
آواز دو کاشمیر آپہنچا جوشؔ
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

وہ آئیں تو ہوگی تمناؤں کی عید
مے زہرہ بنی تو روحِ مستی ناہید
ارمان بڑے گلے میں ڈھولک ڈالے
تھرکی کولھے پہ ہات رکھ کر امید

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سر تا بقدم خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہر مبیں غروب ہوجاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

جوشؔ کے معاصرین خصوصاً رواںؔ، فراقؔ، امجدؔ، یگانہ کی رباعیوں میں بھی اگرچہ فنی تمثیلیت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ البتہ وہ گرج، زور، احتجاج اور وفور جو جوشؔ کی رباعیوں کا خاصہ ہے ان کے یہاں ناپید ہے۔

جوشؔ کی رباعیاں ان کی شخصیت کا ایسا آئینہ نما ہے جس میں ہم جوشؔ کو اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے صحیح طور سے ان کی رباعیوں پر صادق آتی ہیں جو انھوں نے ان کی نظمیہ شاعری کے بارے میں دی ہے:

"شخصیت کے جلال و جمال، حسن و قبح اور بلندی و پستی کو بڑی خوبی سے منعکس کرتی ہے، ان کی ذہنی کشمکش، فکری واماندگی، تصور پرستی، سماجی عقائد ہر ایک کی جھلک ان کی ہزار ہا نظموں میں بکھری پڑی ہے"۔[۴]

اس طرح جوشؔ کی رباعیوں میں ایک ایسا شعری کردار اُبھر کر سامنے آتا ہے جو روایات سے متصادم ہے اور سماج، قانون اور زندگی کے دیگر لوازمات سے متعلق ایک مثبت سوچ رکھتا ہے:

اس دہر میں اک نفس کا دھوکا ہوں میں
بجلی ہوں، بگولا ہوں، چھلاوا ہوں میں
گھبرائی ہوئی ہے جوشؔ روحِ تحقیق
ہر ذرّہ پکارتا ہے 'دنیا' ہوں میں

یہ بزم گہِ عمل ہے بے نغمہ و صوت
اس دائرے میں ولولۂ روح ہے فوت
یک رنگی و یکسانیِ اسلوبِ حیات
دراصل ہے ایک سانس لیتی ہوئی فوت

جوشؔ نے تکنیکی سطح پر رباعی کے لامحدود امکانات کو آزمایا ہے۔ اس میں ڈرامائی عناصر شامل کر کے اپنے اسلوب اور طرزِ بیان کو زیادہ پُر اثر بنایا ہے۔ وہ عموماً چھوٹے چھوٹے فقروں سے مکالمے کا کام لیتے ہیں۔ اس طرزِ بیاں کے نمونے خیامؔ اور سرمدؔ کی رباعیوں میں بھی ملتے ہیں۔ اس تکنیک کے ذریعے ایک چھوٹی سی رباعی ایک مکمل اور کامیاب ڈراما بن جاتی ہے اور بغیر نام کے کردار ابھرتے ہیں اور اپنا مکالمہ بول کر چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کی رباعیاں فنی محاسن کے ساتھ ساتھ جمالیاتی کیف واثر کا مرقع بن جاتی ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

کل رات گئے عین طرب کے ہنگام
سایہ وہ پڑا پشت سے آ کر سر جام
تم کون ہو؟ جبریل ہوں، کیوں آئے ہو
سرکار! فلک کے نام کوئی پیغام

بے نغمہ ہے اے جوشؔ ہمارا دربار
اب عالمِ ارواح میں ٹک آؤ بھی یار
یہ کون بلا رہا ہے، ہم ہیں اے جوشؔ
آزاد، شررؔ، رفیعؔ شاعرؔ، ابرار

بندے! کیا چاہتا ہے؟ دام و دینار
یا دولتِ پائندۂ زلف و رخسار
معبود! نہیں نہیں کوئی چیز نہیں
الّا آگاہیِ رموز و اسرار

جوشؔ کی نظموں کی طرح ان کی رباعیاں بھی قوی اور توانا احساس کی پیداوار ہیں۔ موضوعاتی سطح پر ان کی رباعیوں کی کئی تہیں ہیں۔ ان سب میں زیادہ دبیز تہ حرکت و عمل کا پیغام ہے۔ وہ اپنی رباعیوں کا ڈھانچہ ان مظاہر پر کھڑا کرتے ہیں جن سے زندگی میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ان کی رباعیوں میں گرج اور بلند آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔ اپنی فکر کے اس حرکی پہلو کے ڈانڈے وہ نطشہ (Jietzsche) سے ملاتے ہیں۔ وہ نطشہ کی طرح بے اصول اور بے راہروی کے سخت مخالف ہیں۔ نطشہ نے دنیا کو فوق البشر (Super man) کا تصور دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر انسان اپنی داخلی صلاحیتوں کو ترقی دے کر فوق البشر بن سکتا ہے۔ وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر جانچتا ہے اور فکر انسانی کو تقلید کی بندشوں سے آزاد کردینا چاہتا ہے۔ وہ اس دور میں حریت فکر کا پیغام دنیا کو دیتا ہے جب فلسفہ اور سائنس دونوں حریت فکر کے منکر اور جبریت کے علمبردار تھے۔ وہ کائنات کی اصل مادہ یا مادی نہیں گردانتے ہیں بلکہ ارادہ یا خواہشِ اقتدار کو گردانتے ہیں۔ فوق البشر کا ظہور اور تنازع للبقا کا مطلب ماحول کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے جنگ کرنا اور اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنا ہے اس لیے صرف وہی افراد باقی رہیں گے جو باقی رہنے کے لیے جدوجہد کریں گے، اس طرح نطشہ کی رائے میں اصلِ حیات خواہشِ زیست نہیں بلکہ خواہشِ اقتدار ہے۔ جوشؔ کی زندگی کا اصلی مقصد جدوجہد اور حصولِ اقتدار کو ہی گردانتے ہیں۔ وہ زندگی

کے بارے میں نطشہ کی طرح مثبت اندازِ نظر رکھتے ہیں:

قانون نہیں کوئی فطرت کے سوا
دنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور مولا بن جا
معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا

جینا ہے تو جینے کی محبت میں مرو
غارِ ہستی کو نیست ہو ہو کے بھرو
نوعِ انساں کا درد اگر ہے دل میں
اپنے سے بلند تر کی تخلیق کرو

انساں کی تباہیوں سے کیوں ہے دلگیر
کا کل میں بدل جائے گی کل یہ زنجیر
اس آدمِ فرسودہ کے زیرِ تخریب
اک آدمِ نو کی ہورہی ہے تعمیر

جوشؔ کے نزدیک فوق البشر کو پیدا ہونے میں ماحول، مذہب، قانون اور تہذیب مانع ہیں کیوں کہ ان کی تشریع عملی جامہ پہنانے والے اور تاویل کرنے والے، ان کی اصل روح سے واقف نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ماحول، قانون اور تہذیب کے خلاف احتجاج کرتے ہیں:

آزادیِ فکر و درسِ حکمت ہے گناہ
دانا کے لیے نہیں کوئی جائے پناہ
اس اژدرِ تہذیب کے فرزندِ رشید
یہ مذہب و قانون، عیاذاً باللہ!

"للہ ہمارے غرفۂ دیں کو نہ چھوپ"
"بل کھائیں گے مجتہد، بگڑ جائیں گے پوپ"
یہ کہتی چلی آتی ہیں لاکھوں عقلیں
پہنے ہوئے آبا کے پُرانے کنٹوپ

جوشؔ تنازع للبقا میں کامیاب انسان کو فوق البشر کی اعلیٰ مثال کہہ دیتے ہیں اور اس کی بیعت کرنا فخر کا باعث سمجھتے ہیں:

اے مردِ خدا نفس کو اپنے پہچان
انسان یقین ہے اور اللہ گمان
میری بیعت کے واسطے بات بڑھا
پڑھ کلمہ لا الٰہ الا انسان

جوشؔ کی رباعیوں میں زندگی پرست رجحانات سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں بصری پیکر وافر تعداد میں پائے جاتے ہیں اگرچہ سمعی اور لمسی پیکر بھی موجود ہیں۔ ان سے ان کے زندگی پرست رجحانات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اپنے ماحول اور اطراف و جوانب سے ان کا جو تعلق تھا وہ ظاہر ہو جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے یہاں خورشید، ہاتھوں، ذرات، انسان، دن رات، کامگار، اژدر، موت، سانس، حسن، بے بسی جیسے الفاظ کا استعمال بہ تکرار پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے اسلوب کو زیادہ سے زیادہ پُراثر بنانے کے لیے مختلف شعری صنعتوں کے علاوہ تکرارِ لفظ سے اپنے اسلوب اور شعری اظہار میں جان ڈال دی ہے:

اے زاہدِ حق شناس و اے عالمِ دیں
حضرت کا مقام ہے فقط خلدِ بریں
انساں ابھی چل رہا ہے گھٹنوں گھٹنوں
اور آپ کو ہے قربِ قیامت کا یقیں

خود سے نہ اُداس ہوں نہ مسرور ہوں میں
بالذات نہ روشن ہوں نہ بے نور ہوں میں
مختار ہے مختار ہے مختار ہے تو
مجبور ہوں مجبور ہوں مجبور ہوں میں

جوشؔ کی رباعیوں کا ایک اہم پہلو منظر نگاری ہے۔ مناظرِ فطرت کے ساتھ ان کو جو لگاؤ ہے اُس کا باضابطہ اظہار رباعیوں میں بطورِ خاص ہوا ہے۔ انھوں نے تشبیہات اور استعارات کے ذریعے زبردست منظر نگاری کی ہے۔ بقول سیّدہ جعفر:

> ''جوشؔ کو منظر نگاری پر غیر معمولی قدرت تھی۔ نئی تشبیہات اور اچھوتے استعاروں اور تلازموں کی معنویت، جدید اور پُراثر ترکیبیں، لفظ کی مزاج شناسی اور حروف واصوات سے بنائے ہوئے نقوش جوشؔ کی تصویروں کو گویا اور متحرک بنا دیتے ہیں۔ جوشؔ مناظر و مظاہر کو مجسم بنا دیتے ہیں''۔[5]

جس طرح ''محاکاتی کیفیت'' انھوں نے مناظر و مظاہر میں پیدا کی ہے اگر اس کو ادبی مصوری کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ منظر نگاری کے نمونے اردو کے دیگر اصناف خصوصاً مرثیہ اور مثنوی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں مگر جوشؔ سے پہلے اس طرح رباعی میں منظر نگاری کم و کاست ہی موجود تھی۔ اس سے رباعی میں زیادہ سے زیادہ مقامیت پیدا ہوگئی ہے، البتہ بقول ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین:

> ''مناظر قدرت کی تصویر کشی کے وقت نیچرل حالات کا نقشہ جوشؔ کے جذبات کی رنگ آمیزی میں کسی قدر دھندلا ہو جاتا ہے، ان کا پیمانۂ قلب جذبات سے اس قدر لبریز ہے کہ کائنات کے ہر ذرے پر وہ جذباتی نگاہ ڈالتے ہیں''۔[6]

برسات ہے دل ڈس رہا ہے پانی
فرقت میں تری جھلس رہا ہے پانی

دل میں کبھی چبھتا ہے کلیجے میں کبھی
آڑا ترچھا برس رہا ہے پانی

ساحل، شبنم، نسیم، میدان، طیور
یہ رنگ، یہ جھٹ پٹا، یہ خنکی، یہ سرور
یہ رقصِ حیات اور دریا کے اُدھر
ٹوٹی ہوئی قبروں پہ ستاروں کا یہ نور

ناگن بن کر مجھے نہ ڈسنا بادل
باراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اس دیس میں اب کی نہ برسنا بادل

جوش کی رباعیوں کے سرمائے میں اہم سرمایہ ان رباعیوں پر مشتمل ہے جن میں زندگی اور عقل وخرد کے مسائل خمریاتی انداز میں بیان کیے گئے ہیں:

> ''امجد حیدرآبادی کی رباعیاں جس طرح اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے سرمد سے قریب تر ہیں بالکل اسی طرح جوش اپنی رندانہ جسارت، جوش بیانی، نکتہ آفرینی، فنی پختگی، شاعرانہ مصوری اور طنزیہ لب ولہجے کی مناسبت سے عمر خیام سے قریب تر ہیں''۔[۷]

شراب اور متعلقاتِ شراب کے ذریعے اپنی بات کو موثر ڈھنگ عطا کرنا اردو، فارسی اور عربی شعرا کا اہم رجحان رہا ہے۔ عربی میں اخطل اور ابونواس اور فارسی میں حافظ وخیام نے اس کا سہارا لے کر شاعری کے دلکش اور لطیف نمونے پیش کیے ہیں۔ اردو غزل میں خمریاتی شاعری ریاض خیرآبادی اور عبدالحمید عدم کے یہاں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ رباعی میں خمریہ مضامین پر سب سے زیادہ رباعیاں جوش کے یہاں ملتی ہیں۔ اس بنیاد پر ''اگر ہم بقول سلام سندیلوی جوش کو اردو کے خیام کا لقب دیں تو بیجا نہ ہوگا''۔[۸] جوش خمریات

کے پردے میں خیام کی طرح حیات وممات اور زندگی کے دیگر نکات کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ البتہ وہ شراب کو بادۂ عرفان میں نہیں بدلتے ہیں بلکہ عام پُرتگالی شراب ہی رہنے دیتے ہیں:

مفلوج ہر اصطلاح ایماں کردے
فردوں کو رہنِ طاقِ نسیاں کردے
ساقی ہے مغنّی ہے چمن ہے مے ہے
اس نقد پہ سو اُدھار قربان کردے

کیا شیخ ملے گا گل فشانی کرکے
کیا پائے گا توہینِ جوانی کرکے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انھیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کرکے

باغوں پہ چھا گئی جوانی ساقی
سنکی وہ ہوائے زندگانی ساقی
ہاں جلد انڈیل جلد دہکتی ہوئی آگ
آیا وہ برستا ہوا پانی ساقی

ہر علم ویقین ہے اک گماں اے ساقی
ہر آن ہے اک خوابِ گراں اے ساقی
اپنے کو کہیں رکھ کے میں بھولا ہوں ضرور
لیکن یہ نہیں یاد کہاں اے ساقی

جوشؔ کی وہ رباعیاں کافی جاندار ہیں جن میں انھوں نے طنزیہ اور تضحیک کا پہلو اپنایا

ہے اور ایک ہوش مند طنز نگار کی طرح اپنے دور کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے سماج میں پیدا شدہ ناہمواریوں پر نشتر زنی کی ہے۔ ادب کا کام نظامِ فکر تیار کرنا نہیں ہے بلکہ نظامِ فکر کے لیے بنیادی مواد فراہم کرنا ہوتا ہے اور اپنے معاصرین کو اپنے عصر کی ناہمواریوں اور ناآسودگیوں کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ ایک دور کی تاریخ لکھنے والا جہاں خاموش رہتا ہے وہاں اس دور کا ادب بولتا ہے۔ سوداؔ کا قصیدہ 'تضحیکِ روزگار' اس کی عمدہ مثال ہے۔ جوشؔ نے اپنے دور کی ناہمواریوں اور ناآسودگیوں کے ساتھ قدروں کی شکست وریخت پر زبردست احتجاج کیا ہے جو ان کی ہوش مندی اور سماجی شعور کا بیّن ثبوت ہے۔ اس نوع کی رباعیوں میں گرج، تیکھاپن اور تندی سب سے زیادہ نظر آتی ہے:

تھے پہلے کھلونوں کی طلب میں بیتاب
پھر حسن کے جلووں سے رہے بے خور و خواب
اب ہیں زن و فرزند پہ دل سے قربان
بوڑھے ہیں مگر ہنوز بچے ہیں جناب

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے
انسان کو بہر طور دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنہ جو احمق ان کو
بے روح نمازوں میں لگا دیتا ہے

پُر ہول شکم عریض سینے والو
خوں قوم تہی دست کا پینے والو
تم اہلِ خرد سے کیوں نہ رکھو گے عناد
خیرات پر احمقوں کی جینے والو

جوشؔ کی رباعیوں کا ایک اور موضوع حسن و عشق ہے۔ جوشؔ کا طبعی میلان اگرچہ تغزل اور معاملہ بندی کی طرف نہیں تھا بلکہ عقل و خرد اور شعور و وجدان کی طرف تھا، پھر بھی

ان کے یہاں بہت سی رباعیاں ایسی ملتی ہیں جن میں حسن وعشق کے تجربات اور وارداتِ قلبی کو بیان کیا گیا ہے۔ جوشؔ اپنی عشقیہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میری بیشتر عاشقانہ نظموں میں اس چیز کی (لوگ کہتے ہیں) کمی ہے جسے آہ وفغاں اور سوز و گداز کہا جاتا ہے، اگر ایسا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے میرے عشق ہائے کامران پر۔ میرے اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے رہے ہیں کہ جن کا محبوباؤں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ عاشقِ کامیاب ٹسوے نہیں بہایا کرتا''۔[9]

اسی وجہ سے ان کی عشقیہ رباعیوں میں بھی اضمحلال کی بجائے حرکت، سوز کی بجائے گرمی، دروں بینی کی بجائے کشادہ منظری اور درد واثر کے بجائے نشاطیہ کیفیت نظر آتی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری فراقؔ کی عشقیہ شاعری سے اس وجہ سے مختلف ہے کہ وہ حسن کی تجسیم کرتے ہیں جب کہ جوشؔ حسن کی تجسیم بھی کرتے ہیں اور اس کو چھوتے بھی ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر شکیل الرحمٰن کی یہ رائے کافی اہمیت رکھتی ہے:

> ''جوشؔ نے حسن کو ایک مثبت قدر تصور کیا ہے جو جبلّت کی پیداوار ہے۔ حسن سے انبساط حاصل ہوتا ہے''۔[10]

اس طرح جوشؔ نے اپنی عشقیہ رباعیوں میں انفرادی لب و لہجے، حسنِ بیان، بے ساختہ پن کے ساتھ تخلیقیت اور فنی تکمیلیت کے اعلیٰ مرقع کھینچے ہیں:

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے روکے سحر کو روکے کوئی

جلوؤں کی ہے بارگاہ میرے دل میں
غلطیدہ ہیں مہر و ماہ میرے دل میں

اس دورِ خرد میں عشق گم ہو جاتا
ملتی نہ اگر پناہ میرے دل میں

اے رونقِ لالہ زار واپس آجا
اے دولتِ برگ و بار واپس آجا
ایسے میں کہ نوبہار ہے خلد بدوش
اے نازشِ نوبہار واپس آجا

اوروں کو بتاؤں کیا میں گھاتیں اپنی
خود کو بھی سناتا نہیں باتیں اپنی
ہر ساعت خوش ہے مالِ مسروقۂ وقت
قدرت سے چھپا رہا ہوں راتیں اپنی

مختصراً جس طرح جوشؔ نے اردو نظم کو لہجے کی صلابت، موضوعاتی تنوّع اور بے پناہ لفظی سرمائے کے ذریعے نیا موڑ دیا ہے اسی طرح رباعی کو نئے موضوعات اور اپنی منفرد طرزِ ادا کے ذریعے ایک نئی توانائی اور طاقت بخش دی ہے، ان کی رباعیاں اردو ادب کے ادبی سرمائے میں صحیح معنوں میں ایک اضافہ ہیں۔ انھوں نے نہ صرف رباعی کے دامن کو وسیع تر کیا ہے بلکہ اس کو جدید نظم کے برابر کھڑا کر کے اس میں زندگی کی وسعت پیدا کر دی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ انتخاب کلیاتِ جوش، فضل امام، ص: ۲۴۔
۲۔ کاشف الحقائق (جلد دوم) نواب امداد امام اثر، ص: ۲۸۶۔
۳۔ جوشؔ ملیح آبادی۔ خصوصی مطالعہ، مقالہ فکرِ جوش، مرتب: قمر رئیس، ص: ۲۰۔
۴۔ جوشؔ ملیح آبادی۔ انسان اور شاعر، پروفیسر احتشام حسین، ص: ۱۱۵۔
۵۔ تاریخ ادب اردو (عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک)، جلد چہارم، سیدہ جعفر، ص: ۲۸۳۔
۶۔ مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص: ۱۴۵۔

۷۔ اردو رباعی (فنی وتاریخی ارتقا)، فرمان فتح پوری، ص: ۱۷۲۔

۸۔ اردو رباعیات، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص: ۵۳۷۔

۹۔ سیّد احتشام حسین، ذوق ادب اور شعور، ص: ۲۲۵۔

۱۰۔ آجکل، دہلی، جوش نمبر، اپریل ۱۹۹۵ء، ص: ۶۴۔

شخصی مرثیہ گوئی اور جوش

اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت بہت قدیم ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے محققین اور ناقدین نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کہ اور ہم اس ادبی ورثے سے کٹتے چلے گئے۔ ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ اس کا بڑا سرمایہ یا تو ضائع ہوگیا یا وقت کے دھندھلکوں میں کھو گیا۔ اردو میں جو، شخصی مرثیہ میں تلاش کر سکا ہوں، ان میں سب سے قدیم شاہ برہان الدین جانم کا ہے۔ شاہ برہان الدین جانم نے یہ مرثیہ اپنے والد شاہ میران جی کی وفات (۹۷۰ھ) پر کہا تھا۔ اس کے بعد جعفر زٹلی، عبدالحی تاباں، نساخ، غالب، مومن، ناسخ، میر انیس، حالی، اکبر، اقبال، محمد علی جوہر، چکبست اور سرور جہان آبادی، سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ آج بھی بدستور زندہ و جاری ہے۔ (اس بارے میں میں اپنے مقالے ('اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت' میں تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں)

اردو میں، مرثیہ عربی، فارسی سے آیا، لیکن یہاں کربلائی مرثیوں کو کچھ ایسا عروج

ملا کہ یہ صنف ان سے ہی پہچانی جانے لگی۔ اردو میں مرثیہ، کا مطلب کربلائی مرثیہ ہے۔ باقی مرثیہ شخصی مرثیہ کہلائے۔ شخصی مرثیہ کی نہ کوئی خاص ہیت مخصوص ہے، اور نہ ہی اجزائے ترکیبی ہی طئے ہیں، لیکن ایک مکمل اور سلسلے وار شکل بنانے کے لئے، شخصی مرثیہ میں جو اجزا ضروری ہیں، ان میں چہرہ، وصف اور بین بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ بعض شعرا نے اس میں دعا کا باب بھی جوڑا ہے۔ رثاییت، نظم کی اس کی بنیادی شرط ہے۔ محض کسی کی موت کے حوالے یا ذکر سے کوئی نظم، شخصی مرثیہ نہیں کہی جا سکتی۔ اس باب میں، ان تعزیتی رباعی اور قطعات تاریخ وفات کو بھی رکھا جا سکتا ہے، جن میں رثائی لئے ہے۔

۲۰ ویں صدی میں، جن شعرا نے شخصی مرثیہ کو اعتبار بخشا، ان میں جوش ملیح آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ شخصی مرثیہ گوئی، بھی جوش کا فن خاندانی ہے۔ پردادا فقیر محمد خاں گویا سے لے کر والد بشیر احمد بشیر تک، جوش کے اسلاف کے یہاں شخصی مرثیہ نگاری کا قیمتی سلسلہ ملتا ہے۔ فقیر محمد خاں گویا نے اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے نائب السلطنت، معتمد الدولہ نواب آغا میر کی موت پر، پردرد مرثیہ کہا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہائے دنیا سے اٹھ گیا وہ امیر
جس کا عالم میں تھا نہ کوئی نظیر
اس بن آنکھوں میں ہے جہاں تاریک
تھا وہ گویا کہ مہر عالم گیر
ملک عزت کا آسمان تھا وہ
چرخ ہمت کا تھا وہ ماہ منیر
دفعتاً یوں اٹھالیا اے ہائے
کیا کیا تو نے او فلک بے پیر

(ڈاکٹر ناہید عارف، گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات (لکھنؤ ۱۹۸۹)

جوش کے کلام میں، مجھے بارہ شخصی مرثیہ نظر آئے۔ ان میں سے دو، ان کے والد بشیر احمد بشیر، اور باقی ایک ایک بڑی بہن، دوست روپ سنگھ، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، شرر لکھنوی، علامہ راشد الخیری، حکیم صاحب عالم، جگت موہن لال رواں اور کسی نامعلوم شہید وطن کی یاد میں ہیں۔ حکیم صاحب عالم کا مرثیہ، کوئی علاحدہ نظم نہیں ہیں، یہ اشعار جوش کی ایک طویل نظم (اپنا مرثیہ) کا ہی حصہ ہیں۔ جوش کے مرثیوں کو، موٹے طور پر تین حصوں میں باٹا جا سکتا ہے۔ پہلا، عزیزوں کے مرثیے، دوسرے دوستوں کے مرثیے اور تیسرے، قومی لیڈران کے مرثیے، جن سے جوش متاثر تھے۔

جوش نے شخصی مرثیہ گوئی کو لفظ کا شکوہ اور خطیبانہ لہجہ بخشتا ہے۔ جذبات اور منظر نگاری کے نئے دریچے کھولے ہیں۔ ان کے شعری پیکر زندہ اور متحرک ہیں۔ انھوں نے لفظوں کو خیال کی ڈور میں یوں گوندھ دیا ہے کہ ان میں خوبصورت ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ بالکل فٹ۔ نہ اسے ہٹایا جا سکے اور نہ ہی بدلا جا سکے۔ ایک دوسرے کو جوڑتے اور بڑھاتے لفظوں کا ایسا تار، جو خیال کے فطری بہاؤ کو نہ روکے، اور نہ دھیما یا تیز کرے۔ انھوں نے لفظوں کو یوں سلیقے سے چن دیا ہے کہ ان میں خیال کا چہرہ جھانکتا نظر آتا ہے۔ لفظوں کی یہ چلتی پھرتی تصویریں دل کھینچ لیتی ہیں۔

جذباتیت، جوش کے شخصی مرثیوں کا غالب رنگ ہے۔ یہ اشعار یادوں، جذبات اور تخیل کا خوب صورت میل ہیں۔ یادوں کی کوکھ سے نکلے جذبات، ان اشعار میں بے پناہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ رشتے داروں اور دوستوں کے مرثیوں میں جذبات کی یہ لے اور تیز ہے۔ جوش کے کچھ مرثیہ، مثلاً بہن اور والد کے مرثیے، انتہائی ذاتی غم کا نتیجہ ہیں، لیکن زور بیان اور جذبے کی شدت، نے اس ذاتی غم میں بھی اجتماعی احساس پیدا کر دیا ہے۔ ان میں بلا کی کیفیت اور اثر آفرینی ہے۔ انھیں پڑھیے، آپ کو لگے گا، یادوں کی ایک برات ہے جو بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ تخاطب کا انداز، لہجے کی شدت اور رنج و غم کے فطری اثر نے ان

کے مرثیوں میں بے پناہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اپنے والد کے مرثیے میں جوش نے جو چہرہ کہا، وہ شخصی مرثیہ میں چہرے کی خوبصورت مثال ہے:

شیشوں میں زہر بھر دو پیر مغاں سدھارا
مے خانے بند کر دو یا ایہا السکارا
یہ انتخاب تیرا اے موت کیا برا تھا
کیسا جوان رعنا افسوس چن کے مارا
کون آفتاب ڈوبا اے چرخ جھٹپٹے میں
کس چاند کو لحد میں اے اقربا اتارا

--

حاضر ہے جوش صبح سے مصروف سوز و ساز
قبر پدر کی دید ہے فرزند کی نماز
لیجے سلام میں ہوں وہی کشتۂ نیاز
بچپن میں آپ جس کے اٹھاتے رہیں ہیں ناز
اب وہ نگاہ لطف نہیں وہ کرم نہیں
ثابت ہوا کہ آپ کے اب کوئی ہم نہیں

جوش کی بڑی بہن افسر جہاں کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ جوش کے لئے یہ بڑا صدمہ تھا۔ ایک مرتبہ، ایک برتن جس پر مرحوم بہن کا نام کندہ تھا، دیکھکر جوش کے جذبات بے قابو ہو گئے اور ایک دردانگیز مرثیہ سامنے آیا:

کندہ ہے اس ظرف بشکتہ پہ یارب یہ کس کا نام
آہ اب اس نام کا مفہوم ہے زیر مزار
دل پھڑک جاتا ہے میرا آہ اے ظرف ملول
آ کے رکھ لوں دل میں اے میری بہن کی یادگار

وہ بہن شاداب تھے جس سے روایات قدیم
وہ بہن تابندہ تھا جس سے اب و جد کا وقار
اس کے حرفوں پر نظر پڑتے ہی اک مدت کے بعد
پھر گئی آنکھوں کے نیچے عہد طفلی کی بہار

وصف نگاری، جوش کے شخصی مرثیوں کا خوبصورت پہلو ہے۔ اس سلسلے کے اشعار میں نظموں کا تسلسل اور قصیدہ کا شکوہ نظر آتا ہے۔ ہیرو کی شخصیت کے ہر پہلو اور ہر رنگ کو وہ تمام تر خوبیوں کے ساتھ یوں ابھارتے ہوئے چلتے ہیں کہ قاری کو اس کی عظمتوں اور اس کی موت سے ہونے والے اجتماعی نقصان کا احساس ہو جائے۔ خطابت جیسا انداز یوں تو جوش کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے مگر شخصی مرثیوں میں وصف نگاری کے باب میں یہ رنگ اور چوکھا نظر آتا ہے۔ بات کو ہر ذہن تک پہنچانے کے لئے جوش اپنے نکتے کو الگ الگ ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں۔ یہ تکرار، یا دہراؤ نہیں، بلکہ یہ خیال کو اس کی تمام تر جہتوں کے ساتھ پیش کرنے کی شعوری کوشش ہے۔ یہ کوئی قادر الکلام شاعر ہی کر سکتا ہے۔ جوش کا یہ انداز ان کے کلام میں اثر آفرینی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کا قلم ہیرو کا ایک ایسا جادوی خاکہ کھینچ دیتا ہے کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے رہ ہی نہیں سکتا۔ گاندھی جی کے مرثیہ کے یہ بند دیکھئے:

السلام اے سینۂ اقوام کے درد نہاں
السلام اے مرہم زخم دل ہندوستاں
السلام اے دوست گیر و چارہ ساز بیکساں
السلام اے آہ سرد و تیرہ بختان جہاں
السلام اے اشک گرم سینہ چاکاں السلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

تو امین رحمت آئینہ و ایثار تھا
صحت افکار انساں کے لئے بیمار تھا
برہمن کا چارہ فرما شیخ کا غم خوار تھا
تو رواداری کا دیوتا امن کا اوتار تھا

السلام اے کعبہ و کاشی کے درباں السلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

مولانا محمد علی جوہر کے مرثیہ میں بھی، جوش نے وصف نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہ مرثیہ لفظوں کی خوبصورت تصویر ہے۔ ایک ایسی تصویر، جس میں رنگ بھی ہے اور وسعت بھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے متاع بردہ ہندوستان و ایشیا
اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار
اے غرور ملک و ملت تو وہاں لیتا تھا سانس
موت جس منزل پر بنتی ہے حیات پائیدار
تجھ کو بخشی تھی مشیت نے اک ایسی زندگی
جس بہادر زندگی پر موت کو آتا ہے پیار
تیرے آگے لرزہ بر اندام تھی روح فرنگ
اے دل ہندوستاں کے عزم تند و استوار
موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں
اہل بدعت کی کلائی خنجر باطل کی دھار
طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے
تھی حسین ابن علی کی استقامت آشکار

تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو

اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن سلطاں شعار

قوم کو بخشا ہے تیری موت نے وہ بانکپن

کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہ افتخار

یا راشد الخیری کے مرثیہ کے یہ شعر دیکھئے

یہاں بھی جوش نے وصف کے زندہ پیکر تراشے ہیں۔

وہ کہ جس کے دل کے اندر بے کسوں کا درد تھا

وہ کہ علم و فن بے ہمتاادب میں فرد تھا

وہ کہ جس کی عقل کا سینہ تھا غم سے داغ داغ

دل تو دل، دل کی طرح جس کا دھڑکتا تھا دماغ

جوش نے شخصی مرثیوں میں، بین کی شعوری کوشش نہیں کی ہے،لیکن جذبات کے بیچ سے بعض مقام پر درد وغم کی وہ مخصوص فضا قائم ہو جاتی ہے، جو مرثیہ کا تقاضا ہے۔والد،،بہن اور دوستوں کے مرثیوں میں، جزباتیت کی یہ لئے اور تیز ہے۔زبان و بیان کی ندرت اور اظہار کی برجستگی اس میں مزید درد گھول دیتی ہے۔

میرے ندیم طیب و طاہر کو کیا ہوا

اے دوستو بتاؤ جواہر کو کیا ہوا

ذرے سیاہ پوش ہیں تارے ہیں سوگوار

دل کے نگر میں اب نہ کبھی آئے گی بہار

تجھ ہم نوا کی موت سے اے یار مہر کار

میں اپنی زندگی سے نہایت ہوں شرمسار

دنیائے عاشقی کی یہی رسم و راہ ہے

لیلیٰ کے بعد قیس کا جینا گناہ ہے

گاندھی جی کی موت سے ہونے والے قومی نقصان کے ذکر سے اس بند میں بھی درد و غم کی ایک مدھم لئے سنائی دیتی ہے۔

بار احساس یتیمی سے ہر یک دل ہے اداس
رہروی کے ولولے گم، روئے منزل ہے اداس
کون یہ مقتول اعظم ہے کہ قاتل ہے اداس
صدر محفل اٹھ گیا، محفل کی محفل ہے اداس
اے ابوالہند، اے خدیو کشور جاں السلام
السلام اے ہند کے شاہ شہیداں السلام

اپنے دوست سردار روپ سنگھ کے مرثیہ میں، درد و غم کی یہی لئے اور بے پناہ کیفیت ہے۔ اس مرثیہ کے ساتھ جوش کا یہ نوٹ بھی لگا ہے کہ 'یہ نظم جذبہ غم کی انتہائی شدت میں کہی گئی ہے، ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ۔ اے قافلے والو کی ٹیپ نے اس میں نوحے کا انداز پیدا کر دیا ہے۔

گونجی ہوئی آفاق میں آواز فغاں ہے
یوں ماتم سر حلقۂ مندان جہاں ہے
ہر آنکھ سوئے مرگ بحسرت نگراں ہے
اللہ بتاؤ تو مرا روپ کہاں ہے
جس سمت ہے وہ مجھ کو بھی اسی سمت بلا لو۔ اے قافلے والو

کہتے ہیں مرا روپ گیا دور بہت دور
رہتا تھا جو آنکھوں میں ہوا خاک میں مستور
بیزار ہوں جینے سے مجھے موت ہے منظور

امداد کی دو بھیک کہ ہوں بندۂ مجبور

اک بندۂ بے کار کے ارمان نکالو۔ اے قافلے والو

حکیم صاحب عالم، بھی جوش کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ یادوں کی برات میں جوش نے بڑی محبت سے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان اشعار میں بھی، درد و غم کی فضا ہے، مگر شاعر کے انتہائے غم نے شکوے کا انداز پیدا کر دیا ہے۔

مورخ تھے جو میری زندگی کے
انھیں یاروں کو چن چن کے اٹھایا
مجھے اندھا بنا دینے کی خاطر
چراغ صاحب عالم بجھایا
جو اپنی ذات سے اک انجمن تھا
فلک نے خک میں اس کو ملایا
مری خاطر جو مسجد سے نکل کر
خرابات جہاں میں چھچھایا
ستم گر زندگی تو نے بالآخر
مجھے اس کے جنازے کو دکھایا
اداسی پر مری دشمن بھی تڑپے
مشیت کو ترس لیکن نہ آیا

البتہ، مرزا احسن شرر لکھنوی کے مرثیہ میں جوش نے، بین کا شعوری اہتمام کیا ہے۔ ہائے ہائے کی ردیف، اشعار میں اور درد گھول دیتی ہے۔

لکھنو کی وہ بہار غنچہ بر کف وائے غم
آگرے کی وہ نسیم گلبداماں ہائے ہائے

میرے جاں پرور رفیق غنچہ و گل آہ آہ

میرے دیرینہ انیس باد و باراں ہائے ہائے

کیوں دعا میری نہ پہنچی آہ تا باب قبول

مجھ کو تجھ سے کم نہ تھا مرنے کا ارماں ہائے ہائے

یا راشد الخیری کے مرثیہ کا یہ شعر دیکھئے، آپ کو درد تصویر نظر آئے گی۔

شمع راتوں کو بہاتی تھی جو آنسو اٹھ گئی

دہر سے وہ کیا اٹھا، دہلی سے اردو اٹھ گئی

ان اشعار میں رنج و غم کی تمام خاموش لہریں ہیں۔ جذبات کے انگنت دھارے ہیں، جو قاری کو بھی اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں اور وہ جانے انجانے شاعر کے دکھ میں شریک ہو جاتا ہے۔ جوش کے مرثیوں میں منظر کشی کے خوبصورت مرقع بھی نظر آتے ہیں۔ جوش نے لفظوں کے انتخاب اور اپنے مخصوص برتاؤ سے ایسے شعری آئینے بنا دئے ہیں، جن میں منظر اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ نظر آتا ہے۔

جمنا کی سمت آہ ترا آخری سفر

اس درجہ تھا ہجوم کہ لرزاں تھی رہگزر

جلتے ہوئے جو دل تھے تو پھنکتے ہوئے جگر۔ پروانے کا جنازہ ہے شمعوں کے دوش پر

گلشن تھا آندھیوں کا تسلسل لئے ہوئے

گل سرنگوں تھے، میت بلبل لئے ہوئے

(مرثیہ نہرو)

موت کے باب میں، یہ شاعری جوش کی عظمتوں کی دلیل ہے۔ شخصی مرثیوں میں بھی انھوں نے بڑا دلکش شعری نظام ترتیب دیا ہے۔ خوبصورت زبان پر تشبیہ اور استعاروں کے گل بوٹے ٹانک کر انھوں نے ان اشعار میں اور حسن پیدا کر دیا ہے۔ چہیتے یار کو چاند تو

بہت سے لوگوں نے کہا ہے، لیکن اس کی موت کی خبر سے بے ساختہ نکل پڑنے والے آنسوؤں کو اس نظر سے جوش ہی دیکھ سکتے تھے۔

تاریک ہے نگاہ میں دنیا ترے بغیر
بھارت ہے ایک یاس کا پتلا ترے بغیر
دہلی کے حسن پر ہے رنڈاپا ترے بغیر
جمنا ترے بغیر نہ گنگا ترے بغیر
تو گم ہوا تو اشک ہمارے نکل پڑے
جب چاند چھپ گیا تو ستارے نکل پڑے

(مرثیہ نہرو)

یہ مرثیے، درد کے اس سفر سے عبارت ہیں، جس سے شاعر گزرا ہے۔ احساس کا یہ سفر، ان مرثیوں میں درد اور اثر پیدا کر دیتا ہے۔ جوش نے شخصی مرثیہ کی شعریات میں نئے رنگ گھولے ہیں۔ ان کی یہ نظمیں، بلاشبہ شخصی مرثیہ نگاری کی روایت کو طاقت دیتی ہیں۔ اسے آگے بڑھاتی ہیں۔ ان میں، شعریات اور متخیلہ کے وہی، رنگ ہیں، جو جوش کی شناخت ہیں۔ ان میں فکر و فن کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان مرثیوں کا، اپنا فکری پس منظر بھی ہے۔ یہ لئے کہیں ظاہر ہوتی ہے، تو کہیں بین اسطور چھپی ہوئی ہے۔ محمد علی جوہر کے مرثیہ میں جد جہد آزادی، گاندھی جی کے مرثیہ میں فرقہ وارانہ میل جول پر خطرہ، نہرو کے مرثیہ میں جدید ہندوستان کی تعمیر و تشکیل پر برے اثر کا، اندیشہ اور حکیم صاحب عالم کے مرثیہ میں اپنی ناکامی اور ٹھگے جانے کا احساس، سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی چیزیں، ہم عصر شخصی مرثیہ گو شاعروں میں، الگ مقام دیتے ہیں۔

☆☆☆

یحییٰ احمد

جوشؔ ملیح آبادی کا تصورِ انقلاب

جوشؔ کے القابات میں سے ایک نمایاں لقب ان کا شاعر انقلاب ہونا ہے۔ ان کے القابات میں سے ان کی شاعری کے موضوعات جھلکتے ہیں۔ خاص کر شاعرِ انقلاب، شاعرِ شباب، شاعرِ شراب، قبلہ رندانِ جہاں، مفکر پیغمبرِ فطرت، شاعر آخرالزماں، فخر رسولانِ بنی اسرائیل اور بادشاہ زبان۔ بعضے القابات ان کے ذیلی موضوعات کو بھی واضح کرتے ہیں۔
شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے جوشؔ کا مشہور ترین زبان زدِ عام شعر ہے:

نام ہے میرا تغیر کام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

لفظ تغیر پر اعتراضات کے برعکس ہم تین مرتبہ انقلاب کے لفظ کے معنی کی تہ میں اترنا ضروری سمجھتے ہیں کہ انقلاب کے بعد تبدیلی کی نوید کس صورتِ حال کی غماز ہے تاکہ جوشؔ کا تصورِ انقلاب سامنے آسکے۔ یہ مسلسل انقلاب کی خبر ہے۔

لفظ انقلاب کا مادہ عربی میں قلب یقلب ہے جس کا معنی تبدیلی ہے۔ اصطلاحاً انقلاب سے مراد وہ سیاسی تبدیلی ہے جب اس ملک کے رہنے والے پرانے شرائط پر زندگی

گزارنے سے منحرف ہو جائیں اور نیا نظام لانے کے لیے حکومت کا تختہ اڑا دیں۔ تاریخ میں انقلاب فرانس اور بیسویں صدی میں بالشویک (روسی انقلاب) انقلاب یعنی Revelution کے لفظ پر پورا اترتے ہیں۔ اس کے علاوہ جتنی تبدیلیاں آئیں اس میں لشکر کشی کا عمل دخل رہا۔ انقلاب کے لیے ضروری ہے کہ یکدم یا ارتقائی تبدیلی پورے معاشرے پر اثر انداز ہو اور کئی سمت پر گامزن ہو۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے ۱۹۲۱ء میں 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام نظم 'خطاب' میں شاعری کو جہادِ آزادی کے لیے موڑا۔ انھوں نے گھن گرج، شوکتِ الفاظ، للکار اور زوردار الفاظ کے ذریعے آزادی کے انقلاب کے لیے جدوجہد شرع کی۔ کہا کہ:

کس زبان سے کہہ رہ ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
وہ بھگت سنگھ جس کے غم میں اب بھی دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے

اسی نظم سے انھوں نے انقلابی شاعری کا سفر شروع کیا۔ بعد ازاں ترقی پسند تحریک کے سرخیل کی حیثیت سے ایک توانا گھن گرج والے شاعری کی حیثیت سے الگ مقام بھی رکھا۔ جوشؔ کی نظمیں تلاشی، سائمن کمیشن، بغاوت، شکستِ زنداں میں ان کے تصورِ انقلاب کو پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ رباعی کے دو اشعار دیکھیے:

سنو اے ساکنان زلف گیتی ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

ان خیالات سے وہ رومانٹک انقلابی تھے، جس طرح انقلاب فرانس کے سرخیل روسو تھے۔ دونوں مفکرین حالات کے بدلنے کے لیے پہلے مرحلے بیزاری تک آئے۔ انھیں اس لیے باغی بھی کہا جاتا ہے۔ انھیں فیض احمد فیضؔ نے اپنی کتاب 'میزان' میں رومانٹک انقلابی کہا ہے۔ جواباً ایک مضمون 'ارتقا' جوشؔ صدی نمبر میں علی سردار جعفری نے انھیں رومانٹک سے آگے للکار کا شاعر کہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جوشؔ کی انقلاب کی شاعری کو رومانٹک فطری کہنا صحیح نہیں نہ ہی ان کی یہ شاعری کمزور ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم ان دونوں ترقی پسند شاعروں کی

بات کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ انقلاب کا پہلا مرحلہ بغاوت ہے جب اس نظام کے متعلقین لیٹسٹسکو کے خلاف برسرِ پیکار ہونے پر آمادگی ظاہر کر دیں۔ ہمارا دوسرا نکتہ ان کو باغی یا منحرف شخص کے طور پر دیکھنے کا ہے۔ وہ سقراط سے لے کر امام عالی مقام تک اور بعد ازاں منصوری مسلک کے اعلانیہ پیروکار ہیں۔ دیکھیے:

عزم حسین جرأت سقراط کی قسم   اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم

انھیں زاہدہ حنانے ('ارتقا' میں) جرأت انکار کا شاعر کہا ہے۔ یہ مزاحمتی روایت، حق گوئی اور بے باکی الگ دبستان رکھتی ہے۔ رسالہ 'کلیم' اور مقالاتِ جوش میں انھوں نے انقلاب کے تصور کے ساتھ ساتھ بغاوت کے گیت لکھے، مضامین پیش کیے۔ باغی نظم کے چند اشعار:

ہاں بغاوت آگ بجلی موت آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل میرے پہلو میں قتلِ عام
برچھیاں بھالے کمانیں تیر تلواریں کٹار
برقیں پرچم علم، گھوڑے پیادے شہسوار

نظم 'شکستِ زنداں':

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا

اور ناخدا کہاں ہے:

بھرا ہوا ہے غیظ میں سمندر فضا کی جانب دھک رہا ہے
گرج کڑک ہے کڑک چمک ہے چمک ہوا ہے ہوا گھٹا ہے

جوش مغربی استعمار، ایشیائی ملوکیت، عرب مطلق العنانیت اور آئیڈلزم کے مخالف ہیں۔

جوش کے مخالفین تخریبی پرچم اٹھانے کو منفی عمل لکھتے رہے۔ حالانکہ سقراطی سوچ کی وجہ سے وہ ایک تاریخی بات لکھ رہے تھے۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ان نظموں میں جوشؔ کے مجاہدانہ تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا ہے۔ شعلے برس رہے
ہیں''۔ (رسالہ 'آجکل' جوش نمبر)۔

انقلابی سوچ اور بغاوت کے بعد تیسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے آبا و اجداد کے حوالے سے نامی گرامی پختون ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں ان کا پختون بہادرانہ کردار جھلکتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

روح ہے مجھ میں صعوبت کے پرستاروں کی
نشہ ہوتا ہے مجھے چھاؤں میں تلواروں کی

ان جوشیلے لفظ اور پڑھنے کے انداز تک میں یہی کردار جلوہ گر ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اٹل قسم کے بہادر شخص ہیں۔ ان کی مثال پشتو کے لیجنڈ شاعر خوشحال خاں خٹک سے دی جاتی ہے جو مغل حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھا چکا تھا۔ جوشؔ بھی لکھتے ہیں، نظم 'میرے اجداد':

پیر ماضی سے جواں عہد لیا ہے میں نے
سیف پگھلا کے قلم ڈھال لیا ہے میں نے

ایک بات ان کی شاعری میں لعن طعن، تبرا اور طنزیہ الفاظ کا فنکارانہ استعمال ہے۔ یہ غیظ و غضب الگ دبستان کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ 'ماتم آزادی' نظم میں کس طرح لفظوں کے گولے برساتے ہیں۔ دیکھیے:

برٹش کے خادموں کو اچھالے ہوئے ہیں ہم
سانپوں کو آستین میں پالے ہوئے ہیں ہم
چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی
چھانٹی گئیں تمام جو نظمیں تھیں کام کی
برطانیہ کے خاص غلامانِ خانہ زاد
دیتے تھے لاٹھیوں سے جو حب وطن کی داد

الغرض جوشؔ لفظ کی مناسبت سے ان کے الفاظ کا مطالعہ کرنا چاہیے (راقم 400 صفحات جوشؔ کا لسانی مطالعہ لکھ چکا ہے)۔ وہ سرمایہ داری نظام کی مدلل مخالفت کے بجائے

آگ برسانے والی توپیں چلاتے ہیں۔ خان صاحب کے کچھ الفاظ دیکھیے:

"جب تک کوئی شخص ہلاکو، چنگیز اور ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا سرمایہ دار نہیں بن سکتا"۔

(مقالاتِ جوش، مرتبہ سحر انصاری)

اپنے ساتھ جدوجہد کرنے والے ہندستانی عوام کو ستے ہیں:

اے ہند کے ذلیل غلامان روسیاہ
شاعر سے ملاؤ خدا کے لیے نگاہ
اے روسیہ بے حیا وحشی کمینے بدگماں
اے جبیں ارض کے داغ اے دنی ہندوستان

بیان کی یہ انتہا پسندی قابلِ گرفت ہوتی اگر وہ مجاہد آزادی نہ ہوتے بطور مجاہد آزادی ان کا رتبہ مستحکم ہے اس لیے ذیلی نکات کے تحت یہ فیصلے جذباتی اشعار وکلمات اتنے قابلِ گرفت نہیں۔ پیرزن لیگ میں مسلم لیگ کو کہا:

ہر خان بہادر ہے میری گود کا پالا
ہر فرد حکومت ہے میری آنکھ کا تارا

خان صاحب کی شاعری کا ایک پہلو مرثیہ کو انقلابی بنانے کا عزم ہے۔ ان کی ایک کتاب کا نام 'انقلاب اور حسین' ہے وہ کربلا کو آزادی کا استعارہ مانتے ہیں۔ وہ کربلا میں ظلم و بربریت اور جبر کے خلاف تسلسل دیکھتے ہیں اس لیے کہا:

اک تازہ کربلا سے ہے نوع بشر دوچار
پھر نائب یزید ہے دنیا کا شہریار

یا

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

برطانیہ کے خلاف جہاد آزادی کے لیے کربلا کے واقعے کو بطور مثال استعمال کرنا اور پھر

مرثیے کو جدت دے دینا جوشؔ کا فن بن گیا۔ اسی طرح مرثیے کو بھی نئے مضامین سے متعارف کرانے کی بھرپور سعی جوش کے حصے میں آئی۔ پھر بہت سے مرثیہ نگاروں نے جمہوری آزادیوں کے لیے بذریعہ نظم 'کربلا' جدوجہد کی۔

جوشؔ نے جب حکومت کی مخالفت کی تو اس کی Esteblishment نے جواباً جوشؔ پر تنقید کا پتھراؤ کیا۔ جوشؔ کے انقلابی افکار میں مسلمان سے روگردانی بھی اس حساب میں شمار ہوگی۔ جوشؔ کا خدا بھی حکمرانوں کا خدا نہیں۔ جوشؔ کا شعر ہے:

یہ کاشی اندیشہ ہے یہ کعبہ افکار
رک جاؤ اساطیر ٹھہر جاؤ روایات

انھیں یہ احساس تھا:

ہوتا ہے اس سماج میں جویائے انقلاب
ملتا ہے اس کو کافر زندیق کا خطاب
دنیا بہت وسیع تھی لیکن میرے لیے
آزادیِ خیال نے زنداں بنا دیے

اور:

کراچی میں ہوں یارو جیسے کوفے میں حسین
ہیں شہادت کے آثار چناجور گرم

جوشؔ ان حکومتی قوتوں کے خلاف سینہ سپر رہے۔ جوشؔ نے ملا اور شیخ کو بھی عقائد پارینہ کا محافظ ٹھہرایا اور ہر اس قوت کو تنقید کے زمرے میں لایا جو انقلاب کے راستے کی دیوار بنا۔ انھوں نے دعا مانگی کہ:

الغرض میرے وطن کو زندگی دے اے خدا
آدمی دے آدمی، آدمی دے اے خدا

اپنے لیے جو رتبہ مانگا:

نہ دولت نہ قوت نہ تاجِ شہی   فقط روشنی روشنی روشنی

انھوں نے حالات کے مطابق شاعری میں اپنے افکار کی ترویج کی۔ پاکستان میں مختلف

گروہی لسانی گروپوں سے کہا:

قوموں میں بانٹتا ہے جو نسل آدمی کو
مشرک ہے اور کافر ہے بلکہ اکفر

اور:

تو جنس تعصب کا خریدار ہے اب تک
ملکوں کے گھروندوں میں گرفتار ہے اب تک

دینی عقائد کو اصل شکل میں پیش کرنے کی وجہ سے انھیں متشکک کہا گیا۔

جوشؔ کا تصورِ انقلاب۔ اگر مارکسزم کے حوالے سے دیکھا جائے تو مختلف ہے مگر جوشؔ کے سیکولر خیالات کے حوالے سے دیکھا جائے تو انھوں نے بنیاد مارکسزم سے حاصل کی، وہ کہتے ہیں:

السلام اے مارکس اے دانائے راز
اے مریض انسانیت کے چارہ ساز
منکر دارائی عرش بریں
اولیں پیغمبر فرش مبیں

پھر وہی بات ہے کہ وہ رومانی فطری انقلاب کے داعی نظر آتے ہیں۔ مزدور کسان کے انقلاب کی سمجھ نہیں رکھتے، کسان کو ارتقا کا پیشوا اور تہذیب کا پروردگار لکھتے ہیں۔ یہ کسان کی رنگین تصویر ہے۔ اس لیے ان لوگوں نے کہا کہ وہ صرف مجاہد آزادی ہیں اور ترقی پسند تحریک کے رکن۔ وہ کمیونسٹ نہیں ہیں انھوں نے کانگریس، مسلم لیگ اور CPI کو ملا دیا۔ جوشؔ نے کہا:

میرے تو بس ہیں تین چمکتے ہوئے نگین
اک کانگریس کہ ہے پلوٹھی کی نازنین
اور لیگ اس کی پیٹھ کی بچی قمر جبیں
اور کمیونسٹ ہے مرا فرزند نکتہ چیں

اس طرح یہ مارکسی خیالات ہیں مزید یہ کہ گاندھی کے عدم تشدد کو قبول کرنا نیز ٹیگور کے مراقبہ حال میں رہ کر انسان دوستی کا پرچار کرنا یہ وہ خیالات ہیں جو کمیونسٹ انقلاب کے لائحۂ عمل سے الگ ہوتے نظر آتے ہیں۔ جوشؔ یوں وضاحت کرتے ہیں:

''آپ کو معلوم نہیں کہ میں سقراط، مزدک، زرتشت، گوتم بدھ، مہاویر، تلسی داس، کنفیشن، مسیح، کبیر داس، گرونانک، مارکس، نیٹشے اور بریٹنڈ رسل کا بھی دل و جان سے شیدائی ہوں''۔

(مقالاتِ جوشؔ)

اب جوشؔ کا تصورِ انقلاب واضح ہوا کہ انھوں نے ہر ایک عہد ساز شخص سے اکتسابِ فیض کیا، مگر اپنی الگ فکر تشکیل دی اسی لیے انھیں مفکر العصر کہا گیا ہے۔ انھوں نے تین مرتبہ انقلاب کا لفظ استعمال کیا جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اپنے نئے افکار کو لاؤ پرانے افکار کو ایک عہد تک رکھو۔ انھوں نے مسلسل انقلاب کا نظریہ دیا، اس کا مطلب ٹراٹسکی کا لینن سے اختلاف تھا کہ ٹراٹسکی پوری دنیا میں انقلاب لانے کا متمنی تھا تاکہ سوویت یونین کا ماڈل نہ ٹوٹ سکے۔ آخر کار اس کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔

جہاں تک امجد اسلام امجد کا مضمون (ارتقا، جوش نمبر) کا تعلق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اب وہ حالات نہیں رہے جس کی وجہ سے جوشؔ کو شاعرِ انقلاب کہا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جوشؔ کا تصورِ انقلاب مسلسل انقلاب ہے جو سیکولر، انسان دوست، روایات شکن اور زمانے کی ضروریات سے ہم آہنگ ہے اور رہے گا۔ انھوں نے صبح کا لفظ بھی انقلاب کے معنی میں برتا:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اور:

اٹھو صبح کا غرفہ کھلا زنجیرِ شب ٹوٹی
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو

شائستہ رضوی

"تجسیمِ محسوسات کا شاعر"

جوش ملیح آبادی ایک عہد ساز شاعر جس کی فکر و دانش میں ڈوبی ہوئی شاعری اور ذہنوں کو گُنگ کر دینے والی قوتِ متخیلہ کا اثر آنے والی کئی صدیوں پر رہے گا۔ جوش کے کثیر الجہت سرمایۂ سخن میں ایک بات جو انہیں اکابرینِ ادب میں نمایاں ترین مقام دیتی ہے بلکہ اپنی بوقلمونی اظہار کی وجہ سے وہ جس اچھوتے اور انوکھے سنگھاسن پر متمکن وہ ان کی بسیط قوت مشاہدہ، رسا قوتِ متخیلہ کی ملکۂ سخن سے ہم رفتاری ہے۔ اس بے پایاں قوت اظہار کے باوصف بھی جو شاعر اس بات کا شاکی ہو کہ:

تو سمجھتا ہے کہ کہتا تھا شاعر کہہ گیا
پوچھئے شاعر سے وہ گھُٹ گیا کیا رہ گیا
کون جانے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

اور جب کیف و کم کو اشعار میں ڈھالنے پر آئے تو محسوس کو موجود بنا دے۔ جوش کی شاعری کا یہی وصف آج میری گفتگو کا سر نامہ ہے۔

کلامِ جوش میں خواہ وہ نظم ہو یا غزل رباعی ہو یا قطعہ تجسیم محسوسات کی مثالیں رنگا رنگ پھولوں کی طرح بوستانِ شعر کو مرصّع کرتی نظر آتی۔ کہیں چاہتوں کا گلستاں ہے تو کہیں بانہوں کی دھنک ہے، کہیں اُن کے ذہن کو رقص کو ترچھی چھڑی تو کہیں آواز کی آڑی پھوار میں صراطِ مستقیم نظر آتا ہے۔ جس کا قامتِ ذہن سروِ دلیل ہو اور جس کے شعری سفر کا احاطہ سمندر متھنے کے مترادف۔ محاسنِ شعری کا ایک طلسم ہوشربا ہے خود فرماتے ہیں:

میں شدت وجود سے نادیدنی ہوں جوشؔ
میں کثرتِ ظہور سے ناآفریدہ ہے

اس اعجاز بیانی کا خود جوش کو بھی بے پایاں احساس اور ادراک تھا:

الفاظ کو بخشتا ہوں روئے اصنام
آواز کو آنکھوں سے دکھا دیتا ہوں

جوش کے کلام میں ایسے صوتی اور صوری مرقعے بے حد دل نشیں ہیں مگر اُن کا یہ تخلیقی عمل ابدیت سے ہم کنار اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اس کو اپنی فکری شاعری میں برتتے ہیں یا وہ ذہنی اور قلبی کیفیات اور غیر مرئی تصورات کی تجسیم مرئی حوالوں سے کرتے ہیں جس میں ایک نئی ساحرانہ ہم آہنگی معرضِ وجود میں آتی ہے۔ جو ان کی قوت متخیلہ اور قوت مشاہدہ کے ملکۂ ناطقہ کے ہم کاب ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے:

تلملاتی مچھلیوں کی شوخیوں سے جس طرح
سطح پر تالاب کی پڑتے ہیں حلقے بار بار
یوں ہی دل کی لرزشِ پیہم کے ہاتھوں ہر نفس
میری چشمِ تر میں رہتی ہے تمنا بے قرار

یہ معجز بیانی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک ہی ترکیب میں آنکھوں کی نمی کو تالاب سے مچھلیوں کی شوخی کو تمنائے قلبی سے اور پانی میں پڑنے والے حلقوں کو دل کی لرزشِ پیہم سے متصور کرتا ہے۔

ایک دلکش ملیح چہرے پر
صبح کی ہیں صباحتیں طاری
جیسے نمکیں چیز میں اے جوشؔ
ایک ہلکی مٹھاس کی دھاری

''سنبل و سلاسل'' اور ''سموم و صبا'' کے دور کی شاعری میں جوشؔ خصوصاً مظاہرِ قدرت کی حسیات سے انتہائی لطیف حد تک جڑے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کلیوں کے چٹکنے کو فطرت کی دستک سمجھ کے چونک جاتے ہیں۔ ایک رباعی میں اس کی عکس بندی دیکھیے:

سر سے نزدیک ہو کے ایک طائر
یوں اُڑا صبح نیند جیسے آئے
نصف لمحے کے واسطے مجھ کو
گیت اس طرح شہ پروں کے سنائے
ذہن سے جس طرح کہ کوئی بات
یاد آتے ہی محو ہو جائے

جوشؔ کو الفاظ کا جادوگر کہا جاتا ہے جس کے قلم کی جنبش سے الفاظ صف در صف پرے جمائے منتظر، ذہن سفر نظر آتے ہیں مگر جب یہی شاعر کم سے کم الفاظ میں اور لطیف ترین پیرائے میں کسی اچھوتی کیفیت کو منظوم کرے تو ''چاند کے انتظار میں تارے''، ''فاختہ کی آواز''، ''آواز کی سیڑھیاں'' اور ان کے ہم پایہ نظمیں تخلیق ہوتی ہیں:

آئے وہ اشک تھم گئے بارے

چاند نکلا سبک ہوئے تارے

یہاں محبوب کی آمد سے اشکوں کے تھمنے اور تاروں کے ماند ہونے میں جو کیفیاتی توازن برقرار رکھا ہے وہ اس سہل ممتنع شعر کو کیف آگیں اور مسحور کن بنا دیتا ہے۔

اپنی حدوفا ہوتی محسوس

ان کی آواز پا ہوئی محسوس

ایسے لطیف اشعار کو تو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

اب حسن فطرت کے سب سے بڑے شاہکار احسنِ تقویم انسان اور انسان کی کیفیت قلبی اور معاشی مدّ و جذر سے پیدا ہونے والی بے چارگی کی لفظی تجسیم کا مشاقانہ مظاہرہ ملاحظہ فرمایئے:

خشک ہو کر سایہ بخشی کی نہیں رہتی جب آس

حالت اشجار یوں اس وقت ہوتی ہے سقیم

جیسے آنکھوں میں گدا کی دیکھ کر عزمِ سوال

سر جھکا لیتا ہے فرطِ شرم سے مفلس کریم

اس قطع میں شاعر نے کیا نادر استعارہ تراشا ہے کہ اس کیفیت پر ہر ہر پہلو سے منطبق ہو جاتا ہے۔ اسی قبیل کی ایک اور رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

ہوا پر شور ہے اور ابر بے موسم کی یورش سے

لب ساحل شگفتہ چاندنی مرجھائی جاتی ہے

یونہیں آزردۂ انفاس آئینے کی سی حالت

عزیزوں کی شکر رنجی کی تہہ میں پائی جاتی ہے

کوئی بھولا بسرا نغمہ سنائی دے تو قوت سامعہ اور قوت ناطقہ شاعر کے تخیل میں یوں ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

سنایا مجھے ایک مطرب نے آج

وہ نغمہ کہ تھا دل میں سویا ہوا
جوانی کی راتوں میں یادش بخیر
جسے چھیڑتا تھا کوئی مہ لقا
کچھ اس طرح نغمے کا ہر زیر و بم
میری سمت آنکھیں اٹھانے لگا
کسی اجنبی شہر میں جس طرح
کوئی بھولا بسرا ہوا آشنا
سرِ راہ لوگوں کے انبوہ سے
بڑھے یک بیک مسکراتا ہوا

جوشؔ کی فکری شاعری میں بھی اس معقول کو محسوس میں ڈھالنے کا عمل ان کے تخلیقی سوتوں میں حرف و فکر کی یکجائی اور یکتائی کی غمازی کرتا ہے۔ حالانکہ اس میدان میں ایسے محاسن شعری کی ترسیل تصوّرات کا ذریعہ بنانا نہ صرف انتہائی محال ہے بلکہ ہماری شاعری میں تو ناپید ہے۔

عروسِ دانشِ فردا الٹ رہی ہے نقاب
دمک رہی ہے انگوٹھی چمک رہا ہے بلاق

یہاں تک کہ اس شاعر بے بدل نے جب سائنسی تحقیقات اور ایجادات جیسے خشک موضوع پر اپنے قلم کو جنبش دی ہے وہاں ایسے ایسے شہ پارے تخلیق کیے۔ ''موجد و مفکر'' جیسی اعلیٰ پائے کی نادر نظم اس کی بہترین مثال ہے۔ ایک مختصر سے شعر سے اسی بات کو واضح کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

ذرّے کو ہتھیلی پہ جو دم بھر رکھا
محسوس ہوا نظامِ شمسی کا دباؤ

میری گفتگو جس نہج پر آ گئی ہے بلکہ اس کا رخ جس طرف مڑ گیا ہے اس ذہنی اور سائنسی ارتقا کی شاعرانہ خلاقی پیکر تراشی اس علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے۔ اس میں اپنے طور پر ایک جداگانہ اور انکشافاتی تخلیق کے تمام امکانات موجود ہیں۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے ذہن میں لکھ رہی ہیں انگلیاں، زندگی اور اس قبیل میں متعدد نظمیں حافظہ کے حصار میں موجود ہیں۔ جوش کی تمثیلیں اوجِ معنی کو فروغِ کہکشاں دیتی ہوئی اور بے زباں افکار کے منہ میں زباں دیتی ہوئی:

بے صدا معنی کو شیشے کی کھنک دیتی ہوئی
ولولوں کے آسمانوں کی دھنک دیتی ہوئی
کانپتے میزان پر ارض و سما کو تولتی
ذہن کے عقدوں کو لرزاں ناخنوں سے کھولتی

آخر میں اپنے خیالات کو سمیٹتے ہوئے جوش کی نمائندہ ترین نظموں میں سے ایک نظم ''زندگی'' کے ایک انمول بند پر اپنی گفتگو کا اختتام کرنا چاہوں گی۔ اس کے متعدد بند ایسے ہیں کہ اسے آپ کتنی ہی عمیق مایوسی اور اتھاہ تنہائی میں پڑھیں تب بھی زندگی میں اپنی تمام تر رعنائیوں اور برنائیوں کے ساتھ رجائیت کی راہوں میں بانہہ پکڑ کر یوں لے جاتی ہے کہ حیات میں بلکہ جوش کی زبان میں قوت حیات میں از سر نو یقین ہو جاتا ہے اور یہی رجائیت جوش کے کلام کا حاصل ماحصل بھی ہے کہ اس اتھاہ فکر انفس و آفاق میں ڈوبنے اور اس کی گتھیاں سلجھانے کے کٹھن راستوں سے گزرنے کے لیے یہ طرزِ فکر ناگزیر بھی ہے اور میرے نفس مضمون سے متصل بھی۔

زندگی مڑتے ہوئے پتوں پہ بوندوں کی دھنک
صبح سرما کی کرن شام بہاراں کی دھنک
بول تتلی کی اڑان آواز کوندے کی لپک

کوئی برکھا میں سارنگی کے تاروں کی لچک
شہرِ تن میں پھول والوں کی گلی ہے زندگی
گردنِ آفاق میں چمپا کلی ہے زندگی

سر پہ سہرا بر میں جوڑا چات میں قند ونبات
چال میں گنگا کی لہریں زلف میں برکھا کی رات
سانس میں بوئے سمن لہجے میں عودِ سومنات
زندگی رنگوں کے سائے میں گزرتی اک برات

جس کی قرنوں حجلۂ قدرت میں رکھوالی ہوئی
تتلیوں کی رسمساتی چھاؤں کی پالی ہوئی

اس نظم کا ایک اور امر بیت ملاحظہ فرمایئے:

ایک سنہری تان کی زنجیر بل کھاتی ہوئی
ایک انگڑائی دھنک کے پل لہراتی ہوئی

یہ صرف چند مثالیں ہیں اور اس حسنِ شعری کی اتنی مثالیں ہیں کہ یہ صرف ایک اشاریہ ہے۔

نعیم السحر صدیقی

جوش کا تصورِ عظمت انسان

اس سچائی کو ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ جوش کی شاعری کا ارتقاء فنی اور فکری دونوں لحاظ سے ہموار اور یکساں انداز سے نہیں ہوا۔ اس میں کئی تضادات اور نقائص راہ پا گئے۔ اس صورت حال کے اسباب ان کی تعلیم وتربیت کے جاگیردارنہ پس منظر اور اُن کی سیرت کی رومان پرستی میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس بات میں جتنی حقیقت ہے اُتنی ہی حقیقت اس بات میں بھی ہے کہ انسان دوستی، فطرت کے حسن سے وابستگی، وطن پرستی اور بنی نوع انسان کی عظمت اور وحدت کے میدان میں اُنھوں نے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اُن کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ اور آہستہ آہستہ اُن کی سماجی فکر میں یہ تصورات زیادہ استحکام حاصل کرتے گئے۔

جہاں تک انسانی عظمت کے تصورات کا تعلق ہے۔ مغرب اور مشرق میں اس کے کئی نظریے رہے ہیں۔ مغربی ادب میں یونانی تمثیل نگار سوفاکلیز سے لے کر برطانوی

ادیب چارلس ڈکنس تک بیشتر ادیب انسان کو مرکز کائنات سمجھتے ہیں۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ انسان کی فلاح کے لیے فطرت اور کائنات کی ہر شئے کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ مشرق خصوصاً ہندستان میں انسان خود فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اس کا دوست ہے اس لیے یہاں فطرت یا دوسری مخلوقات سے انسان کے رشتے بے حد دوستانہ رہے ہیں۔ اسی نے اہنسا اور عدم تشدّد کے تصورات کو جنم دیا۔

جوشؔ بلاشبہ ہندستان کے عظیم شعرا کالیداسؔ اور سنت کبیرؔ سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک انسانی عظمت کے بارے میں ہندستانی روایت کے وارث تھے۔ لیکن جوش عہد حاضر کی تعقل پسندی اور سائنسی بصیرت سے بھی انسانی عظمت کا مینار تعمیر کرنے میں فیض اُٹھاتے ہیں اور اس طرح سے جدید فکر سے قریب آجاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جوش کی باغیانہ اور انقلابی شاعری میں بھی انسان کی عظمت کا جوہر پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے ایک مضمون میں صحیح لکھا ہے:

> ''جوش کی انقلابی شاعری کا اوّل و آخر حوالہ عظمت انسان ہے۔
> اور جوش نے اس عظمت کے عرفان کے لیے قدرت شناسی پر
> زور دیا ہے۔''[1]

جوش اپنی نظم ''عظمت انسان'' میں کہتے ہیں:

مرغ زار و چمن و وادیٔ و کوہ و صحرا — سبزۂ و شبنم و ریحان و گل و سرو و صبا
ذرّۂ و اختر و مہر و مہ و دشت و دریا — سب یہ گونگے ہیں اُٹھائے ازلی سناٹا

کرۂ ارض و سما کھول رہا ہے انساں
اس خموشی میں فقط بول رہا ہے انساں

یہ ایک بند ہی اس کائنات میں انسان کی قدرت اور عظمت کے سارے پہلو اُجاگر کر دیتا ہے۔ گویا فقط انسان ہی ہے جو اس کائنات کے بھید اور قدرت کے اسرار کھول

کر انسانی زندگی کو خوبصورت اور بابرکت بنا رہا ہے۔ جوش کا ایمان تھا کہ انسان کی تخلیقی توانائی کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ وہ غلامی سے نجات پائے، اُسے جمہوری آزادی میسر ہو۔ لیکن انہیں اس حقیقت کا بھی علم تھا کہ یہ آزادی کبھی کبھی ایک نئی غلامی میں بدل جاتی ہے۔ ''آیات ونغمات'' اور ''عرش وفرش'' جس میں جوش کا لہجہ قدرے نرم اور سنجیدہ ہے۔ یہ سنجیدگی عمر کا تقاضہ بھی ہو سکتی ہے اور وقت کا بھی کہ اب ملک کی خستہ حالی اور غلامی کے موضوعات کو شاعر کی نظریں گہرائی سے دیکھ چکی تھیں۔ اور اس مشاہدے کا نتیجہ شاعر کے نزدیک یہ برآمد ہوا تھا کہ انسان مجبور محض بھی ہے اور ظالم و جابر بھی۔ اسی لیے نظم ''فطرت اقوام'' میں لکھتے ہیں:

ظلم لا انتہا سے تنگ آکر آدمی چاہتا ہے آزادی
پا کے اپنے حقوق اوروں کے چھینتا ہے حقوقِ بنیادی
پہلے تو ظالموں سے ڈرتا ہے اور پھر خود ہی ظلم کرتا ہے

بہ عنوان 'ایک طویل نظم' میں آدم کے نام سے جو حصہ مخصوص ہے وہ انسان کی قوت اور دائرہ عمل، انسان کی دلچسپیوں اور کیفیات کو بیان کر کے نوع انسانی کو حرکت اور عمل کی تلقین کرتا ہے۔ حضرت آدم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان کی کی کوششوں اور سرگرمیوں سے یہ دنیا خوبصورت اور ترقی یافتہ ہے گویا انسانی عظمت اور اس کے ممکنات کے احساس کا تاثر یہ نظم قائم کرتی ہے اور حقیقت و رومان کی آمیزش سے اپنی تکمیل کرتی ہے۔ نظم کا ماحصل بھی یہی ہے۔ اس نظم کی ابتدا میں فرشتوں کا جو اعتراض ہے اس میں جوش کے اپنے دل کی کسک بھی شامل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جوش بھی ان معترض فرشتوں کے ہم زبان ہیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس طرح کے نکتہ آفریں مکالمات سے جوش کی شاعری بھری پڑی ہے۔ جو فساد، سرکشی اور بدکرداری و بدنظمی کے ذمہ داروں کو دیکھ کر ہمیشہ ان کے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ ایک مثال پیش ہے:

ماسوا اس کے ضمیرِ آب و گل میں ہے جنوں   خاک پر تیری بہائے گا شقی انساں خوں

حشرت تک بوتا رہے گا کشت جاں میں تخم شر   اور کبھی انجام سے بھی یہ نہ ہوگا بہرہ ور

طبعِ عالی پر گرانی ہوگی بے حد و حساب   فتنہ خوابیدہ کو رہنے بھی دے مصروف خواب

معترض فرشتوں کو خدا کا جو جواب ملتا ہے وہ بھی جوش کی شاعری میں خصوصیت سے ادا ہوا ہے۔ یعنی انسان کی عظمت اور مرتبہ کا احساس۔ مثلاً:

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی
کون انساں؟ نازِ مخلوقات و فخرِ زندگی
شاہِ گیتی، صاحبِ آفاق، دارائے حیات
ابرِ رحمت، وارثِ فطرت، رئیسِ کائنات
روشنی کا نغمہ، فطرت کا سخن، حق کا پیام
مہر و مہ کا مقتدا، سرکش عناصر کا امام

جوش کے مجموعے الہام و افکار میں بھی زندگی انسان، انسانی وحدت اور تعقل پسندی کی ترجمانی کرنے والی چند شاہکار تخلیقات شامل ہیں۔ مثلاً اکتارا، زندانِ مثلث، اے نوع بشر جاگ، امواجِ تخیل، آدمی نامہ، موجد و مفکر، لافانی حروف اور شادیانہ جیسی تخلیقات نہ صرف جوش کی بلکہ اردو شاعری کی سدا بہار قدر و قیمت رکھنے والی شاہکار نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جوش کی نظموں کا مشترک اور اساسی موضوع بنی نوع انسان کی عظمت کا تصور اور کائنات کو زیرِ دام لانے کی اس کی قدرت ہے۔ جوش کے دوسرے مجموعوں میں بھی عظمت آدم کا موضوع بہ تکرار ملتا ہے لیکن الہام و افکار میں اسے مزید دلکش شعری و تخیلی پیکروں میں سجا کر پیش کیا ہے، مثلاً آدمی نامہ میں آدم ذات کو ان تمام اُلوہی، روحانی اور فوق الفطری صفات کا مجسمہ دکھایا گیا ہے جو فرشتوں سے منسوب کی جاتی

ہیں۔ مثلاً:

آدمی ہے خاک کے منھ میں زباں	آدمی آہنگ بارو نغمہ خواں
سب ہیں گونگی آدمی آواز ہے	دہر کو جن قوتوں پر ناز ہے
آدمی کا ذہن، جبریل امیں	آدمی کا ناطقہ وحی مبیں
بس ہے ایک انسان جنسِ معتبر	درمیان تحت و فوق و بحر و بر

ظاہر ہے یہ انسان کی تخلیقی، ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا ایک مبالغہ آمیز بیان لگتا ہے اس لیے اسے ثابت کرنے کے لیے جوش نظم کے دوسرے بند میں انسانی تہذیب کی تاریخ سے ایسی برگزیدہ ہستیوں کو پیش کرتے ہیں جنہوں نے تہذیبِ انسانی کی تعمیر و تزئین کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

اس سلسلے کی دوسری اہم نظم ''زمین کا براق'' ہے۔ جس میں شاعر نے بہت فخر و ناز سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انسان اپنی علم و آگہی، تحقیق و تلاش اور دانشوری لے ساری کائنات کے اسرار و قوانین معلوم کر کے اُس کا حاکم بنتا جا رہا ہے۔ چاند تاروں کو مسخر کر رہا ہے۔ جوش کے یہاں عظمت انسان کا جو تصور ہے وہ ایک پیشین گوئی معلوم ہوتی ہے۔ جس کی حقیقت سے ہر صدی نقاب اٹھاتی جا رہی ہے۔ انسان ہی ہے جو ارض و سما کی ساری حریف طاقتوں کو زیر کر کے انسانی سر بلندی کا پرچم لہرا رہا ہے۔ یہاں تک کہ موت پر فتح پانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ یہ دو اشعار دیکھیے:

ابھی نہیں نہ سہی، کل یہ نعرہ گونجے گا
کہ دہر کا ہے بشر قادر و اعلی الاطلاق
مسیح وقت، پئے قطع حرف مرگ اے جوش
اُلٹ رہا ہے کتابِ حیات کے اوراق

عظمت آدم کے بارے میں دو نظمیں ''عروجِ انسانی'' اور ''اے نوعِ بشر جاگ''

بھی اپنی فنی تعمیر اور پیکر تراشی کے لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ''عروجِ انسانی'' صرف انسان کی قوت و قدرت کا رزمیہ نہیں بلکہ اس میں ایک دقیق اور جرأت مندانہ فلسفیانہ پیغام بھی ہے۔ ایسی نظموں کو پڑھ کر کم سواد قاری جوشؔ پر الحاد کا الزام لگاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ خدا کے وجود کا انکار نہیں کرتے صرف یہ دکھاتے ہیں کہ خدا نے زمین پر جس انسان کو بھیجا تھا اس نے عقل و ذہانت اور اپنی بے کراں تخلیقی قوتوں سے اس دنیا کو کتنا حسین بنا دیا ہے۔ انسان کے لیے عیش و نشاط کے کتنے سامان پیدا کر دئے ہیں۔ انسان اس زمین پر ایسے مناظر پیدا کرتا ہے جو نابود تھے۔ چاند کے بعد مرّیخ پر پہنچنے کا سامان ہو رہا ہے۔ جوش شاعرانہ اشاریت اور تمثالوں سے بتاتے ہیں کہ خدا اور انسان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں۔ کوئی کشمکش نہیں۔ جن کار ہائے جہاں کی تکمیل کے لیے خدا نے آدم کو زمین پر اُتارا تھا وہ انہیں کاموں کی تکمیل کر رہا ہے۔ اور اب تو سائنس اور ٹکنالاجی کے ذریعے انسان اور دوسری مخلوق بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے شاعر یہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ دن بھی آسکتے ہیں کہ جب عبد اور معبود اپنی تمام لاثانی توانائیوں کو لے کر ایک رنگ ہو جائیں گے۔

''نظم اے نوعِ بشر جاگ'' کا آغاز گرد و پیش کے معاشرتی مظاہر پر تنقیدی تبصرے سے ہوتا ہے۔ یہاں وہی شاعر جو انسانی عظمت کا قصیدہ خواں ہے انسانی وجود کے تاریک اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے لیکن ساتھ ہی بیدار ہونے کا پیغام بھی دیتا ہے۔ اس طرح جوش اپنی فکر کو تنقیدی شعور کا تابع کر کے ایک توازن قائم کرتے ہیں۔ جس طرح کائنات اور انسانی وجود کے ارتقا میں یزداں اور اہرمن کی دو متضاد قوتیں کارفرما رہی ہیں اسی طرح انسان کا خمیر بھی ان متضاد قوتوں کے خمیر سے عبارت ہے۔ مثال کے لیے دو بند پیش ہیں:

آبا کے فسانوں کا تجھے اب بھی ہے سرسام
مبروص تیرا ذہن، تیری عقل زبوں گام
جھولی میں تیری آج بھی اے بستۂ آلام

سیلے ہوئے اقوال ہیں، چکٹے ہوئے اوہام
اے کشتۂ اجداد، بپۓ نقد و نظر، جاگ
اے نوعِ بشر، نوعِ بشر نوعِ بشر جاگ، اے نوعِ بشر جاگ

تو جنسِ تعصب کا خریدار ہے اب تک
ملکوں کے گھروندوں میں گرفتار ہے اب تک
دل وحدتِ اقوام سے بیزار ہے اب تک
تو مشرک و خوں خوار و سیہ کار ہے اب تک
انسان کے اے دیدۂ توحید نگر، جاگ
اے نوعِ بشر، نوعِ بشر نوعِ بشر جاگ، اے نوعِ بشر جاگ

''اکتارا'' جوش کی ایک شاہکار نظم ہے۔ جس میں انسانی عظمت کے نقوش تو ابھرتے ہی ہیں لیکن اس سے زیادہ نظم کی تمثالوں اور علامتوں کے مترنم سائے میں انسان کی وحدت کا تصور بھی سانس لیتا دکھائی دیتا ہے انسانی وحدت جوش کی سماجی فکر کا کعبہ ہے۔ وہ بار بار اس موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ''اکتارا'' جیسی گہری اشاراتی نظموں کے آہنگ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش انسان کو ہر طرح کی جغرافیائی، نسلی اور مذہبی حد بندیوں سے آزاد صرف ایک انسان کی شکل میں دیکھتے تھے اور اس کے اخلاق اور توانائیوں کا یہی نقش اجاگر کرتے تھے ''اکتارا'' نظم کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس کے دامن میں انسان کی وہ تمام سرگرمیاں، جذباتی وابستگیاں اور لاتعداد انسانی رشتے متحرک نظر آتے ہیں جن سے انسان اور انسانیت عبارت ہے خود اپنی ذات کو شاعر نے نظم کا مرکزی نشان بنا دیا ہے۔ مثلاً

سب کے کاجل، میرے پارے سب کی آنکھیں، میرے تارے
سب کی سانسیں، میرے دھارے سارے انساں، میرے پیارے
ساری دھرتی میرا آنگن
بول اکتارے جھن جھن، جھن جھن

جوش ان سبھی فطری یا غیر فطری دیواروں کو گرا دینے کے حق میں تھے جو اس زمین کے انسانوں کو بانٹ دیتی ہیں۔ اس لیے وہ نہ صرف انسان کی وحدت کے اجزاء وعناصر پر زور دیتے ہیں بلکہ ان اعلیٰ اخلاقی صفات کو بھی شاعرانہ حسن سے سامنے لاتے ہیں جو تمام مہذب انسانوں کی مشترک میراث ہیں۔ جوش وطنیت، قومیت، نسل و رنگ اور دین دھرم کے فرق کو اتحاد و اخوت کے عظیم رشتوں میں خلل ڈالنے کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اس لیے پیغام دیتے ہیں:

تفریق جو سکھائے وہ تاریخ پھاڑ دے جغرافیہ کا محبسِ دیریں اجاڑ دے
نقشوں کی نیش دار لکیریں بگاڑ دے ایمان اور کفر کو دامن سے جھاڑ دے

للہ، افتراق کا دروازہ بند کر
اُٹھ اور لوائے وحدتِ انساں بلند کر

دنیا کے ہر خطے میں علم و ادب کے سارے ذخیرے قلم کی دین ہیں۔ جوش کے یہاں بھی قلم انسانی عقل و خرد اور تفہیم و تلاش کی علامت ہے۔ دنیا میں تعمیر اور ترقی اور تدریس کی جو روشنی ہے اور جس کے فیضان سے ایجادات و ترقیات نے جنم لیا وہ قلم ہی کا عطیہ ہیں۔ اس حقیقت کو جوش نے ایک محکم عقیدے کی طرح نظم کے پیکر میں سمویا ہے۔ اور اس کے لئے بڑی نادر تشبیہات اور استعارات سے کام لیا ہے۔ نظم ''لافانی حروف'' کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اُنگلیاں، چھلکا چکیں گی جب معانی کے ایاغ
جل اُٹھیں گے، دائروں کے طاق میں لاکھوں چراغ
سرمئی سطروں کی گلیوں میں بہے گی طرفہ نہر
جگمگا اُٹھیں گے ساحل پر خرد افروز شہر
یوں، تجلّی نقطوں میں ہوگی، تابِ دُربائے عدن

شاعروں کی مفلسی، شاہوں پہ ہوگی خندہ زن

''خردافروز'' کی ترکیب سے شاعر توہمات اور روایتی معلومات کے بجائے جدید سائنسی فروغ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ''موجد و مفکر'' میں بھی اسی فکر کی شاعرانہ توسیع ہے۔ پوری نظم علم و ایجادات کے ہاتھوں انسان کی مادّی اور تہذیبی زندگی کا رزمیہ ہے۔ یعنی کس طرح انسان نے ارض و سما، اور اس کے قوانین پر فتح پائی۔ کیسے نئی ایجادات نئی نئی سہولتوں اور آسائشوں سے انسان کے دامن کو بھر دیا اور ان سب کے نتیجہ میں کیونکر انسانی تہذیب نئے انقلابات اور فروغِ انسانی کے نئے علاقوں میں داخل ہوئی۔ نظم کے دو بند مثال کے لیے پیش ہیں:

آرزوئے خانہ آرائی کی شمعیں جل اُٹھیں   کسمسا کر، صنعتِ نوخیز نے آنکھیں ملیں
طفلکِ تعمیر نے، بیونتی قبائے ماہ وَطیں   سر پہ رکھ کر، گنبدوں کے قمقمے ناچی زمیں

سنگ ریزے ناز سے ہمکے، منارے بن گئے
کروٹیں، ذرّوں نے کچھ یوں لیں کہ تارے بن گئے

--

ذوق، نکھرا، کہکشانی بام و در بننے لگے
سنگ ریزے آئینے، قطرے گہر بننے لگے
برق پارے، مرغ ہائے نامہ بر بننے لگے
آہنی اعصاب، ڈھل کر بال و پر بننے لگے
زندگی، اوجِ ثریّا کی طرف جانے لگی
قلبِ انجم کے، دھڑکنے کی صدا آنے لگی

(آہنی اعصاب سے مراد ''طیارہ'' ہے) نظم کے ابواب کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شاعر نے کس طرح سائنس اور صنعت کے ارتقا کو شاعرانہ لب و لہجہ میں پیش کر دیا ہے۔

نظم ''مرحمتِ بے جا'' میں شاعر کو خدا سے جو شکایت ہے اُس میں گھن گرج نہیں بلکہ ایک طرح کی سپردگی، عقیدت، داخلیت، جذبہ اور یاسیت ہے۔ جوش جب اس قسم کی آسان فہم اور سادہ اسلوب کی نظمیں لکھتے ہیں تو اُن میں حقائق کا پرتو واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے مثلاً زندگی کی ناہمواریوں، تکلیفوں اور اضداد کو دیکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

داورا، زندگی نہ دی ہوتی — ہم پہ یہ مرحمت نہ کی ہوتی
تو حقیقی و سرمدی ہوتی — اور اگر ناگزیر تھی ہستی
زندگی سربسر خوشی ہوتی — یا یہ ہوتا کہ گود سے تا گور
غم میں اک گونہ چاشنی ہوتی — ہرخوشی کا مآل اگر غم ہے
طینت آدمی وہی ہوتی — داورا، جو تری مشیت ہے
ہم کو یہ بد دعا نہ دی ہوتی — تم رہوگے حریف آپس میں
اک دیے میں تو روشنی ہوتی — ایک دل تو ہرا بھرا ہوتا

اس طرح جن نکات اور نظریات سے جوش نے اپنی شاعری کی تعمیر کی ہے ان سے وہ انسان نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جو زندگی کے ہر میدان میں مصروفِ عمل ہے۔ طبقاتی نظام میں یہ عمل مثبت بھی ہے اور منفی بھی ان انسانوں میں مفسد، مولوی، مصلح، ہادی، رہبر، مفلس اور زردار سبھی شامل ہیں۔ جوش کے یہاں انسان کی بے حرمتی کا احساس ہی انسان کی عظمت کا تصور پیدا کرتا ہے اور یہ تصور طنزیہ صورتوں میں جوش کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شاید کچھ لوگ اس سماجی فکر کو کمتر خیال کرتے تھے اسی لیے جوش سے بھی اقبال کی طرح اعلیٰ اور ہمہ گیر فلسفے کی امید کرتے تھے۔ جو آفاقی ہو، خواہ عملی نہ ہو۔ علامہ اقبال کے یہاں انسان کی عظمت کا جو تصور ہے اُس کا سرچشمہ جرمن فلسفی نطشے کا فلسفہ کہا جاتا ہے۔ جوش بھی نطشے سے متاثر تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنا مجموعہ ''سنبل وسلاسل'' (۱۹۴۷ء) ''امیر فکر و تخیل نطشے اعظم'' کے نام منسوب کیا ہے۔ وہ نطشے کو ایک بڑا مفکر ضرور مانتے تھے

لیکن اس کے ساتھ کارل مارکس کے جدلیاتی اور انسان دوست فلسفہ کو بھی عزیز رکھتے تھے۔اور صرف ایک مردِ کامل کو نہیں ہر انسان کو استحصال سے آزاد ہو کر بلند ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔نطشے مادّہ پرست اور ذاتِ خداوندی کا منکر تھا۔لیکن جوش مذہب کے نام نہاد اجارہ داروں سے برہم و بیزار ہونے کے باوجود شاید خدا کے ایسے منکر نہیں تھے۔سچ تو یہ ہے کہ انسان کی عظمت پر ان کا پختہ عقیدہ ہی انہیں خدا کے قریب لے گیا۔ان کی نظم ''عظمتِ انسان'' کا یہ بند دیکھیے:

ذہن جس وقت کہ ہو جائے گا انساں آگاہ تو نکل آئے گا خود پردۂ انساں سے اللہ
وحدتِ انفس و آفاق کو پالے گی نگاہ اور شریعت یہ بنے گی کہ تکدّر ہے گناہ
شور ہوگا نہ رہے کوئی وفا کا دشمن
بے شک انسان کا دشمن ہے خدا کا دشمن

شبیر حسن خاں

اے جوش میں افغان ہوں حسبِ نسب جسم
حسب نسبِ طبع ہوں منجملۂ سادات
(دقائق)

جوش ملیح آبادی کی شاعری اور شخصیت کی داستان اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب کے عروج وزوال کی داستان ہے۔ اردو شاعری سے میری مراد ان تمام اشعار سے نہیں جو انشاء سے لے کر ابن انشاء تک لکھے گئے۔ بلکہ اردو شاعری کے اس سرمائے سے ہے جس میں ایک روایت اور ایک تسلسل کا نشان ملتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی تہذیب سے میری مراد وہ ثقافت ہے جس پر ابھی وجودیت اور تجرید کی پرچھائیاں نہ پڑی تھیں، اور جو مغل سلطنت کے زوال کے باوجود، انگریزی حکومت کے دوران میں بھی اپنی قدیم آب وتاب محفوظ رکھ سکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد خود اپنے حق میں اس بات کو ضروری اور مناسب سمجھا کہ اس ثقافت سے بالواسطہ جھگڑا مول نہ لیں۔ اسی لئے انگریزی زبان اور رسم الخط اور عیسائی مدرسوں کے باوجود، ہم لوگ فارسی اور اردو سے یکسر منحرف نہیں ہوئے۔

دنیا کے اکثر ملکوں نے اس دوسو سال کے عرصے میں جس رفتار کا مظاہرہ کیا، اس کے

مقابلے میں ہم پس ماندہ رہے، لیکن بہ عجلت، یا بہ تاخیر، ان تمام تحریکات کا کچھ نہ کچھ ردِ عمل ہمارے یہاں بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ ڈارون اور کارل مارکس اور ریلوے انجن کی آواز ہم تک بھی پہونچی۔ یورپ میں ان آوازوں نے بڑی بڑی لہریں پیدا کی تھیں ہمارے یہاں اتنی بڑی لہریں تو نہیں اٹھیں، لیکن ثقافت کی سطح پر ارتعاش ضرور ہوا۔ اُس وقت ہمارا ذہنی معیار کچھ ایسا تھا کہ ہم میں سے بیشتر آدمیوں نے اس ارتعاش کو طوفان، اور اس ہلچل کو بغاوت سمجھ لیا.........اور جوش ملیح آبادی شاعر انقلاب کہے جانے لگے۔

اس انقلاب سے ہماری مراد کوئی بین الاقوامی تبدیلی، یا انسان کا چاند کو مسخر کرنا نہ تھا۔ بلکہ صرف انگریزوں کی حکومت سے بیزاری کا اعلان تھا۔ اس کے مقابلے میں اگر فرانس کے انقلاب یا سوویت انقلاب یا انگلستان کے غیر خونی انقلاب ہی کی داستانیں پڑھی جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے نظریۂ انقلاب اور ان ملکوں کے نظریۂ انقلاب میں کتنا بنیادی فرق تھا۔ وہاں سوال محض ایک حکومت کی تبدیلی کا نہ تھا، بلکہ ایک معاشرے، ایک آئیڈیالوجی اور ایک پوری ثقافت کی تبدیلی کا تھا۔ یہاں ہم صرف اسی بات سے خوش ہونے لگے تھے کہ ہوم رول ملنے والا ہے، اور دو کانگریسی اور ایک مسلم لیگی ارباب حکومت میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ نظریہ ماسوائے چند بالغ نظر عالموں، اور لیڈروں کے، سب کا تھا۔ اس میں اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹی کے طلبا اور پروفیسر، تاجر، دستکار اردو پڑھنے والے، سب شامل تھے۔

جوش کے انقلاب نے ہمیں اسی لئے اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیا کہ جس نظریے کو ہم ''بہت بڑی بغاوت'' سمجھتے تھے، اسے جوش نے بلند آواز، بلند آہنگ اور شعری شدت کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس طرح یہ ہوا کہ جوش خود اپنے آپ کو ''انقلاب'' کا ''پیغمبر اور اپنے کلام کو صحیفہ سمجھنے لگے۔

اے روحِ عصرِ حاضر ہندوستانِ نو
لایا ہے اک صحیفہ سخن داں ترے لئے
اس مصحف عظیم کی اللہ ری وسعتیں
ہر مد ہے مشرقین بہ داماں ترے لئے

(تہدیہ)

☆☆

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' وہ نظم تھی، جس نے بائرن کی چائلڈ ہیرالڈ (Childe Harald) کی طرح اپنے مصنف کو رات ہی رات میں مشہور کر دیا۔ اس نظم میں بھی کسی نظریے کا اعلان نہ تھا، بلکہ تاریخی پس منظر کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ اے فرنگی بھیڑیو! تم جرمن فاشزم کے ''گرگ دہن آلود'' ہونے کا کس منہ سے تذکرہ کرتے ہو جب کہ تمہاری اپنی تاریخ میں ''وارن ہیسٹنگز'' اور ''ڈائر'' کے نام موجود ہیں۔

لکھنؤ اور ملیح آباد کے نواب زادوں کی صحبت میں غالباً اس سے بڑی بغاوت جوش کے لئے ممکن بھی نہ تھی۔ اسی پر اس زمانے میں یہ افواہیں آنے لگی تھیں کہ جوش صاحب گرفتار ہو گئے۔ اور جوش صاحب نے ''ہٹلر اعظم'' کے عنوان سے ایک معرکہ آرا نظم لکھی ہے۔ جو عنقریب ''کلیم'' میں شائع ہونے والی ہے۔ جو لوگ ''کلیم'' کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے رہے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ ''کلیم'' کے ایک شمارے میں جوش ملیح آبادی کے نام کے نیچے ایک عنوان ''تلاشی'' چھپا تھا اور نیچے نظم نہ تھی، بلکہ یہ اعلان تھا کہ پریس نے یہ نظم چھاپنے سے انکار کر دیا ہے۔

ان نظموں کی کامیابی کی وجہ متذکرہ بالا امور اور ملک کی سیاسی فضا کے علاوہ یہ تھی کہ بنیادی طور پر جوش کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک ''نظریہ'' میں لگن کے علاوہ اس کے تمام پہلو بھی کھنگال ڈالیں۔ وہ شعری معائب ومحاسن پہچان سکتے تھے۔ بغاوت کو گھن گرج کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ اور یہ غلط ہے کہ مدھم اور شبنمی لہجے میں اس کا ذکر ان کے لئے ناممکن تھا۔ جوش کے نقادوں نے ان کے ساتھ بڑی بے انصافی یہی کی ہے کہ ان کے اس کمال فن کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ اشعار سنئے۔

بلقیس سے کہو کہ سر بارگاہ ناز
پریاں کھڑی ہیں تخت سلیماں لئے ہوئے

(زنداں کا گیت)

غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
مسکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے

(وطن)

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں
باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں

(شریک زندگی سے خطاب)

جوش کے لئے جہاں یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی آواز میں بندوق کی تاثیر بھر دیتے، وہیں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے لحن میں ڈھلتی ہوئی شاموں کے سائے پھیلا دیتے۔ لیکن کسی آئیڈیالوجی سے جذباتی اور غیر جذباتی دونوں اقسام کی محبت بیک وقت ان کے لئے ممکن نہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ۴۶ء.....۴۷ء تک جوش ملیح آبادی جو نئے شعراء کے امام اور نئی نسل کے ہیرو تھے یکا یک بوڑھے اور قدیم معلوم ہونے لگے۔

اس نئی نسل کا ایمان ابھی ایمان مستحکم نہ تھا۔ جوش کے وہ مقلد شعراء جن سے خود شعر کے مستقبل کو امیدیں ہونے لگی تھیں۔ پھلجڑیوں کی طرح چمک چمک کر بجھ گئے۔ ان میں ایک طرف تو ہنگامی نمود کی خواہش تھی اور دوسری طرف جذبہ کی ناپختگی تھی۔

نتیجتاً میر سجاد اشناس لشکریاں شکستہ صف کا معاملہ ہوا، اور شدید ردِّ عمل کے طور پر جوش کے جو محاسن تھے وہ بھی معائب نظر آنے لگے۔ میرے عزیز خلیل الرحمٰن اعظمی کا جو مضمون جوش پر ہے بلیغ اور جامع ہونے کے باوجود اس ردِّ عمل کی غمازی کرتا ہے۔ صرف فیض احمد فیض نے اس بحران کے زمانے میں بھی جوش کے امتیازی سیاسی افکار کا جائزہ دیانت داری سے لیا تھا۔ فیض نے جو کچھ کہا تھا اس کا اعتراف خود جوش نے کیا ہے۔

میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے کچھ عاشقانہ رنگ ہے
چند زلفوں کی سیاہی چند رخساروں کی آب
گاہ حرفِ بے نوائی گاہ شورِ انقلاب

وہ بھی کچھ جاگیر دارانہ بقولِ ناقداں
بے سوا دوبستۂ رسم ورہِ رومانیاں
بے خبر تھا میں کہ دنیا راز اندر راز ہے
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے
پا رہا ہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات
کیونکہ اب پیش نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات
ایک منا سا ستارہ ایک ننھا سا شرار
یہ تزلزل، یہ تلاطم، یہ تموج، یہ فشار

(اعتراف عجز)

لیکن سیاست کے کھوکھلے پن کے ردعمل کے طور پر اگر ''کائنات کی تسخیر'' کا نسخہ استعمال کیا جائے تو ذہنی صحت کے لئے کبھی مفید نہیں ہوسکتا اس کائنات میں بھی جوشؔ نے ''منے سے ستارے'' کی ماہیت سمجھنے سے قبل ہی ''خدا'' کو اپنا حریف اور مد مقابل بنالیا۔ اور ایک ایسی ذہنی جنگ مرتب کی جس میں ایک طرف دنیا بھر کے مولوی اور راحب اور برہمن تھے اور دوسری طرف وہ تن تنہا تھے۔ ان کے بقول اس جنگ میں مادّی فتح خدا کو اور روحانی فتح انہیں نصیب ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو امام حسین جیسا مظلوم اور ہر مولوی کو یزید سمجھنے لگے۔

فارسی میں قاآنی اور عرفی اور اردو میں انیس اور سودا کا جو مخصوص طریقہ اظہار تھا وہ جوشؔ کو ورثہ میں ملا تھا، اس ورثے میں شوکت وطمطراق کے علاوہ طنز واستہزاء کی بے پناہ قوت بھی تھی۔ اس ذہنی جنگ میں جس حد تک ممکن ہوا، جوشؔ نے اپنی اس صلاحیت سے کام لیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ''ایہا الناس'' کو مخاطب کیا ۔

اے مردِ خدا نفس کو اپنے پہچان
انسان یقین ہے اور اللہ گمان
میری بیعت کے واسطے ہات بڑھا
پڑھ کلمۂ لاالہٰ الا انسان

پھر اپنے حریف کے لشکریوں کی تفصیل بیان کی۔

اپنے جسم عقائد پہ نہیں وہ گہنے
اب کوئی مجاور نہیں بائیں دہنے
بےچارے پڑے پھرتے ہیں مارے مارے
ٹوٹے جوتے پھٹی عبائیں پہنے

پھر جنگ اور مناظرے کا سماں پیش کیا ہے۔

تحقیق و تجسس نہ دلیل و برہان
پھر بھی مذہب پہ مر رہے ہیں انسان
اب دین کی جھولی میں دھرا ہی کیا ہے
کج ضابطے، کھکھ صحیفے، کھکھل ایمان

پھر اس جنگ میں اپنی شکست اس طرح تسلیم کی ہے۔

اللہ ری بانیانِ ادیان کی آب
اُترا نہیں اب تک ان کا دریائے شباب
یہ ان کے ہی انفاس کی ہے سخت گرہ
ٹوٹے نہیں آج تک مذاہب کے حباب

اس شکست کے بعد، سوائے اس کے کیا باقی رہ گیا تھا کہ فاتح کے ذمائم اخلاق بیان کیے جائیں۔

ہے واقعی فتنگم تو کھوٹا ہے خدا
سونا جس میں نہیں وہ گوٹا ہے خدا
شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ
شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا

اس ''جنگ'' کے بیان میں میں نے کسی کی طرف داری نہیں کی۔ میں تو خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کاش جوش خدا کے سچے منکروں میں ہوتے تو ہمیں ان کے اس نوع کے کلام میں ٹوٹے جوتوں اور پھٹی عباؤں کے علاوہ بہت کچھ مل جاتا لیکن ابتدا سے اب تک کبھی جوش ان سچے منکروں

کے حلقے میں شامل نہیں ہوئے۔ ''سنبل و سلاسل'' کی تمام رباعیوں اور ''عرش و فرش'' کی تمام نظموں کے باوجود جوشؔ صاحب کے الحاد کا ڈانواڈول ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ جوشؔ صاحب نے کارل مارکس کی شان میں ایک ڈھیلا ڈھالا قصیدہ بھی لکھا ہے، اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف داری بھی گاہ بہ گاہ کی ہے لیکن ان کے ہیرو نہ کارل مارکس بن سکے نہ جوزف اسٹالن، بلکہ ہمیشہ انہوں نے امام حسینؑ کو اپنا قبلۂ نظر جانا اور مانا ہے۔ تاریخ میں امام حسینؑ اور فطرت کی علامتوں میں صبح صادق... ان دونوں کے آگے انہوں نے ہمیشہ سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ اور یہ دونوں ان کے وجود کے رہبر رہے ہیں۔ جوشؔ کا المیہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کو انہوں نے اپنی منزل نہیں جانا، بلکہ منزل کا سراغ دینے والا سمجھا ہے۔ اور یہ آخری منزل خود ان کے الفاظ میں خدا کی ذات ہے۔

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات
اک کارساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

(حسینؑ اور انقلاب)

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی
زہاد ہی نہیں ہیں ترے غم میں اے حسینؑ
ہم رند بھی ہیں حلقۂ ماتم میں اے حسینؑ

اس سے ''حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؑ'' کے علاوہ اور کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ افسانہ نگار یا شاعر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہر کہانی یا ہر شعر سے کسی اخلاقی اصول کا سبق دے یا کوئی بات ''ثابت'' کرے۔ محض محسوسات کی تجسیم سے بلند شاعری وجود میں آسکتی ہے۔ اور اگر ''ثابت'' ہی کرنا ہے تو اس کے لئے حکیم کا طریق کار اختیار کرنا چاہئے نہ کہ مداری کا (خدا اور ''مذہب'' کی بات

تو در کنار، جوش کا یہی Mock T Heroic لہجہ اس وقت بھی برقرار رہا ہے، جب انہوں نے صنف غزل کو لغو اور لچر "ثابت" کرنے کی کوشش کی ہے)

طویل نظم "حرف آخر" کے ابتدائی حصوں میں جوش نے حکیم کا مسلک اختیار کیا بھی، لیکن اسی "ثابت" کرنے کی دھن کی وجہ سے وہ اس مسلک کو آخیر تک ریاض کے ساتھ قائم نہ رکھ سکے۔ تخلیق سے پیشتر سینۂ عدم میں وجود کے پیچ وتاب کی نزاکت کا اظہار جوش ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری اردو شاعری کے لئے قابل فخر ہے۔ اس طویل نظم میں جوش نے جب تک مروجہ مذہب کے افکار و ہدایات کو نظم کیا ہے، تب تک وہ بلند ترین شعری پرواز سے نیچے نہیں اترے لیکن منظر ۱۵ کے وسط سے ہی پرواز کی تھکن ظاہر ہونے لگتی ہے۔ ابتدائی منظر کے اکثر مصرعے اور نثر کے ٹکڑے تو قرآن حکیم کی آیات کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

بارگاہ نور میں حاصل ہو کیوں ظلمت کو بار	وَ نَحنُ وَ نُسَبِّحُ بِحَمدِكَ وَ
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار	نُقَدِّسُ لَکَ ط البقر. منزل ،وع ۲
لیلئ اسرار کو پہچان سکتے ہی نہیں	قَالَ اِنّی اَعلَمُ مَالَا
جو ہے میرے علم میں تم جان سکتے ہی نہیں	تَعلَمُونَ. البقر منزل، دع ۲
"ابلیس غرور سے گردن کو کج کئے ہوئے۔"	اِلَّا ابلیس ط اَبٰی وَا ستَکبَرَ
	وَکَانَ مِنَ الکَافِرِینَ ط

یہ نظم ابھی تک کہیں مکمل شائع نہیں ہوئی۔ اس کے کچھ حصے "رامش ورنگ" میں، کچھ ماہ نامہ "آج کل" میں اور کچھ ماہ نامہ "ساغر" میں چھپے ہیں۔ کہیں کہیں یہ بھی ہے کہ جوش صاحب نے اپنی پرانی نظموں، غزلوں کے ٹکڑے جا بجا چسپاں کر کے نظم کا تسلسل برقرار رکھا ہے۔ مثلاً "حوروں کا ترانۂ مبارک باد" اس نظم کے تقریباً دس سال قبل ایک غزل کی صورت میں شائع ہوا تھا، اور مندرجہ ذیل دو شعر جواب نظم میں شامل نہیں، اس وقت غزل میں شامل تھے

گدائے رہ نشین و بے نوا کو
غرورِ صحبتِ سلطاں مبارک
جناب جوش کو یہ کامرانی

بہ فیضِ قربِ درویشاں مبارک

منظر ۱۴ میں ابلیس کا نعرہ ''جنون و حکمت'' میں علیحدہ رباعی کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

خود کو گم کردہ راہ کر کے چھوڑا
حوا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا نہ کئے حضور والا نے جتن
آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

اصل رباعی میں تیسرا مصرع ذرا سے اختلاف کے ساتھ یوں تھا۔

کیا کیا نہ کئے خدا نے جنت میں جتن

میں نے ابھی ابھی محسوسات کی تجسیم کا ذکر کیا ہے۔ اس نوع کی شاعری میں جوشؔ ملیح آبادی کا اردو ہی میں نہیں، بلکہ ساری دنیا کے ادب میں کوئی حریف نہیں۔ ڈرامائی کیفیات، نازک سے نازک آبگینے میں تیز سے تیز شراب کو ڈھال دینا جوشؔ کے اختیار میں ہے۔ اسی نظم کے منظر ۱۳ میں خالص جنسی ہیجان کو جس خوب صورتی سے جوشؔ نے نظم کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں
یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں دواں
بیداریوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے
کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کئے ہوئے
آنکھوں سے ایک بھاپ سی اٹھتی ہے گرم و سرد
پنڈے کے پھیکے پن میں ہے کیسے مزے کا درد
رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں
رخ سے لٹوں کے چھوتے ہی اٹھتا ہے اک دھواں
پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بری
پہلو سے زلف مَس ہو تو آتی ہے جھرجھری
سیال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن

معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن

"پہلو سے زلف مَس ہو تو آتی ہے جھرجھری" کی کیفیت کو جوشؔ سے کم رتبے کا کوئی شاعر بیان کرے تو یا وہ سپاٹ ہو کر رہ جائے گا یا فحش اور ابتذال کے دائرے میں آجائے گا۔

جنسی جذبے کے بارے میں جوشؔ کے کلام میں کوئی Taboo نہیں ہے۔ "روحِ ادب" اُن کا پہلا اور واحد مجموعۂ کلام ہے جس میں انہوں نے محبت میں روحانیت کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں بھی بعض اشعار ایسے ہیں جن کا کوئی روحانی ترجمہ ممکن نہیں۔ مثلاً

رنگیں رخوں نے ذبح کیا دل کو ریل پر
مرنے کو اور جائیے پنجاب میل پر

رفتہ رفتہ انہوں نے نہ صرف روحانیت کا دعویٰ ترک کر دیا، بلکہ محرکاتِ عشق سے روحانی عمل کو یکسر خارج کر دیا۔

مگر یہ اب پول کھل چکا ہے
کہ عشق ہیجان جسم کا ہے
نہ عشقِ اعلیٰ نہ عشقِ احسن
فقط اک اعصاب کی ہے اینٹھن

(سراب)

بہ ظاہر اعصاب کی اینٹھن کی شاعری سے بڑی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں، اور بڑے بڑے قادر الکلام شاعر مثلاً فراقؔ گورکھپوری، اس ضمن میں اپنے دامن کو چھینٹوں سے نہ بچا سکے۔ لیکن جوشؔ کا کلام روڈین (Rodine) اور ہنری مور (Henry moor) کے سنگِ مرمر کے برہنہ مجسموں کی طرح دودھ میں دھلا ہوا اور آلودگی سے پاک ہے۔ اس میں چبھن ہے کسک ہے، داغؔ اور جراتؔ کے مضامین بھی ہیں، معاملہ بندی بھی ہے، لیکن لذتیت نہیں بلکہ جمال ہے۔ یہ کسک کتنی شدید ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جس حسن نے یہ کسک پیدا کی ہے وہ کتنا قابلِ پرستش ہوگا۔ جوشؔ کے کلام میں اس جمال کی جھلکیاں ہیں لیکن ان کا کلام سنگار رس کا کلام نہیں جیسا کہ "روپ" کی رباعیاں ہیں۔

جوشؔ کے یہاں حسن سے زیادہ اہمیت اس تعلق کو دی گئی ہے جو حسن کی ذات سے ہے، اور یہاں وہ اپنے ہیرو خود بنے ہیں۔ ان کی محبت غالبؔ کی محبت کی طرح ہے جو مار کر رکھ دیتی ہے۔ لیکن غالبؔ کی محبت میں جو کائناتی شعور اور ژرف بینی تھی وہ جوشؔ کے یہاں نہیں ہے.... اور نہ محبت کے وہ سوانگ ہیں جو غالبؔ کی غزلوں میں رچے ہوئے ہیں، یہ محبت ایک باوقار افغان مرد کی محبت ہے۔ اس میں حوصلہ، امنگ اور مردانگی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس امنگ کا سنگ و آہن کی طرح گراں ہونا عیب معلوم ہونے لگتا ہے پچھلے پانچ چھ سال کے کلام میں پسپائیت کی جو مدھم سی لکیر جوشؔ کے یہاں ملتی ہے وہ اپنے ماہ و سال کی رفتار سے ہے۔ اس بات سے ہے کہ ''ہو گئے مضمحل قویٰ غالبؔ'' اس کی سب سے اچھی مثال ان کی نظم ''ژالہ باریاں ہے، جس کے چند شعر سنتے چلیے۔

کل تک یہ جشن تھے کہ مرے در پہ رات کو
رکتی تھیں گیسوؤں سے مہکتی سواریاں
اور یہ بھی وصف تھا کہ مرے اشتیاق میں
آتی تھیں بیاہیوں سے زیادہ کنواریاں
دیتا تھا قرض ماہ وشوں کو سرور شعر
اور اس کی آڑ میں تھیں بڑی سودخواریاں
اب بے دلی کے دشت میں بنتا ہوں خار و خس
کل تتلیوں کے رنگ میں چنتا تھا دھاریاں
سب سے زیادہ خوف ہے اس بات کا مجھے
دم توڑ دیں کہیں نہ مری وضع داریاں
مجھ کو بھی ایک روز بالآخر ڈبو نہ دیں
مجھ سے فقیہہ شہر کی یہ غم گساریاں

(ژالہ باریاں)

اسی خیال کو وہ بار بار دہراتے ہیں، کبھی نظموں میں، کبھی رباعیوں میں، کبھی مثنویوں میں۔ رباعیوں میں جوشؔ نے ایک ہی خیال پر مسلسل رباعیاں لکھی ہیں۔ اور ہیرے کے ہر رخ کو

چمکایا ہے۔ بنیادی تصور یہی ہے کہ جوانی کا کس بل نکل جانے کے بعد چونکہ محبت میں شدت نہیں رہ جاتی اس لئے زندگی موت سے سردتر بن جاتی ہے۔

کب راکھ پہ گرتے ہیں زمانے والے
شعلوں سے ہیں لاکھ لو لگانے والے
بوڑھا ہو کر وفات پاتا ہے جو عشق
ملتے نہیں اس کی لاش اٹھانے والے

ایک خیال کو مسلسل اور طرح طرح نظم کر سکنے کی قوت نے جوشؔ کے مجموعوں کی تعداد میں تو اضافہ کر دیا لیکن بنیادی مضمون چند ایک ہی رہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں کوئی موضوع نیا نہیں ہے۔ لیکن جوش کے عام موضوعات وہ تھے جو اس سے قبل سیکڑوں نظموں اور ادبیات کے عام موضوعات بن چکے تھے۔ قاآنی کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے۔ جوشؔ نے بھی مناظر قدرت، مناظر کوہ، دریا، پہاڑ، چشموں، گھٹاؤں اور ساونوں کا تذکرہ اسی ٹھاٹ سے کیا ہے جیسا کہ

"نسیم خلدمی وزد دگر ز جویبار ہا

میں ہے۔ ان کی نظم:

"بادل اٹھے ہیں دل کے دل

اسی طرح گونجتی، برستی، آگے بڑھتی ہے۔ جیسے دربار کے عام قصیدے ہوا کرتے تھے۔ اس سے محض جوشؔ کی قادرالکلامی کا نہیں بلکہ اس مخصوص ذہنی فضا کا پتہ چلتا ہے جس سے ان کے مزاج کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس مزاج پر لکھنؤ کی آب و ہوا کا اثر بھی ہے اور خاندانی نشو ونما کا بھی۔

"اپنے فلسفۂ زندگی" پر جو تقریر انہوں نے دہلی ریڈیو سے نشر کی تھی اسے پڑھئے تو ہر چند اس میں انہوں نے اپنے خاندان، وراثت اور ماحول کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا، لیکن اس کے ایک ایک لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ جوش ملیح آبادی کی پشت پر شبیر حسن خاں بول رہے ہیں:

"ابھی ہمیں۔ بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں لیکن ..... ہمیں اپنے کو اس قدر تھکانا بھی نہیں ہے کہ چاروں کام کرنے کے بعد ہمارے قوائے عمل و ذہن اور ہماری صحت برباد ہو جائے۔ ہمیں بے شک .... ایک جانباز سپاہی کی

طرح پوری کاوش اور سرگرمی سے کام کرنا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہر
روز چند گھنٹے رجائیوں کی سی زندگی بھی بسر کرنا ہے......دن کے وقت ہم
ایڑی چوٹی کا پسینہ بہائیں گے، اور رات کو جب..........ستاروں کی خنک
روشنی ہمارا احاطہ کرے گی تو ہم بچوں کی طرح خوشیاں منائیں گے۔"

اسی بات کو چھ سات سال بعد جوشؔ نے اس طرح نظم کیا ہے۔

دن بہادر کا بان، بیر کارتھ
رات چمپا کلی، انگوٹھی، نتھ
(پند نامہ برائے میاں مجاز.....)

جوشؔ موضوعات کی تنگی اور بیان کے ابلاغ کو کمزوری نہیں، بلکہ ہنر جانتے ہیں، بلکہ ان کو نئی نسل سے شکوہ یہی ہے کہ یہ نسل:

"شاعری میں بیان ہے سب کچھ"

کی ڈاکٹرن (Doctrine) کو غلط سمجھتی ہے انگریزی شعراء میں یہی فلسفہ پوپ اور اس کے بعد بائرن کا تھا۔ بائرن کے یہاں بھی بیان ہی بیان ہے۔ لیکن بائرن نے کہیں کہیں عمیق بصیرت کی نشانیاں بھی دی ہیں، مثلاً دنیا کے متعلق اس کا یہی ایک مصرع:

Don Juon saw that

Micriocasm on stilts

جوشؔ کے یہاں بھی اس بصیرت کا امکان تھا، اگر وہ خدا اور مولوی کے جھگڑے میں نہ پڑ گئے ہوتے۔ یا اگر ان کے یہاں ذاتی عمل کم از کم اتنا بھی ہوتا جتنا بائرن نے یونان کے بارے میں دکھایا تھا۔ جلال و جمال، رحم و انصاف، عدل و معدلت، عصمت و رحمت، ہر موضوع پر انہوں نے ایک طرف "خدا" کو اور ایک طرف "شبیر حسن خاں" کو مقابلے میں کھڑا کر دیا ہے۔

د رائے دو عالم کو نہیں فرصت رحمت
بیر حسن خاں کو یہ معلوم نہیں ہے
(لاعلمی)

میں جوش کی ذات کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں، اس کا ذکر کسی اسکیچ میں کروں گا۔

یہاں یہ بات ضمناً یوں آگئی ہے کہ جوش نے ناقد سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ۔

وہ داغِ سینۂ شاعر کو دیکھ سکتے کاش

جو لوگ شعر کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

(غزل ۱۹۲۵ء)

اس فلسفے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جس طرح بائرن تمام انگریزی رومانی شاعری سے علیحدہ اور تنہا رہ گئے تھے اسی طرح جوش ایک نئی نسل سے علیحدہ ہو کر تنہا رہ گئے۔

جوش کے یہاں بیان کی وسعت اور ایک طرز کے مضمون کو سو رنگ سے بندھا ہوا دیکھ کر اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ جوش اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے جس رفتار سے لکھنا چاہتے ہیں لکھتے ہیں، اور الفاظ ان کے آگے سر بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ یہ بات نہ صرف یہ کہ جوش کے لئے درست نہیں بلکہ کسی شاعر کے لئے بھی درست نہیں ہو سکتی۔ جوش اپنے اشعار کو نکھارنے اور سنوارنے، اور ایک ایک لفظ کی پرکھ پر ویسی ہی محنت کرتے ہیں جیسی فرانسیسی ناول نگار فلابیر کے بارے میں مشہور ہے۔

مثلاً یہ رباعی۔

اپنے میں جو تنویر نہیں پاتے ہیں

احباب کی روشنی کو سنولاتے ہیں

خود اپنی نگاہوں میں جو ہوتے ہیں ذلیل

دیکھا ہے کہ غیبت پہ اتر آتے ہیں

مسودے کے ایک صفحے کا عکس ملاحظہ ہو:

جن کے نزدیک سر خوشی ہے طاعون

بھاتی ہے انہیں نفس کشی کی افیون

یہ قوم اگر سونگھ لیں بھولے بھی پھول

بھل بھل بہنے لگے وہیں ناک سے خون

اچھے میں جو دل کشی نہیں پاتے ہیں

اپنے میں جو روشنی نہیں پاتے ہیں

اپنے میں جو تنویر نہیں پاتے ہیں

احباب کے چہروں احباب کی روشنی کو سنولاتے ہیں

خود اپنی نگاہوں میں جو ہوتے ہیں ذلیل

دیکھا ہے کہ غیبت پہ اتر آتے ہیں

اس میں صرف لفظ ''تنویر'' کی تلاش میں انہوں نے کئی مصرے تبدیل کئے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں، انکی نظر سے اکثر ایک جیسے معنوں کے بے شمار الفاظ ایک جگہ لکھے ہوئے ملیں گے۔ جن کو جوش نے وقت صرف کر کے بڑی محنت سے، ڈکشنری میں سے تلاش کیا ہے۔ بقول فلابیئر ڈکشنری میں ایک معنی کے لئے صرف ایک ہی لفظ ہوتا ہے۔ اور ان تمام الفاظ کی فہرست میں سے جوش کی نظر بھی اسی ایک لفظ کو ڈھونڈتی ہے

انگریزی میں کلمۂ تعریف کے استعمال کا ایک تیر بہدف طریقہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر اردو میں آپ ''سفید'' رنگ کے لئے دوسرے الفاظ تلاش کریں تو تین چار الفاظ کے بعد لغت خاموش ہو جائے گی۔ انگریزی میں اس ایک رنگ کے برعکس کو مماثلت کے ساتھ پیش کرتے جایئے تو سیکڑوں الفاظ نکل آئیں گے۔ مثلاً Ivory White'' Snow -White'' وغیرہ وغیرہ۔ جوش نے انگریزی کے اس نسخے کو اردو میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش محض ''رنگوں'' کے لئے محدود نہیں، بلکہ جذبے کی مختلف کیفیتوں کی آئینہ دار ہے۔ مثلاً

جولیس سیزر کی خوں آلودہ حیرت کی قسم

اور نوائے ذہن میں خود رحمیاں

مجاز مرحوم کی طبیعت کو وہ ''آب صفت'' کہا کرتے تھے۔ اور تشریح اس کی یہ تھی کہ اگر پانی میں آپ چھڑی ڈالئے تو پانی فوراً جگہ دے دیتا ہے لیکن چھڑی ہٹاتے ہی پھر ویسے کا ویسا ہو جاتا ہے۔ مجاز کو کثرت شراب کی ممانعت کرتے رہئے تو چپ بیٹھے رہتے ہیں اور سنے جاتے ہیں، اور جہاں نصیحت ختم ہوئی وہ فوراً مے خانے کا رخ کرتے ہیں

ایک ماحول کی بھرپور عکاسی کے لئے وہ اکثر یہ بھی کرتے ہیں کہ اس منظر سے متعلق جتنے احساسات ہیں انہیں ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔

ناقوس، گائے باجے، تماشے، جلوس، اذاں
بنوٹ، کمند، پینترے، بانا، تبر، سناں
ملا جیاں، جھکاتیاں، آوازے، اوکھیاں
غل، شور، دھینگا مشتیاں، لٹھ بونگا، ماردھاڑ
گلیاؤ، لام کاف، دھما چوکڑی، لتاڑ
پتھراؤ، داؤں پیچ، اچھل کود، دھر پچھاڑ

(وقت کی آواز)

مروجہ زبان، علاقائی زبان، اور روزمرہ سے وہ برابر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے کلام میں Dialect بھی ہے اور Latois بھی۔ عورتوں کی بول چال پر بھی انہیں ویسی ہی مہارت ہے جیسی مردانے پر ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ خود ان کا گھر اور ان کے بچپن کے لکھنؤ کا ماحول ہے۔ لیکن اس میں ساتھ ہی ساتھ ان کا ریاض اور ناقابل یقین مشقت بھی شامل ہے۔

جس طرح ہماری زندگی سے یہ مشقت علیحدہ ہوتی جارہی ہے اسی طرح ہماری شاعری سے بھی۔ جدید تیز رفتاری کے سیاق وسباق میں ممکن ہے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے لیکن ہماری روایتی تہذیب کی کڑیاں اسی طرح ایک دوسرے سے ٹوٹتی جاتی ہیں۔

جوش واحد شاعر ہیں جنہوں نے اب تک اس زنجیر کو وابستہ و پیوستہ رکھا ہے۔ اور ہماری نسل میں دوسرا کوئی شاعر نہیں جو اس خانہ زنجیر کو بے صدا ہونے سے بچا سکے۔

☆☆☆

عبادت بریلوی

شاعرِ انقلاب

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی سے دور رہیے تو ان کی بارعب اور پُر وقار شخصیت دل میں ایک طرح کے اجنبی سے خوف اور انجان سے ڈر کو پیدا کرتی ہے اور اگر ان سے قربت حاصل کر لیجئے تو ان کی شخصیت کی گھلاوٹ اور نرمی، حلاوت اور شیرینی پر پیار آنے لگتا ہے۔

میں انہیں ایک زمانے میں دُور سے دیکھتا رہا ہوں۔ اسی لئے طالب علمی کے زمانے میں بھی (جب شاعروں کو چٹکیوں میں اڑا دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا) ان کی شخصیت کا رعب مجھ پر چھایا رہا ہے۔ ان سے ملنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی ہے، لیکن میں ان سے مل نہیں سکا ہوں۔ میں نے ان سے ملاقات کے پروگرام بنائے ہیں لیکن ایک اجنبی سے خوف اور ایک انجان سے ڈرنے ہمیشہ میرا راستہ روک لیا ہے لیکن اپنی طالب علمی کے بعد جب میں ان کے قریب ہو گیا ہوں تو اس ڈر اور خوف کی جگہ ایک موانست نے لے لی ہے اور میں نے ہمیشہ ان کی شخصیت کو حد درجہ دلکش اور دلآویز پایا ہے۔ ان سے ملنے میں ہمیشہ ایک لذت سی محسوس کی ہے اور آج میں اس موانست کو اپنی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں کیونکہ اس نے مجھے شاعرِ انقلاب کی رنگا رنگ شخصیت کے ان گنت پہلوؤں سے روشناس ہونے کا موقع بہم پہنچایا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے انہیں پہلی بار قیصر باغ میں دیکھا تھا۔ وہ قیصر باغ سے

امین آباد کی طرف جا رہے تھے میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ قیصر باغ سے امین آباد تک میں ان کے پیچھے پیچھے صرف اس خیال سے گیا تھا کہ کسی جگہ موقع پا کر ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ بس خود ہی اپنا تعارف کرا دوں گا اور اسی طرح ملاقات کی تقریب نکل آئے گی لیکن پھر یہ خیال آیا کہ میری حیثیت ہی کیا ہے میں تو ایک اسکول کا معمولی سا طالب علم ہوں۔ میں نے شاعر انقلاب کی نظمیں پڑھی ہیں، ان کا بہت سا کلام مجھے زبانی یاد ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں اس رشتے کو ان سے سرِ راہ ملاقات کا ذریعہ بناؤں۔ میں یہی سوچتا رہا کہ وہ کہیں گے کہ یہ عجب لڑکا ہے۔ آخر اس کو مجھ سے ملنے کی ایسی کیا پڑی ہے...... بس اسی خیال میں راستہ طے ہو گیا۔ وہ امین آباد پہنچ کر ایک ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ جھجک میری راہوں میں حائل رہی، اور میں ان سے نہ مل سکا...... اس کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے دیکھا کہ وہ لاٹوش روڈ کے ایک مشاعرے میں اپنی نظم 'جنگل کی شہزادی' سنا رہے ہیں۔ وہ نظم پڑھ چکے، رباعیاں سنا چکے، مشاعرہ ختم ہو گیا۔ لوگوں نے انہیں گھیر لیا لیکن اس دفعہ پھر ان سے ملنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اور اسی طرح نہ جانے کتنے ہی مواقع ہاتھ سے نکلتے گئے۔ ان کو دیکھا لیکن ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ ان سے ملنے کو جی چاہا لیکن ایک زمانے تک یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی وہ لکھنؤ آتے رہے۔ میں بھی دیکھتا رہا، کلام سننے کا موقع ملتا رہا لیکن ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

جوش صاحب کو لکھنؤ سے عشق تھا۔ لکھنؤ کی ہر چیز کے وہ دلدادہ و شیدا تھے۔ اس لئے اکثر دلّی سے ان کا لکھنؤ آنا رہتا تھا چنانچہ ایک دفعہ ملاقات کی صورت نکل ہی آئی۔ میں ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے جو جوش صاحب سے وطنی نسبت رکھتے تھے۔ ملاقات کی صورت نکالی۔ وہ جوش صاحب سے وقت مقرر کر آئے اور ہم دونوں مقررہ وقت پر ان کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ ایک بڑے سے کمرے میں صوفے کے بجائے فرش پر بیٹھے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔ اس طرح جیسے برسوں سے جانتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی انہوں نے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ مزاج پوچھا۔ حالات دریافت کئے۔ بات میں سے بات نکلی تو ملیح آباد، شاہجہاں پور، بریلی، رامپور اور قائم گنج کے پٹھان خاندان کے بارے میں گفتگو کرتے رہے کیونکہ اس وقت پٹھان ہونا ہی ہم دونوں

کے درمیان مشترک تھا پھر شعر و شاعری کی باتیں ہوئیں۔ یونیورسٹی کے ادبی ماحول اور لکھنؤ کی قدیم ادبی صحبتوں کا ذکر رہا...... اور اس طرح ان گنت موضوعات پر جوش صاحب ہم سے دیر تک بات چیت کرتے رہے، ان باتوں میں ماضی کی پرانی یادیں تھیں۔ حال کے معاملات و مسائل تھے، مستقبل کے سہانے خواب تھے...... لیکن ان سب کو پیش کرنے میں ایک بذلہ سنجی تھی جس نے ہر بات کو لطیفہ بنا دیا تھا لیکن ان لطیفوں سے ماحول کے وقار اور رکھ رکھاؤ کو ٹھیس نہیں لگی تھی۔ اس فضا میں خاصہ لئے دیئے رہنے والا انداز تھا...... کئی گھنٹے کی ایسی دلچسپ ملاقات کے بعد ہم لوگ رخصت ہوئے۔ جوش صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں اس ملاقات سے بہت خوش تھا کیونکہ آج میں ایک عظیم اور ہمہ گیر شخصیت سے ملا تھا اور اس شخصیت نے جو مانوس فضا پیدا کی تھی۔ اس نے میرے لئے آئندہ بہت سی ملاقاتوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ چنانچہ اس ملاقات میں وہ موانست جس کا احساس مجھے پہلے دن بھی ہوا تھا، وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی ہے۔ جوش صاحب کے اخلاق کو میں نے روز افزوں ہی دیکھا ہے۔ درحقیقت یہ موانست ان کے اسی غیر معمولی اخلاق ہی کے ہاتھوں پیدا ہوئی ہے، جس کی وجہ سے کوئی بھی ملنے والا ان کے سامنے اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔

شاعر انقلاب اخلاق کا مجسمہ ہیں بے شمار لوگ ان سے ملتے ہیں۔ وہ ہر ایک کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے ہیں اور ایک لمحے کو بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ ظاہر ہے اتنے بہت سے لوگوں کی جان پہچان آسان بات نہیں۔ وہ ان میں سے اکثر کو نہیں پہنچانتے۔ لیکن ملتے وقت احساس سب کو یہی دلاتے ہیں گویا انہوں نے اچھی طرح پہچان لیا ہے...... جب بھی کوئی ان سے ملنے آتا ہے۔ کھڑے ہو کر اس کو گلے لگاتے ہیں۔

پھر پوچھتے ہیں کہیئے صاحب مزاج تو اچھا ہے؟ کہاں رہے؟ کیسے رہے؟ کیا کر رہے ہیں؟ قیام کہاں ہے؟ زمانے سے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟۔ اس سوال و جواب سے کچھ معلومات انہیں ہو جاتی ہے اور پھر اس معلومات کو سامنے رکھ کر وہ مزید سوالات بنا لیتے ہیں۔ غرض ملنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جوش صاحب کو اس کے تمام حالات کا علم ہے اور اس لئے وہ ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتا...... برخلاف اس کے ایسے مواقع پر تو جوش صاحب اس کے سب سے بڑے مونس و غمخوار بن

جاتے ہیں ......حالانکہ اس کے رخصت ہو جانے کے بعد ان سے پوچھئے کہ یہ کون صاحب تھے؟

......تو یہی جواب ملے گا کہ ''بھئی بالکل یاد نہیں۔ میں انہیں پہچان نہ سکا۔''

ایک دفعہ مجھے اب تک یاد ہے!

میں ایک دن جوش صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان ملنے آ گئے۔ جوش صاحب نے انہیں ایک ذرا دیکھا......اور پھر فوراً کہا:

''آیئے، تشریف لایئے!''

''حاضر ہوتا ہوں۔''

''بہت زمانے کے بعد دیدار ہوا۔''

''کیا عرض کروں میں پچھلے دنوں کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا گیا تھا۔''

''لیکن حضرت! یہ آپ چپ چپاتے کہاں چلے جاتے ہیں؟''

''کیا عرض کروں بات ہی کچھ ایسی تھی۔''

''لیکن صاحب! کم از کم خط تو لکھا کیجئے۔''

''جی ہاں یہ میری غلطی ہے...... بات یہ ہوئی کہ بہت مصروف اور پریشان رہا۔''

''.........اچھا آپ کے والد صاحب تو اچھی طرح ہیں؟''

''بفضلہٖ، خیریت سے ہیں؟''

''.........اور ہاں آپ نے شادی کر لی یا نہیں؟''

''بس اب تیاری ہو رہی ہے۔ والدہ کا اصرار ہے۔ سوچتا ہوں کر ہی ڈالوں۔''

''جی ہاں! والدہ کی بات آپ بھلا کس طرح ٹال سکتے ہیں۔''

''اچھا، مکان وغیرہ تو ٹھیک ٹھاک ہے؟''

''ہے تو ٹھیک لیکن مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔''

''بڑی لعنت ہے صاحب! یہ مقدمہ اور عدالت بھی۔ میں تو اپنی ساری جائیداد ان عدالتوں اور کچہریوں کی نذر کر چکا۔''

''........اچھا اب کب تک قیام رہے گا؟''

"تو پھر ملاقات تو ہوتی رہنا چاہیئے ....آخر یہ بھی کیا بات ہوئی کہ ایک شہر میں رہتے ہیں اور ملاقات نہیں ہوتی.......کبھی کبھی ضرور آیئے۔"

غرض اس طرح کی نہ جانے کتنی باتوں کے بعد جب وہ صاحب رخصت ہوئے تو میں نے پوچھا۔

"جوش صاحب ! یہ کون صاحب تھے؟"

جوش صاحب کہنے لگے...... "بھئی خدا جانے۔ میں انہیں پہچان نہ سکا۔ کہیں دیکھا ضرور ہے۔"

میں نے کہا..... "لیکن آپ باتیں تو اس طرح کر رہے تھے جیسے برسوں کی شناسائی ہے۔"

کہنے لگے "جی ہاں خاصی گاڑھی چھن رہی تھی۔"

مجھے اس فقرے پر ہنسی آ گئی۔ جوش صاحب بھی ہنسنے لگے۔

میں نے کہا.....جوش صاحب ! آپ کمال کرتے ہیں۔ وہ شخص سمجھتا ہوگا۔ آپ نے اس کو پہچان لیا ہے اور آپ اس کے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔"

جوش صاحب کہنے لگے...... "نہ پہچاننا بھی تو بد اخلاقی ہے اس لئے میں کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ میں نے اس کو نہیں پہچانا ہے۔" بلکہ جوش صاحب تو یہاں تک کرتے ہیں کہ کوئی صاحب آئے اور انہوں نے آتے ہی کہا.....شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ ....تو وہ اس کے جواب میں فوراً کہیں گے ....نہیں صاحب بخوبی پہچان لیا۔ بھلا آپ کو کون بھول سکتا ہے۔ حالانکہ وہ ان کے بارے میں مطلق نہیں جانتے کہ کون صاحب ہیں۔

اس سے ان کی خوش اخلاقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہر وقت وہ اپنے اقوال اور افعال سے اس اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی یہ خوش اخلاقی تکلف کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ دلّی میں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میں دفتر میں ان سے ملنے گیا ہوں۔ دو ایک گھنٹے بیٹھ کر رخصت چاہی ہے ....لیکن انہوں نے پوچھا ہے......."آپ کالج ہی کی طرف جائیں گے نا؟"

میں نے کہا ہے ''جی ہاں جانا تو اسی طرف ہے۔''

''تو پھر آیئے گاڑی میں بیٹھئے۔ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔''

اور یہ کہہ کر انہوں نے مجھے گاڑی میں بٹھالیا ہے اور ٹھیک اجمیری دروازہ پر لا کر اُتارا ہے اور اتار کر پھر مکان واپس گئے ہیں۔

اس اخلاق کے نمونے اب کہاں مل سکتے ہیں؟

شاعر انقلاب کو یہ خوش اخلاقی ورثے میں ملی ہے۔ وہ نسلاً پٹھان ہیں اور پٹھان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مہمان پر جان دیتا ہے اس کے علاوہ اس میں اودھ کے اس ماحول کو بھی دخل ہے۔ جس کے سائے میں انہوں نے پرورش پائی اور جہاں خوش اخلاقی تکلفات کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ویسے وہ خود ان تکلفات کے قائل نہیں ہیں کیونکہ بے تکلفی ان کے مزاج کا جزو ہے لیکن خوش اخلاقی ان کے یہاں کہیں کہیں تکلف کو پیدا ضرور کر دیتی ہے۔ البتہ ان کا یہ تکلف تمام تر مصنوعی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو تکلف کہنا بھی زیادتی ہے۔

جوش صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ مجھے حد درجہ حساس اور جذباتی نظر آئے ہیں۔ خاص طور پر احباب کے معاملے میں تو وہ بے حد حساس اور جذباتی ہیں...... کبھی وہ سفر پر جاتے ہوں اور احباب کے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہو تو ان کی کیفیت دیکھنے والی ہوتی ہے بس آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے، ورنہ ان کی ہر بات اور ہر انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ان پر رقت طاری ہے اور بس اب آنکھیں ڈبڈبانے ہی والی ہیں........ اگر کسی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو کہیں گے، ''نہیں صاحب ! معانقہ کریں گے۔ گلے ملیں گے خدا جانے اب کب ملاقات ہو؟'' ''مشیت، ہم سب کی گھات میں ہے۔'' اور یہ کہہ کر ہر ایک کو گلے سے لگائیں گے۔ بار بار فرطِ شوق سے بھینچیں گے۔ دیر تک یہی کیفیت رہے گی۔ اس منظر کے بغیر ان کے یہاں رخصت ہونے کا تصور ہی نہیں ہے........ جوش صاحب کے یہاں باتیں محض رسمی اور بناوٹی اور دکھاوے کی نہیں ہیں۔ اس عالم میں ان کی ایک ایک بات اور ایک ایک انداز سے بے پناہ خلوص ٹپکتا ہے بے اندازہ صداقت مترشح ہوتی ہے۔

ان کے دوستوں میں سے اگر خدانخواستہ کبھی کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو بس یوں معلوم

ہوتا ہے جیسے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ان پر ایک کرب کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے ...... بے چین اور پریشان ہو جاتے ہیں ...... یہاں تک کہ ان کے اس اضطراب کو دیکھ کر دوسروں پر بھی اضطراب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

دلّی کے دوران قیام میں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجاز لکھنؤ سے آئے تو میرے پاس ٹھہرے۔ ایک دن تو میرے یہاں رہے، پھر یہ کہہ کر جوش صاحب کے یہاں جا رہا ہوں، سامان چھوڑ کر اس طرح غائب ہوئے کہ کئی دن تک خبر ہی نہیں لی۔ میں چونکہ ان کے مزاج سے واقف ہوں، اس لئے مجھے ان کی اس حرکت میں کوئی تشویش اور فکر کا پہلو نظر نہیں آیا .... جو بھی پوچھتا میں یہی کہہ دیتا کہ سامان تو ان کا یہاں پڑا ہے لیکن جوش صاحب کے یہاں چلے گئے ہیں۔ وہاں مفت کی پیتے ہوں گے ...... اس سہارے سے ان کا جی لگ گیا ہوگا .... مجاز کو گئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ میری طبیعت اس دن کچھ خراب تھی۔ اس لئے چاروں طرف سے دروازے بند کر کے بستر میں لیٹ گیا تھا۔ ویسے میں دن کو بالکل نہیں لیٹتا لیکن اس دن بیٹھے رہنے اور کام کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دن کے کوئی تین بجے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھا کوئی طالب علم ہوگا۔ ایک دو بار کھٹکھٹا کر چلا جائے گا۔ لیکن دستک برابر ہوتی رہی۔ مستقل اور مسلسل ...... تب مجھے یہ خیال ہوا کہ ضرور کوئی صاحب کسی اہم کام سے آئے ہیں اس لئے دروازہ کھول دینا چاہیئے۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا جوش صاحب تھے۔ پسینے میں شرابور، ہانپتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان پر ایک عجیب گھبراہٹ کا عالم تھا .... مجھے دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا:

''مجاز مر گیا۔''

یہ سن کر تو میرے بھی پیروں تلے سے زمین نکل گئی بلکہ گھگھی بندھ گئی .... میری چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ عرشؔ اور آزادؔ نے تفصیل سنانی شروع کی .... نہ جانے کس نے ابھی ابھی جوش صاحب کو ٹیلی فون پر یہ خبر دی ہے .... خبر غلط بھی ہو سکتی ہے خدا کرے غلط ہو !.... خیر، میں نے جوش صاحب کی حالت غیر دیکھ کر انہیں پہلے تو ایک کرسی پر بٹھایا اور عرش سے مخاطب ہو کر کہا کہ یقیناً یہ خبر غلط ہے، صرف اس خیال سے کہ جوش صاحب کی پریشانی دور ہو ...... پھر انہیں کچھ اس طرح سمجھانا شروع کیا کہ کہیں شراب زیادہ پی لی ہوگی، بے ہوش ہو گیا۔ لوگوں نے سوچا ہوگا آپ کو

اطلاع دے دی جائے...... آپ تو مجاز کو جانتے ہی ہیں۔ باتیں تو میں اس قسم کی کر رہا تھا لیکن دل سے خدا ہی کو خبر تھی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا...... خیر یہ باتیں سن کر جوش صاحب کو کسی قدر اطمنان ہوا ...... ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ پھر میں نے کچھ طالب علموں کو جمع کیا اور ان کو ہدایت کی کہ کسی نہ کسی طرح مجاز کی خیر خبر معلوم کر کے مجھ تک پہنچائیں۔ شام ہونے لگی تھی، اس لئے جوش صاحب سے میں نے کہا کہ آپ گھر جا کر آرام کیجئے۔ مجاز پہنچ جائے گا...... یہ باتیں سن کر ان کی جان میں جان آئی۔ ورنہ اس سے قبل تو ان پر ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا.....

جوش صاحب تو میرے کہنے پر گھر چلے گئے اور طالب علموں نے مجاز کو تلاش کرنا شروع کیا رات گئے یہ خبر ملی کہ ایک جگہ اس نے بہت شراب پی لی تھی اور دو دن سے وہیں پڑا ہوا ہے۔ میں نے رات ہی کو جوش صاحب کو یہ خوش خبری بھیجی۔ جس وقت میرا خط پہنچا اسی وقت بعض لوگوں نے مجاز کو بھی جوش صاحب کے یہاں پہنچا دیا۔ دوسرے دن جوش صاحب نے میرے خط کے جواب میں لکھا:

''حضرت، خوش خبری کا شکریہ قبول فرمایئے۔''

صبح جب دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مردود مجاز آزاد کے کمرے میں پڑا سو رہا ہے۔ ابھی میرے پاس آیا تھا۔ میں نے بہت ڈانٹا پھٹکارا۔ اور اسے ہدایت کے ساتھ اپنے گھر روانہ کر دیا کہ وہاں جا کر وہ غسل کرے اور کھانا کھائے۔

معلوم نہیں کس ابنِ زیاد نے اس کی موت کا فون کیا تھا۔ اللہ اسے نیکی کی توفیق دے۔ میں اس کے اس قاتلانہ فعل کو معاف کرتا ہوں۔ ہلاک کر دیا مجھے اس بد بخت کے فون نے۔

نیاز مند جوشؔ

اس واقعے سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جوش صاحب دوستوں سے کس بلا کی محبت کرتے ہیں۔

جوش صاحب کو احباب سے ملنے میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے ان کے بہترین لمحے وہی ہوتے ہیں جب وہ احباب کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں۔ اسی لئے ہر صحبت کی یاد ان کے دل میں ایک داغ بن جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک خاص حصہ اسی قسم کے جذبات کی

ترجمانی پر مشتمل ہے۔ خطوں میں بھی اکثر اس کیفیت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں:

''اکثر آپ یاد آتے ہیں۔ اب تو یادوں کا موسم ہے۔ مستقبل سے کوئی توقع نہیں۔ حال، زباں حال ہے اس لئے جو کچھ ہے وہ ماضی ہے برسی ہوئی گھٹائیں کیونکر گرجتی برستی ہیں۔ یہ مجھ سے پوچھیے اور بھولی بسری صحبتیں کیونکر گونجتی ہیں، یہ بس میرا ہی دل جانتا ہے کبھی کبھی یاد کرتے رہیئے۔ عمر کا پیانہ چھلکا ہی چاہتا ہے۔

بیار بادہ کہ مینائے عمر بریز است

مریض رادم آخر چہ جائے پرہیز است

نیاز شعار

وہی جوش بادہ گسار''

شاید ہی کوئی خط ایسا ہوتا ہو جس میں جوش صاحب احباب کو اس قسم کی باتیں نہ لکھتے ہوں۔ شاید ہی کوئی لمحہ ایسا ہوتا ہو جب جوش صاحب اس طرح کی باتیں کرتے نہ ہوں ان پر احباب کے بچھڑنے کا خیال، بچھڑنے سے پہلے ہی طاری ہو جاتا ہے .... اور اس میں ان کے حد درجہ حساس اور جذباتی ہونے کو دخل ہے ...... لیکن اس میں کتنی انسانیت ہے۔

اسی کا یہ اثر ہے کہ جوش صاحب احباب کی خاطر سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ دوست پر کوئی وقت آن پڑے جوش صاحب اس کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ دوست کو کسی مدد کی ضرورت ہو، جوش صاحب اس کے لئے زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ دوستوں کے لئے یا دوستوں کا واسطہ اور حوالہ دے کر ان سے سب کچھ کرایا جا سکتا ہے۔ جب کوئی ایسا موقع آ پڑے تو ان میں ایک نئی زندگی بیدار ہو جاتی ہے تساہل کو وہ بالائے طاق رکھ کر میدان میں کود پڑتے ہیں اور میدان سر کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

چند سال ہوئے مشہور ترقی پسند شاعر سردار جعفری کو حکومت بمبئی نے اشتعال انگیز تقریریں کرنے کے سلسلے میں گرفتار کر لیا تھا۔ کئی مہینے انہیں جیل میں گزارنے پڑے۔ جوش صاحب کو بھی بعض احباب نے یہ خبر پہنچائی .... کہنے لگے ..... ''اچھا تو اب ادیب اور شاعر بھی گرفتار کیے

جانے لگے ......یہ کیا اندھیر ہے......کیا مجھے اس سلسلے میں پنڈت جی (پنڈت جواہر لال نہرو) سے ملنا چاہیئے؟......احباب نے شبہ دی اور کہا......"اس سے زیادہ اہم معاملہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ ضرور ملنے کی ضرورت ہے"......بس جوش صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پنڈت جی کے پاس پہنچ گئے......اور کہنے لگے ......کیوں صاحب! اب یہ نوبت آگئی کہ ادیبوں اور شاعروں کو بھی گرفتار کر کے قید کیا جانے لگا......یہ کیسی اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ کیا آپ کی حکومت میں یہ بھی ہوگا؟ کیا آزادی اسی لئے ملی ہے؟......غرض اس طرح کی بہت سی باتیں کیں۔ پنڈت جواہر لال ان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور بہت خیال رکھتے ہیں۔ان کی باتیں سن سن کر مسکراتے رہے اور یہی کہا کہ جوش صاحب ! آپ اطمینان رکھیئے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا فکر نہ کیجئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سردار جعفری کو چھوڑ دیا گیا۔

احباب جوش صاحب کی بہت بڑی کمزوری ہیں۔ احباب کے لئے تو وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ پہلوان کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے۔

جوش صاحب محبت کے بندے ہیں وہ انسان ہیں ......صحیح معنوں میں انسان ہیں ......انسانیت کا خیال اور احساس ان کی شخصیت میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں، جو کچھ بھی سوچتے ہیں، جو کچھ ان کا مطمح نظر ہوتا ہے سب کی محرک ان کی یہی انسانیت اور انسان دوستی ہوتی ہے۔ جوش صاحب نے اسی انسانیت کے گیت گائے ہیں۔ یہی ان کا فلسفہ ہے۔ یہی ان کا مذہب ہے۔ یہی ان کا نصب العین اور نظریۂ حیات ہے۔ یہی محور ہے جس کے گرد، ان کی زندگی کا چاک گھوم رہا ہے۔ اسی لئے ان کی انسانیت اور انسان دوستی کے مفہوم میں ایک وسعت ہے۔ ایک گہرائی ہے ایک گیرائی ہے۔ ایک تنوع ہے۔ ایک رنگارنگی ہے ......حیات و کائنات کے تمام پہلوؤں کا اس نے احاطہ کرلیا ہے وہ ساری انسانی زندگی پر حاوی ہے انسانیت ان کے نزدیک زندگی ہے اور زندگی انسانیت !

شاعر انقلاب نے ریاست کی فضا اور امارت کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ ساری زندگی امیروں اور رئیسوں کی طرح رہے اس لئے آرام اور راحت کا خیال گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ لذت پرستی اور تعیش پسندی انہیں ورثے میں ملی ہے ایسا کرنے کے لئے وہ بڑا اہتمام کرتے ہیں اور

بعض اوقات تو اس سلسلے میں اپنے حدود سے باہر بھی نکل جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ بے راہروی ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتی جو پرانے امراء اور رؤسا کا شیوہ تھی۔ جوش صاحب کام کرتے ہیں۔ محنت اور جفاکشی سے گھبراتے نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جو اُن کے مزاج کے خلاف اور طبیعت کے منافی ہو۔ وہ ایک تعلقہ دار خاندان کے چشم و چراغ ہیں لیکن ان کی زندگی میں کوئی ایسی بے راہ روی نہیں جو انہیں ذہنی یا جذباتی اعتبار سے ابنارمل ثابت کرے۔ وہ ذہنی اور ذاتی اعتبار سے ایک عام انسان کی طرح صحت مند ہیں۔ لذت اور تعیش ان کے مزاج میں ضرور ہے لیکن اس معاملے میں بھی وہ انتہا پسند نہیں ہیں...... اور انتہا پسند نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے یہاں لذت اور تعیش کا خیال ہمیشہ اپنے حدود میں رہتا ہے...... ان کی لذت پرستی اور تعیش پسندی ہی ہے کہ وہ عورت اور شراب کے شیدائی ہیں...... عورت ان کے نزدیک ایک سحر ہے اور اس سحر کے بغیر زندگی میں رس اور رعنائی کا وجود نہیں ہوتا...... زندگی عورت کے بغیر بے کیف ہے، بے رنگ و بو ہے...... اس کی تکمیل عورت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اسی خیال نے انھیں صنفِ لطیف کا پجاری بنایا ہے، ان سے اپنے حسن کی پرستش کرائی ہے...... وہ اس کی ہستی میں کھو گئے ہیں۔ اسی کی رعنائیوں میں اپنے آپ کو غرق کر دیا ہے۔ اسی خیال نے ان سے سترہ عشق کرائے ہیں...... ایک انسان ایک زندگی میں سترہ عشق کر بھی سکتا ہے یا نہیں؟...... یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال ہے لیکن جوش صاحب نے سترہ عشق کیے ہیں (اور اب جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں ان کی تعداد نہ جانے کہاں تک پہنچ گئی ہوگی۔) سترھواں عشق تو وہ تھا جو انھوں نے بمبئی میں چوپاٹی کے ساحل پہ کیا تھا...... اور ان کی مشہور نظم ''تو اگر واپس نہ آتی'' جس کی یادگار ہے اور جو یوں شروع ہوتی ہے ۔

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے

زندگی کے مختلف زمانوں میں ان کے عشق کے میدان مختلف رہے ہیں۔ کسی خاص عورت سے جذباتی قرب کو وہ عشق سمجھ لیتے ہیں۔ اگر یہی عشق ہے تو انسان ایک زندگی میں سیکڑوں عشق کر سکتا ہے۔ جوش صاحب کے عشق میں اسی وجہ سے عظمت نہیں ہے کیونکہ وہ میر کی سپردگی کو عشق نہیں سمجھتے۔ وہ تو غالب کی طرح پرستش کے بجائے خواہش کو عشق کا نام دیتے ہیں...... اسی لئے جوش

صاحب نے عشق و مشق نہیں کیا ہے۔ وہ لذت کی شمع کے پروانے ہیں لیکن ان کی یہ لذت جذباتی تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے۔ اسی کو وہ عشق کا نام دے دیتے ہیں۔ عشق اس طرح نہیں ہوتا۔ جوش صاحب خود بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہیں .... اسی لئے عشق سے ان کو مطلب نہیں ہوتا، محض جذباتی تقاضوں کی تکمیل مراد ہوتی ہے ..... اور جذباتی تقاضوں کی تکمیل انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اس لئے صنفِ لطیف سے اکتسابِ لذت کا یہ خیال جوش صاحب کے یہاں ایک فطری آہنگ کے ساتھ ابھرتا ہے .... اور ان کی ساری شخصیت پر چھا جاتا ہے۔ جوش صاحب صنفِ لطیف کو اسی لئے صانع ازل کی نازک ترین صنعت سمجھتے ہیں۔ اس کا وجود انھیں شمعِ بزمِ عالم نظر آتا ہے۔ جس کی نازک ہستی کی تکمیل و تعمیر میں قدرت کی انتہائی تخیل دلربائی کام آئی ہے .... اسی لئے تو وہ اس سے دلچسپی لیتے ہیں اور اس دلچسپی لینے کو انسانی زندگی کی صحت مندی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنفِ لطیف سے یہ والہانہ وابستگی اور مجنونانہ شیفتگی ان کی شخصیت میں اس قدر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے بلکہ اسی کو زندگی سمجھتے ہیں .... میرا مطلب ہے زندگی کا ایک اہم پہلو ....،

جوش صاحب کی شخصیت میں اس عورت کی حکمرانی ہے اسی لئے تو بعضوں نے انھیں شاعرِ انقلاب کے بجائے شاعرِ شباب کہا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ شاعرِ شباب ہیں بھی۔ یہ خطاب انھیں زیب دیتا ہے۔ انھوں نے شباب کے گیت گائے ہیں۔ جوانی کے راگ سنائے ہیں ...... وہ جوانی جو پہلو میں آگ سی لگاتی ہے اور سینے میں دھوم مچا دیتی ہے ...... اور جس کے نتیجے میں حسن و عشق کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ دلوں کی بازی لگائی جاتی ہے۔ جوش صاحب خود ان منزلوں سے گزرے ہیں، ان کی جوانی خاصی دیوانی رہی ہے ...... اور جوانی کا دیوانہ ہونا، انسانیت سے الگ نہیں ہے۔ وہ تو انسانی زندگی کا اہم پہلو ہے۔ جوش صاحب کی جوانی میں دیوانی ہو جانے والی کیفیت اسی لئے تو اپنے آپ کو اس قدر نمایاں کرتی ہے ....،

اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جوش صاحب کی شخصیت میں صرف صنفِ لطیف ہی سے اکتسابِ لذت کا خیال نہیں ملتا وہ مناظرِ فطرت سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں، انسانی زندگی کے عام حالات ان کے لئے لذت کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے نزدیک صبح کے منظر میں بھی ایک لذت ہے،

دوپہر کی دھوپ میں بھی ایک لذت ہے، چاندنی کی مسکراہٹ میں بھی ایک لذت ہے، رات کی تاریکی میں بھی ایک لذت ہے، ساون کی پھواروں میں بھی ایک لذت ہے، پرواہوا کے چلنے میں بھی ایک لذت ہے، چاند کے طلوع ہونے اور آفتاب کے غروب ہونے میں بھی ایک لذت ہے۔ غرض زندگی میں ہر طرف لذت ہی لذت ہے۔ کیونکہ حسن دنیا کے چپے چپے پر بکھرا پڑا ہے اور حسن کے بغیر لذت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس حسن سے لذت اندوز ہونے کے لئے ایک نگاہِ شباب کی ضرورت ہوتی ہے۔

جس حسنِ دلفریب پہ یوں دھن رہا ہے سر
تیری ہی بے خبر وہ نگاہِ شباب ہے !!!

اور یہ نگاہِ شباب جوش صاحب کے یہاں زیادہ نمایاں ہے، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہیں کہ یہی ان کی شخصیت ہے اور اس نے ساری انسانی زندگی کو ان کی نظروں میں حسین بنا دیا ہے۔ ایک ایک چیز کو حسن سے معمور کر دیا ہے۔ بے جان چیزوں میں، جاندار چیزوں میں، غرض ہر چیز میں ان کی نگاہیں حسن دیکھتی ہیں۔ انہیں اپنے چاروں طرف حسن ہی حُسن نظر آتا ہے۔ ایسی چیزوں میں بھی وہ حسن کے پہلو نکال لیتے ہیں جو بظاہر حسین نہیں ہوتیں۔ ایسا نہ ہوتا تو کوہستان دکن کی عورتوں میں وہ حسن نہ دیکھ پاتے جو بظاہر سنگِ اسود کی چٹانیں ہوتی ہیں لیکن جن کا وجود کیا خبر کتنے دلوں کو پامال کرتا ہے۔ گاتی ہوئی پگڈنڈیوں اور کھیتوں کے درمیان ترشی ہوئی راہوں میں وہ حسن نہ دیکھ پاتے۔ گرمیوں کی دوپہر اور دیہات کے بازاروں میں انہیں حسن نظر نہ آتا...... لیکن انہوں نے اس نوعیت کے ان گنت پہلوؤں میں حسن دیکھا ہے...... اور اس سے متاثر ہوئے ہیں......'

جوش صاحب کو عام انسانوں سے گہری دلچسپی ہے۔ وہ ان کے معاملات سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں محبت کا خیال جو ایسی رچی ہوئی صورت میں نظر آتا ہے، اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ برائی نہیں کر سکتے۔ وہ خیر ہی خیر ہیں۔ شر کا خیال بھی ان کی شخصیت میں نہیں ملتا۔ دشمن کے ساتھ بھی وہ نیکی کرتے ہیں۔ مفسد کے ساتھ بھی محبت سے پیش آتے ہیں۔ مخالف کے ساتھ بھی ہمدردی کرتے ہیں۔ اسی لئے عفو و درگزر کا پہلو، ان کی زندگی میں بہت نمایاں ہے۔ کوئی انہیں بڑی سے بڑی تکلیف پہنچائے، وہ اُسے معاف کر دیں گے انتقام کا تو کبھی

خیال بھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتا .... کسی انسان کو وہ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اسی لئے دوسروں کا دکھ ان کا اپنا دکھ بن جاتا ہے۔ دوسروں کی تکلیف کو وہ اپنی تکلیف بنا لیتے ہیں۔

یہی کیفیت ان کے تصورِ انقلاب کا منبع ہے۔ وہ انقلابی ہیں۔ انہوں نے انقلابی شاعری کی ہے اور صرف اس لئے کی ہے کہ اس کے بغیر انہوں نے انسانوں کو تکلیف میں دیکھا ہے، پریشانی میں گرفتار پایا ہے۔ انسان پر انسان کی بیداد ان کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے، جبر و استبداد کا عفریت انہیں ڈستا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس نظام میں جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ جس میں انسانوں کے لئے زندگی کی آسائشیں نہیں ہیں۔ راحت و آرام نہیں ہے جن کی زندگی محض آلام سے عبارت ہے شاعرِ انقلاب اس نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ اس عالم میں وہ خونریزی سے بھی گریز نہیں کرتے..... خون کی ندیاں بہاتے ہیں اور ان کا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب ہو جاتا ہے.... اس انقلاب میں ان کی نظریں زوالِ جہانبانی دیکھتی ہیں اور ایک نیا نظام انہیں قائم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس میں امن اور عافیت کا ہونا یقینی ہے جس میں امیر و غریب، آقا اور مزدور کی تفریق کا مٹ جانا لازمی ہے۔ بس یہی جوش صاحب کا انقلاب ہے۔ ان کے انقلاب میں جھنجھلاہٹ زیادہ ہے۔ ایک اُبال کی سی کیفیت زیادہ ہے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے انقلاب کو ایک ہنگامہ بنا دیا ہے۔ عمرانیات کے مفکروں نے انقلابات کے جو تصورات پیش کئے ہیں ان سے شاعرِ انقلاب کو غرض نہیں۔ وہ تو انقلاب چاہتے ہیں لیکن اس انقلاب میں کسی منصوبہ بندی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ طبیعت کا اضطراب انہیں اتنی فرصت ہی کہاں دیتا ہے؟ مزاج کی بے چینی اتنی مہلت ہی کب دیتی ہے۔ وہ انقلاب کے معاملات پر غور کم کرتے ہیں۔ اس پر عمل زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں انقلاب کا تصور اگرچہ تمام رومانی اور تخیلی ہے لیکن اس کے باوجود وہ تمام تر انسانی محبت اور ہمدردی سے معمور ہے۔

شاعرِ انقلاب کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر کبھی کسی سیاسی بات کا خیال انہیں آتا بھی ہے تو صرف عام انسانوں کی بہتری کے خیال سے آتا ہے اگر کبھی وہ سیاسی معاملے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے پیشِ نظر نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ جو سیاست عوام سے دور ہو اس سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ گزشتہ نصف صدی کی ملکی سیاست میں انہوں نے جو کچھ کیا ہے۔

وہ یہ ہے کہ انگریزوں کی مخالفت کی ہے اور اس طرح قومی تحریکوں میں شریک ہوئے ہیں۔ انگریز نے ان کے ہم وطنوں پر کئی سو سال تک ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے اور اس طرح انہیں آزادی اور فارغ البالی کی مسرتوں سے محروم رکھا۔ اسی لئے وہ انگریز کے مخالف رہے ہیں۔ جب دوسری جنگِ عظیم چھڑی ہے تو یہ مخالفت بہت واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ وطن پرستی اور عوام دوستی کے زیر اثر کہا ہے۔ پھر جب حالات زیادہ خراب ہوئے ہیں تو انہوں نے ملک میں اشتراکی سیاست کی ہمنوائی بھی صرف اسی خیال سے کی ہے کہ شاید یہ عوام کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ بہر حال ان کی سیاست عام انسانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جس افراتفری اور انتشار کا دور دورہ ہوا، اور اس کے نتیجہ میں جس طرح ہنگامہ آرائی ہوئی، اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں مجھے لکھتے ہیں،

> ''کہہ نہیں سکتا عبادت صاحب کہ اس تقسیم اعضاء و جوارح کا میرے دل پر کس قدر اثر ہے۔ حیات کے تمام ولولے ٹھٹھر کر رہ گئے۔ ہندوستان کیا بٹا کہ سب کچھ لٹ گیا .... اے سیاست، تجھ پر لعنتوں کی بارش اور پھٹکاروں کی بوچھار........''
>
> جینے سے میں سیر ہو چکا ہوں۔ جسمانی اور ذہنی طور پر اس قدر تھک کر چور ہو چکا ہوں کہ اب زندگی کا چلانا خبیث ترین قید بامشقت معلوم ہو رہا ہے.......'

سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے
اپنے کو فریب عیش دیتے دیتے
اُف جہدِ حیات تھک چکا ہوں معبود!
دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے ''

نیازمند

جوشؔ

یہ سطریں شاعر انقلاب سے اسی انسانی احساس نے لکھوائی ہیں۔ جسے وہ کسی حال میں بھی

اپنے آپ سے جدا نہیں کرتے۔ اسی انسانی احساس نے انہیں سیاست کو جذبات کی عینک سے دیکھنا سکھایا ہے۔ سیاست انسانی جذبات پر بُرا اثر کرے تو وہ اس کو ایک لعنت اور پھٹکار سمجھتے ہیں، موجودہ دور کی سیاست اسی انسانی احساس سے محروم ہے اسی لئے میں نے جوشؔ صاحب کو کبھی بھی سیاست کی باتیں کرتے ہوئے نہیں سنا، البتہ سیاست جس طرح انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے بارے میں اکثر گفتگو کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں سیاست کے غیر انسانی ہونے کا بڑا دکھ ہے اور وہ ایک کرب کے عالم میں اس پر اظہار خیال کر دیتے ہیں۔ یہ کرب کا عالم میں نے اکثر ان پر دیکھا ہے۔

جوشؔ صاحب مذہب سے برگشتہ ہیں۔ ان پر کسی مذہب کا اثر نہیں ہے۔ ایک زمانے میں سنا ہے، ان پر تصوّف کا کچھ اثر ہو گیا تھا اور تقریباً انہوں نے فقیری لے لی تھی، گیرُوے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ ڈاڑھی بڑھائی تھی۔ سر پر کاکلیں رکھ لی تھیں..... ویسے میں نے اس عالم میں انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ بعض اشعار سے یہ خیال ضرور ہوتا تھا کہ تصوّف کا ان پر اثر رہا ہے۔ مثلاً ان کا یہ شعر تو پوری طرح تصوّف کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

عرفاں کا ذوق لے لے اے زندگی خدارا
دریائے معرفت کا ملتا نہیں کنارا

ایک دن میں نے جوشؔ صاحب کے سامنے یہ شعر پڑھا اور کہا کہ ”آپ تو مذہب اور روحانیت کے قائل نہیں پھر یہ تصوّف کا شعر آپ نے کیسے کہہ دیا ؟......“

کہنے لگے :

”عبادت صاحب ! یہ تصوّف کا شعر نہیں ہے۔ آپ نے اسے تصوّف کا شعر کیسے سمجھ لیا۔“

میں نے کہا:

”اس میں تو کھلم کھلا عرفان اور معرفت کا ذکر ہے اور عرفان و معرفت کا مطلب ہماری ادبی روایت میں معرفت الٰہی ہے۔“

انہوں نے جواب دیا :

''شاید آپ کو عرفان کے لفظ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ عرفان سے مراد عرفانِ زندگی ہے۔''

میں نے کہا :

''یہ کس طرح ممکن ہے؟''

کہنے لگے :

''انسانی زندگی میں عرفانِ حیات کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں
ابھی تو انسان نے گھٹنوں چلنا سیکھا ہے۔ ابھی تو انسان نے عرفانِ حیات کی
اولین منزلیں بھی طے نہیں کی ہیں...... ابھی تو اس راہ پر اسے نہ جانے کتنا
آگے جانا ہے۔ سائنس اور فلسفے کے نہ جانے کتنے انکشافات ابھی کلی سے
پھول بننے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی باتوں کے بجائے حیات انسانی کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ عرش سے زیادہ فرش ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔............

وہ مذہبی معاملات کو اہمیت نہیں دیتے لیکن مذہبیات سے انہیں دلچسپی ضرور ہے۔ انھوں نے مختلف مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ مذہب کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوبی سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں........ اور ان کی باتوں میں خاصی گہرائی ہوتی ہے۔ خاصا نیا پن ہوتا ہے وہ خاصی دلچسپ ہوتی ہیں......... اس کو کیا کیا جائے کہ انہیں تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا..........

جوش صاحب ویسے اب کسی مذہب کو نہیں مانتے لیکن اسلام کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی پسند مذہب سمجھتے ہیں۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہنے لگے:

''اگر میں کسی مذہب کا قائل ہوتا تو وہ اسلام ہے۔ زندگی کے بارے میں
اس سے زیادہ ترقی پسندانہ زاویۂ نظر کسی اور مذہب میں نہیں ملتا۔''

اس پر میں نے کہا :

''ترقی پسند زاویۂ نظر سے آپ کا کیا مطلب ہے......''

انہوں نے جواب دیا :

''اس میں انسانیت کا خیال سب سے زیادہ ہے۔''

میں نے کہا :

''انسانیت کا خیال تو ویسے تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔''

کہنے لگے :

''اسلام میں اس خیال کی بنیاد روشن خیالی پر استوار ہے اور یہ اس کا ترقی پسندانہ پہلو ہے۔''

لیکن اسلام کے اصول پر وہ عقیدہ نہیں رکھتے .... ایک صاحب نے بڑی مزے کی بات کہی کہ اب وہ اسلام پر ایمان نہیں رکھتے، لیکن حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؑ پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ خدا اور رسول کا ذکر نہیں کرتے۔ لیکن حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؑ کا ذکر برابر کرتے ہیں اور اس ذکر میں خاصی عقیدت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بچپن میں اپنی دادی کے اثر سے ان پر شیعہ عقائد کا رنگ چڑھ گیا تھا، اور وہ اب تک اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

اس عالم میں بھی جب وہ کسی مذہب کو بھی نہیں مانتے ...... جوش صاحب نے خود اس سلسلے میں ایک دفعہ بڑی مزے دار بات کہی تھی کہ

''بھئی میری حالت تو .... مرض کی حیثیت رکھتی ہے اور آپ جانتے ہیں۔ یہ مرض کبھی جاتا نہیں .....''

جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں جوش صاحب کسی مذہب کے قائل نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک متشکک انہیں کہا جا سکتا ہے .... اس سے ہٹ کر ہماری زندگی میں دیکھئے تو وہ انسانیت کو مذہب سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اگر انسانیت کا تصور پیش نظر ہو تو پھر کسی مذہبی اصول کی ضرورت نہیں! .... ایسی صورت میں نظام حیات (اُن کے خیال کے مطابق) انسان مذہب اور اس کے اصولوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ویسے یہ ہے تو بڑا اختلافی مسئلہ لیکن اس سے جوش صاحب کی انسانیت انسان دوستی اور

انسانیت پرستی پر حرف نہیں آتا۔ ان خیالات سے تو اس کو تقویت پہنچتی ہے۔

جوش صاحب شاعر ہیں فلسفی نہیں ہیں لیکن ان کے یہاں ایک فلسفہ حیات ملتا ضرور ہے انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا ہے اور اس غور و فکر کے بعد چند نتائج نکالے ہیں۔ وہ مابعد الطبیعاتی معاملات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ زندگی میں مادہ ہی ان کے نزدیک سب کچھ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس مادی زندگی میں خیر و شر کے درمیان ایک آویزش اور کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی کشمکش اور آویزش کے نتیجے میں انسانی زندگی آگے بڑھتی ہے۔ ارتقائی راہوں پر گامزن ہوتی ہے۔ یہی جہد ارتقا ہے۔ یہی جدلیات کا نظریہ ہے۔ تہذیبی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی غرض تمام مسائل کو وہ فلسفیانہ زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں لیکن آخر میں ان کے یہاں بہر حال شاعر فلسفی پر غالب آجاتا ہے اور وہ فلسفی کے بجائے شاعر ہی رہ جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ جدلیات پر ایمان رکھنے کے باوجود جبر کے قائل نہ ہوتے۔ انسانی زندگی انہیں بے بسی کا شکار نظر نہ آتی۔ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ جذبات کا پہلوان کی شخصیت میں اس قدر شدید ہے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ جبر کے اس حد تک قائل ہیں کہ بعض اوقات تو ان کی باتیں سُن کر شوپنہار اور ہارڈی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایک شام جوش صاحب شراب پی رہے تھے کہ بات جبر و اختیار کے فلسفیانہ مسائل پر چھڑ گئی۔

میں نے کہا :

"آپ یہ شراب اپنے اختیار ہی سے تو پی رہے ہیں۔"

کہنے لگے :

"مجھے اس پر بالکل اختیار نہیں!"

میں نے کہا :

"یہ کس طرح؟"

کہنے لگے :

"کوئی طاقت مجھ سے کہتی ہے کہ اس گلاس میں شراب انڈیل دو۔ میں انڈیل دیتا ہوں۔ پھر کوئی طاقت کہتی ہے ہاتھ بڑھاؤ میں ہاتھ بڑھا

دیتا ہوں۔ پھر وہ طاقت کہتی ہے شراب پیو کہ اس سے تمہیں زندگی کی لذت حاصل ہوگی، سرور ملے گا، جہاں کا غم غلط ہو جائے گا۔ بس میں شراب پی لیتا ہوں۔ اس میں میری ذات کو تو ذرا بھی دخل نہیں۔"

میں نے کہا:

"جوش صاحب! یہ بڑی شاعرانہ بات ہے لیکن اس کو حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔"

اس پر انہوں نے جواب دیا:

"عبادت صاحب! زندگی میں بس یہی ایک حقیقت ہے۔ انسان بے بس ہے اس کے اختیار میں کچھ نہیں ...... کچھ بھی تو نہیں۔"

اور پھر انہوں نے انسانی زندگی کے بارے میں کچھ اس طرح کی باتیں شروع کر دیں۔ کہ قدم قدم پر اس زندگی میں انسان کو بے بسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بچپن جوانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جوانی بڑھاپے میں بدل جاتی ہے اور پھر موت کا خطرہ ہر ہر گام پر درپیش ہوتا ہے۔ چنانچہ موت آتی ہے۔ پھولوں سے شگفتہ چہرے کملا جاتے ہیں۔ کیسی کیسی صورتیں خاک میں پنہاں ہو جاتی ہیں اور انسان کا کچھ بھی بس نہیں چلتا...... مشیت کا یہ منشا ہے کہ ہر شخص کی خواہش اس کے دل میں ایک داغ بن جائے۔ میں نے چند اشعار میں اس خیال کو واضح کیا ہے۔ سنیئے عبادت صاحب! غور سے سنیئے ..... ہائے۔

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا
کہ قلب آدم خاکی سدا فگار رہے
بس ایک بار میسر ہوں حسن کی باہیں
تمام عمر کو حسرت گلے کا ہار رہے
ہر ایک بوسۂ شیریں کا مدعا یہ ہے
کہ داغ بن کے کلیجے میں یادگار رہے

صاحب! یہی انسانی زندگی ہے انسان کی ساری زندگی ہائے ہائے کرتے گزرتی ہے اور پھر جب مرتا ہے تو منہ بنوا ہو جاتا ہے، بنوا...... اور پھر یہیں پر بس نہیں۔ مرنے کے بعد بھی کیا چین

ملتا ہے۔ سرِ حشر بھی حساب لیا جائے گا۔ ایک رباعی یاد آگئی سنیئے ؎

معبود، حیات بھی سو مرتے گزری
اک عمر کے دغدغوں سے ڈرتے گزری
اس عمر کا بھی حساب لے گا سرِ حشر
جو عمر کہ ہائے ہائے کرتے گزری

مشیت کی یہ خواہش ہے کہ جو شخص بھی مرے اس کا منہ بنا ہوا جائے۔ پچک جائے، سوکھ جائے۔ دیکھنے کے قابل نہ رہے.........

اس کے بعد تھوڑی دیر توقف کیا اور پھر کہنے لگے :

''آپ نے کبھی یہ بھی غور کیا ہے عبادت صاحب !
کہ انسان کو کتنی مختصر سی زندگی ملتی ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں وہ کیا کیا کچھ کرتا ہے زمین سے سونا اگلواتا ہے، سمندروں کے سینوں پر دوڑتا ہے۔ آسمانوں پر پرواز کرتا ہے۔ ساری انسانی زندگی انسان کی عظمت کا ایک نغمہ ہے، ایک راگ ہے ایک الاپ ہے، لیکن مشیت اس کا صلہ انسان کو یہ دیتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے قویٰ مضمحل ہوتے جاتے ہیں۔ جب انسان کام کرنے کے قابل ہوتا ہے تو اسے کام کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے...... قدغن لگا دی جاتی ہے کہ اب کام نہیں کر سکتے۔ اب تم بیکار ہو۔ اب تمہارے تجربے کی زندگی کو ضرورت نہیں ہے۔ انسان جب ذہنی فکری اور عملی اعتبار سے بلوغ کو پہنچتا ہے تو اسے اٹھا لیا جاتا ہے۔ موت آجاتی ہے۔ یہ کیا زندگی ہے؟ یہ کون سا قانون ہے؟ خدارا مجھے بتایئے عبادت صاحب !''

اور میں نے ہمیشہ ان کی ایسی باتوں کا جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہی سے دیا ہے :

شاعرِ انقلاب نے مجھ سے اس طرح کی بے شمار باتیں کی ہیں۔ اتفاق اور اختلاف سے قطع نظر ان باتوں کو جوش صاحب کی زبانی سن کر مجھے ایسا لطف آیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام باتوں کی بنیاد شدید انسانی احساس ہے۔ انہیں انسانی زندگی سے جو گہرا لگاؤ ہے جو

گہرا تعلق ہے وہ ان سے اس قسم کی باتیں کہلواتا ہے........ وہ انسانی زندگی اور اس کی مسرتوں کے شیدائی ہیں اور انہیں مسرتوں کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں۔ اس لئے جب یہ مسرتیں انہیں آندھیوں کی زد پر نظر آتی ہیں۔ تو اس قسم کے خیالات کا اظہار ان کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پیمانہ لبریز ہو جائے تو شراب چھلک ہی پڑتی ہے۔'

لیکن زندگی کو اس زاویہ نظر سے دیکھنے اور اس کے متعلق اس انداز میں سوچنے کے باوجود وہ ارتقا پر ایمان رکھتے ہیں۔ حیات انسانی نے ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں۔ اس کا ذکر انہوں نے ہمیشہ بڑے فخر سے کیا ہے۔ اسی ارتقا میں انہیں انسانی زندگی کی عظمت نظر آتی ہے۔ نئے سے نئے فلسفیانہ نظریات نئے سے نئے عمرانی تصورات، نئے سے نئے سائنسی انکشافات پر وہ بڑی ہی پر لطف باتیں کرتے ہیں۔ ان باتوں سے زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور اس طرح اس کی صحیح اہمیت ذہن نشین ہوتی ہے۔

ایک دن میں نے دورانِ گفتگو میں بات پیدا کرنے کے لئے جوش صاحب سے کہا:

''آپ ارتقا کے قائل ہیں لیکن انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں۔ کیا اس میں تضاد نہیں ہے؟''

جوش صاحب نے فوراً جواب دیا......

''یہ تضاد تو خود زندگی میں موجود ہے۔''

میں نے کہا......

''اس ارتقاء کے باوجود آج انسان موت کے سامنے بے بس ہے۔''

کیا آپ کے خیال میں کوئی زمانہ ایسا آ سکتا ہے کہ وہ موت پر حاوی ہو جائے، اور اس پر قابو پالے۔''

کہنے لگے.........

''انسان کی ترقی کی رفتار سے یہ بعید نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو جائے بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ وہ ہزار دو ہزار سال کے بعد یقیناً موت پر فتح پالے گا۔''

میں نے کہا........

''پھر تو لوگ مرنے کی آرزو میں مرا کریں گے جوش صاحب!''

کہنے لگے.......

''جو کچھ بھی ہو لیکن انسان کی مادی ترقی سے یہ بعید نہیں ہے۔ پہلے اس میں اس کو کامیاب ہو جانے دیجئے، پھر دیکھئے انسانی زندگی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ابھی سے آپ کیوں گھبرا رہے ہیں؟''

میں نے مرنے کی آرزو میں مرنے والی بات محض تفنن طبع کے طور پر کہی تھی۔ اس لئے ان کے جواب میں مجھے بڑا لطف آیا اور اس پر ہنسی آ گئی۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا جوش صاحب فلسفی نہیں ہیں۔ وہ صرف شاعر ہیں۔ اسی لئے ان کے فلسفیانہ خیالات و نظریات میں گہرائی نہیں ہے اور گہرائی نہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں تضاد بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس تضاد کے باوجود جوش صاحب نے حیات و کائنات کے بارے میں جو خیالات قائم کئے ہیں وہ غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان میں زندگی کے حقائق ہیں۔ جوش صاحب نے ان حقائق کے ہر پہلو پر غور کیا ہے۔ ہر فلسفی کو انہوں نے پڑھا ہے اور بڑی محنت سے پڑھا ہے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کی نہ جانے فلسفہ کی کتنی کتابیں تو ان کی فرمائش پر میں نے یونیورسٹی لائبریری سے نکال کر انہیں دی ہیں اور انہوں نے ان سب کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کیا ہے۔ تضاد پیدا ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر جذبات کے دھارے پر بہنے لگتے ہیں۔ شاعر ان پر غالب آ جاتا ہے اور ظاہر ہے وہ فلسفی سے کہیں زیادہ ایک شاعر ہیں۔

جہاں تک ان کے عمرانی نظریات کا تعلق ہے، ان میں بھی فلسفیانہ نظریات ہی کا سا انداز نظر آتا ہے۔ یوں وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں۔ اشتراکیت ان کے خیال میں موجودہ زندگی کی کشمکش کا واحد حل ہے لیکن بعض باتیں ان کے یہاں ایسی بھی ملتی ہیں جن کا اشتراکیت سے کوئی سروکار نہیں۔ جہاں تک ان کا یہ خیال ہے کہ زندگی میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ انقلاب کے بعد ہی ایک ایسا نظام قائم ہو سکتا ہے، جس میں طبقاتی تفریق نہ ہو، ایک شخص دوسرے شخص پر ظلم و ستم روا نہ رکھے۔ دولت کی تقسیم مساوی ہو۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کس طرح ہوگا۔ اس کا انہیں علم نہیں ہے۔ بات یہ ہے زندگی کی کشمکش کو وہ سامنے نہیں رکھتے، اسی لئے ان حالات کو سمجھنے سمجھانے میں ان کا انداز سائنٹیفک اور عقلی کم ہوتا ہے، جذباتی زیادہ!

اس صورت حال کا یہ اثر ہے کہ کبھی وہ اشتراکیوں کے خلاف ہوجاتے ہیں، کبھی موافق۔ کبھی ترقی پسندوں کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں اور کبھی ان کی جماعت انہیں مینڈکوں کا جلوس، نظر آتی ہے۔

اپنے ان خیالات میں جذباتی ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ بعض معاملات میں تو ان کے خیالات کی حدیں رجعت پسندی سے جا ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر عورت کا تصور ان کے یہاں خاصا رجعت پسندانہ ہے وہ عورت کو محض تعیش اور لذت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور سماجی زندگی میں اسے کوئی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، عورت کے لئے وہ تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے۔ علم و عمل کو وہ نسائیت کی موت خیال کرتے ہیں۔ اس موضوع پر میں نے ان سے بارہا بحث کی ہے۔ بحث سے تو وہ مجھے قائل نہیں کر پائے ہیں اور جب مجھے قائل ہوتا ہوا نہیں دیکھا ہے تو کہا ہے اچھا میرے چند اشعار سنیئے۔ آپ قائل ہوجائیں گے اور یہ کہہ کر مجھے یہ اشعار سنائے ہیں۔

علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل ہے وہ بددماغ
جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ
دور ہی سے ایسے علم جہل پرور کو سلام
حُسنِ نسواں کو بنا دیتا ہے جو جاگیرِ عام
جس جگہ حورانِ جنت کا کیا ہے تذکرہ !
کیا کہا ہے اور بھی کچھ ہم نے جز حُسنِ حیا
تذکرہ حوروں کا ہے محض ایک تصویرِ جمال
ہم نے کیا ان کو کہا ہے صاحبِ فضل و کمال
ہیچ ہے ہر چیز، زیور، غازہ افشاں، رنگ و خال
حسن ہے ہر رنگ میں خود سو کمالوں کا کمال
چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار
علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار
روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موجِ ماہتاب

کیا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب
میرے عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا شعار
"کاکل افسانہ" "ہو دوش حقیقت" سے دوچار
حسن کا آغوشِ رنگیں دلفریب و دل ربا
علم سے بن جائے اقلیدس کا محض اک دائرہ
مُصحفِ روئے کتابی، روِش نازِ گلاب
اور بن جائے لغت یا دفترِ علمِ حساب
نغمۂ شیریں کے دامن میں ہو شورِ کائنات
بزم کاوش میں جلے شمع شبستان حیات

اور واقعی ان اشعار کو سننے کے بعد میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگا ہوں۔ گویا کہ انہوں نے مجھے قائل کر دیا ہے۔ حالانکہ میں قائل نہیں ہوا۔ کون ہے جو ان اشعار کو سن کر جھومنے نہیں لگے گا؟

جوش صاحب کے نظریات سے کسی کو اختلاف ہو لیکن اپنی شاعری کے سحر سے وہ اختلافی مسائل کو بھی وقتی طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن بہر حال اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا کہ عورت کے بارے میں ان کے یہ نظریات قدامت پرستی اور رجعت پسندی پر مبنی ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں!

ایک وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ جوش صاحب نے ایک زمانے تک قدامت کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ ان پر باوجود بعض معاملات میں انقلابی ہونے کے اپنی تہذیبی اور معاشرتی روایات کا گہرا اثر ہے اور ان روایات کی پاسداری کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں۔

روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ شاعر انقلاب کو اپنی آبائی امارت اور ریاست پر بھی فخر ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ امارت کی مذمومات ان کی شخصیت میں نسبتاً بہت کم ہیں لیکن امارت کا خیال بہر حال موجود ہے۔ اس لئے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ ہر وقت گرد و پیش ایک درباری ماماحول قائم رکھتے ہیں۔ اس ماحول میں درباداری کی فضا تو نہیں ہوتی۔ کیونکہ جوش صاحب کی

شخصیت میں حد درجہ عجز و انکسار ہے لیکن ساتھ ہی ایک ایسا انداز بھی ہے جس میں درباری ماحول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جوش صاحب تنہا نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کے آس پاس کچھ لوگوں کا جمگھٹ ضروری ہے، ان لوگوں سے وہ خوش گپیاں کرتے ہیں۔ لطیفے سناتے اور سنتے ہیں۔ شعروشاعری ہوتی ہے۔ اور اس طرح ان کا وقت گزرتا ہے۔ اس محفل میں کوئی بھی شریک ہو سکتا ہے لیکن اس میں شریک ہونے کے لئے آداب محفل کا خیال ضروری ہے۔ جوش صاحب اپنی محفلوں میں ایسی حرکات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جو معاشرتی اور تہذیبی روایات کے خلاف ہوں۔ اسی لئے ان محفلوں میں بے تکلف ہونے کے باوجود وہ ایک مخصوص دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ چند حدود بہر حال قائم رکھتے ہیں۔

جوش صاحب کو پوری طرح بے تکلف تو ان کے چند مخصوص احباب ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان احباب سے وہ محبت کرتے ہیں۔ ان احباب پر وہ جان چھڑکتے ہیں۔ ان کی ہر بات کا خیال رکھتے ہیں اور ان کے سامنے وہ کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے، انہیں کے ساتھ ان کے وقت کا بیشتر حصہ گزرتا ہے۔ وہ ان سے بے تکلف ہوتے ہیں اور اس بے تکلفی میں پرانے واقعات کو دہرایا جاتا ہے۔ حسن و عشق کی باتیں بیان کی جاتی ہیں، لطیفوں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نوبت رقص و سرود اور مناقشے تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ محفلیں صرف بذلہ سنجیوں کیلئے مخصوص ہوتی ہیں۔ سنجیدہ گفتگو ان میں نام کو بھی نہیں ہوتی۔ جوش صاحب ان احباب کی خاطر کرتے ہیں۔ انہیں کھلاتے ہیں، پلاتے ہیں۔ ان کے لئے دلچسپیوں کے مختلف سامان فراہم کرتے ہیں اور اس طرح ان کی یہ محفلیں کافی پر لطف بن جاتی ہیں۔

یوں احباب کے معاملے میں جوش صاحب زود رنج نہیں ہیں۔ شاید ہی وہ اپنے کسی دوست سے کسی بات پر ناراض ہوتے ہوں۔ البتہ کبھی کبھی نشے میں ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس عالم میں، جب کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہو، اور جس کے واقع ہونے سے انہیں یہ خیال گزرے کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا ہے۔ کئی سال کی بات ہے۔ ایک بے تکلف دوست دلی آئے جوش صاحب نے مجھے اور انہیں شام کے کھانے پر بلایا اور یہ کہا کہ اسی موقع پر اپنا تازہ کلام سنائیں گے۔ ایسا کلام جس کے چھپنے کی اس زمانے میں ممانعت کر دی گئی تھی اور یہ تاکید کر دی کہ ساڑھے

سات بجے تک ضرور پہنچ جائیں۔ ورنہ اس کے بعد ان پر شراب کا اثر خراب ہونے لگتا ہے۔ اس دن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ہمیں ان کے یہاں پہنچنے میں کوئی ایک گھنٹے کی تاخیر ہوگئی ہم لوگوں نے سوچا کہ شراب تو پیتے نہیں۔ اس لئے ذرا اطمینان سے چلیں گے۔ ہماری عدم موجودگی میں دو ایک دور ہو جائیں گے تو مناسب ہوگا۔ بہر حال ہم لوگ کوئی سوا آٹھ بجے کے قریب پہنچے تو دیکھا جوش صاحب بوتلیں بھرے بیٹھے ہیں۔ ان کا موڈ ہمارے دیر میں پہنچنے سے خراب ہو چکا تھا دیکھتے ہی برسنے لگے۔

''اچھا تو آپ لوگ تشریف لے آئے''

میں نے کہا:

''جوش صاحب! ہم لوگ بہت شرمندہ ہیں۔ ہمیں دیر ہوگئی۔ راستے میں ایک صاحب نے پکڑ لیا۔ لاکھ کوشش کی لیکن انہوں نے ایک نہ سُنی اور ہمیں نہ چھوڑا''

جوش صاحب کہنے لگے:

''آپ لوگ مجھے گولی مار دیجئے۔۔۔قتل کر دیجئے۔''

اس پر مجھے ہنسی آگئی لیکن میں نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا:

''جوش صاحب! ہم دونوں معذرت خواہ ہیں۔ آپ معاف کر دیجئے۔''

انہوں نے پھر کہا!

''جب دوست کو دوست کا خیال نہ رہے تو دوست کو چاہیئے کہ دوست کو گولی مار دے۔''

ان باتوں میں ہلکی سی خفگی ضرور تھی لیکن دراصل یہ باتیں وہ انتہائی محبت میں کہہ رہے تھے۔

میں نے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی اور کہا:

''جوش صاحب! اب وہ کلام سنا دیجئے جس کے سنانے کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔''

کہنے لگے.......

''اب وہ کلام کیسے سناؤں؟ جب دوست، دوست کو دوست ہی نہ سمجھے تو اُسے کلام سنانے سے کیا حاصل؟''

غرض دیر تک وہ اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اصل میں وہ نشے میں تھے اور ہمارے دیر میں پہنچنے سے ان کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں منایا اور منانے کے بعد پھر دیر تک کلام سنا۔

احباب ہی کے ساتھ جوش صاحب کبھی کبھی اس طرح بگڑ لیتے ہیں ورنہ کسی اور کے ساتھ انہیں بگڑنا نہیں آتا۔ ناراض ہونا تو وہ سرے سے جانتے ہی نہیں۔ صرف بے تکلف احباب ہی سے وہ ناراض ہو لیتے ہیں لیکن ان کے اس ناراض ہونے میں بھی حد درجہ محبت ہوتی ہے۔

جوش صاحب کے یہ احباب جب تک یک جو ہو کر بیٹھتے ہیں۔ تو رندی اور قلندری کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ اس رندی اور قلندری کے بغیر جوش صاحب زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ یہ ان کے مزاج کا جزو ہے۔ اس کے بغیر انہیں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ سانس لینی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے تو جوش صاحب کی رندی اور قلندری کو الگ کر لیجئے تو ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

شاعر انقلاب کے مزاج میں رندی اور قلندری ضرور ہے۔ انہوں نے اس رندی اور قلندری کو اپنی ساری شخصیت پر طاری کر لیا ہے لیکن ان کی شخصیت کی اس خصوصیت نے انہیں اپنی ذمہ داریوں سے بیگانہ نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس رندی کے باوجود اپنی گھریلو زندگی میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ یوں شادی شدہ زندگی کو وہ ہمیشہ صلواتیں سناتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ زندگی انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ شوخی اور شگفتگی کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ چنانچہ جب بھی کوئی نوجوان اُن سے ملتا ہے تو وہ اس موضوع پر اس سے گفتگو ضرور کرتے ہیں۔ پوچھتے ہیں ..... ''کیوں صاحب آپ نے شادی کی یا نہیں؟'' اگر اس نے کہا..... ''جی نہیں'' تو ان کے منہ سے نکلے گا۔ الحمد اللہ، آپ اس لعنت سے محفوظ ہیں۔ ہرگز شادی نہ کیجئے گا۔ انسان کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ کولھو کا بیل ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر اس نے جواب دیا۔ ''کر لی ہے'' تو وہ کہیں گے۔ ''انا اللہ وانّا الیہ راجعون۔ خدا آپ پر رحم کرے۔''

اس موضوع پر انہوں نے ایک طویل نظم بھی لکھی ہے جو اکثر نوجوانوں کو سنا بھی دیتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ ان کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی ان کی یہ زندگی رندی اور قلندری کی راہوں میں حائل ضرور ہوتی ہے لیکن انہوں نے اس کے باوجود اس

زندگی کی مسرتوں کو محسوس کیا ہے اور وہ اس کی اہمیت کے قائل رہے ہیں۔ اس لئے ان کی گھریلو زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی اہلیہ اور بچوں کا خیال رکھا ہے۔ انہیں ان سب سے محبت ہے۔ اگر کسی سے وہ اس زندگی میں خوف کھاتے ہیں تو وہ ان کی اہلیہ ہیں جنھیں وہ ہنسی سے ''اُم الشعرا'' کہتے ہیں۔ انہوں نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب تک ان کا خاتمہ ہو چکا ہوتا، اگر ان کی اہلیہ ان کی غیر معتدل زندگی میں اعتدال نہ پیدا کرتیں۔ اسی لئے تو وہ کہتے ہیں۔

''میری بیوی نے اپنی سخت گیری سے جو توازن میرے اندر پیدا
کیا ہے اس نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے، وہ میرے لئے ایک بریک رہی
ہیں بریک۔''

جب بھی وہ غلط راستے پر چلے ہیں انہیں روکا ہے۔ جب بھی انہوں نے حد سے زیادہ تجاوز کیا ہے انہوں نے بری طرح ان کی خبر لی ہے۔ جب بھی وہ اعتدال اور توازن سے ہٹے ہیں تو انہوں نے ایسا آڑے ہاتھوں لیا ہے کہ طبیعت ٹھکانے ہو گئی ہے۔ اپنی اولاد کو انہوں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے۔ اس حد تک کہ لڑکی اور داماد کو اپنے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ گھریلو زندگی کا اس قدر خوشگوار ہونا جوش صاحب کے ایسے انسان کے لئے کسی حد تک عجیب ضرور ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ جوش صاحب کی زندگی کے اس پہلو نے ان کی شخصیت کو عظمت سے ہمکنار ہونے میں مدد کی ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ جوش صاحب شاہد و شراب کے والا و شیدا ہیں۔ وہ اس دنیا کے انسان ہیں ان کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ وہ انہیں کے لئے جیتے ہیں انہیں کے سہارے زندگی کی راہ پر آگے بڑھتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں ہر وقت شاہد و شراب کا دور دورہ نہیں رہتا۔ اس کے لئے انہوں نے وقت کی تعین کر رکھی ہے۔ شام کا وقت اسی کام کے لئے ہوتا ہے۔ غروب آفتاب کے ساتھ جیسے ہی شام کی سیاہی چھانے لگتی ہے وہ محفل نائے و نوش کو آراستہ کر لیتے ہیں۔ دن بھر انہیں اس محفل کے آراستہ کرنے کا خیال رہتا ہے۔ اور وہ اسی خیال میں دن کا سفر طے کر کے شام کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ بقول ان کے

''شام ہی کا وقت ایسا ہوتا ہے جب میں اپنے آپ کو پانے کی
کوشش کرتا ہوں، ورنہ دن بھر تو بھٹکتے ہی گزرتی ہے۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ شام کے وقت انہیں دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے جیسے واقعی بھولے بھٹکے راہی کو منزل سے ہمکنار ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ دن بھر کی بے چینی اور اضطراب کے بعد یہی وقت ہوتا ہے۔ جب مسرت ان پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ اور وہ اس میں اپنے آپ کو غرق کر دیتے ہیں۔

جوش صاحب شام کے وقت کو مسرت، راحت اور آرام کا وقت سمجھتے ہیں۔ اس وقت وہ کوئی سنجیدہ بات کوئی علمی گفتگو کرنے اور سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس وقت تو ان کے خیال میں صرف مسرتوں سے اپنی جھولیوں کو بھرنا چاہیئے۔ زندگی سے رس نچوڑنا چاہیئے کیونکہ اسی عالم میں زندگی ان باتوں کا تقاضا کرتی ہے۔

دلّی کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے !

"عرصہ ہوا، اتفاق سے دلّی میں اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، ملیالم، کناری، تمام زبانوں کے بعض مشہور ادیب جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کو یکجا کرنے کی ایک صورت نکالی گئی تا کہ باہم تبادلۂ خیالات سے ہر ایک کو دوسرے سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے۔ اس کام کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس کا ایک جلسہ سہ پہر کے وقت منعقد ہوا۔ تمام زبانوں کے ادیب اس میں شریک ہوئے۔ یہ ایک تاریخی جلسہ تھا۔ مختلف موضوعات پر دیر تک گفتگو ہوئی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔"

جوش صاحب بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ آخر میں بعض لوگوں نے یہ اصرار کیا کہ جوش صاحب ادب اور مسرت کے رشتے پر روشنی ڈالیں لیکن شام ہو چکی تھی۔ اس لئے جوش صاحب پر بے چینی اور اضطراب کا عالم تھا۔ فرمائش پر کہنے لگے۔

"صاحب ! آپ حضرات دیکھتے ہیں، اس وقت کائنات کی ہر چیز آرام اور سکون چاہتی ہے لیکن آپ اس وقت مجھے سنجیدہ علمی گفتگو میں گھسیٹنا چاہتے ہیں اس وقت تو میرا جی یہ چاہتا ہے کہ کوئی مست شباب میرے سامنے رقص کرے۔ اس کے رقص کی جھنکار مسرت کے تمام رازوں

کو آشکار کر دے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح محفل برخاست ہوگئی۔ سب لوگ شاعر انقلاب کی اس بات پر خوش خوش رخصت ہوئے۔

شام کے وقت جوش صاحب اکثر اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ہر کام کا ایک وقت ہونا چاہیئے اور شام کے وقت سوائے شاہد و شراب سے دلچسپی لینے کے اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

اس لئے شام ہوتے ہی جوش صاحب کی محفل جم جاتی ہے۔ کاگ اُڑتے ہیں۔ پیالہ و ساغر کھنکتے ہیں، مئے و مینا کا رقص شروع ہو جاتا ہے۔ جوش صاحب خود بھی پیتے ہیں اور پینے والے احباب کو بھی پلاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ نہیں پیتے ان سے اصرار نہیں کرتے، اس سلسلے میں وہ بہت محتاط ہیں۔ جو لوگ شراب سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہم لوگوں کو تو انہوں نے "بچہ پارٹی" کا خطاب دے رکھا ہے۔ یہ خطاب ایک بڑی ہی رنگین اور پُرکیف محفل میں دیا گیا۔ ایک شب کو نئی دلّی میں ایک صاحب نے ان کو دعوت شراب دی تھی۔ حالانکہ وہ تنہا مدعو تھے، لیکن انہوں نے مجھ سے اور بعض دوسرے احباب سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ جوش صاحب کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کبھی تنہا کسی دعوت میں نہیں جاتے۔ احباب کو ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کی دعوت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو احباب بھی اس وقت ان کے ساتھ ہوں ان سب کی دعوت ہے۔ چنانچہ جوش صاحب ہمیں زبردستی اس دعوت میں لے گئے۔ ہم لوگ اس جگہ پہنچے تو دیکھا رنگ و بو کا ایک طوفان ہے جو وہاں اُمڈا ہوا ہے۔ نازنینان عشوہ کار کا ایک جھرمٹ ہے اور ان کے قریب ہی ایک میز پر قرینے سے رنگ رنگ کی شراب کی بوتلیں چنی ہوئی ہیں۔ لوگ ہنس رہے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں۔ مجھے وہاں پہنچ کر یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جوش صاحب نے پہنچ کر ہمارا تعارف کرایا۔ اور ہم اس رسمی تعارف کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے گزرنے نہیں پائے تھے کہ ایک صاحب نے سب کے ساتھ میرے سامنے بھی شراب کا ایک گلاس پیش کیا۔ میں اس منظر کو دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا اور معاً میرے منہ سے نکلا:

"شکریہ...... معذرت خواہ ہوں۔"

جواب ملا:

''اچھا تو آپ شوق نہیں فرماتے۔''

میں نے کہا:

''جی نہیں.... محروم ہوں۔ میں پیتا نہیں، صرف دیکھتا ہوں۔''

فرمایا:

''لیکن دیکھنے سے کیا فائدہ؟''

میں نے جواب دیا:

''نشہ تو دیکھنے سے بھی ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت بھی نشے میں ہوں۔''

اس پر وہ صاحبہ کچھ شرما سی گئیں۔ چہرے پر ایک سرخی سی دوڑ گئی۔ انہوں نے میرا مطلب سمجھ لیا تھا۔ اس وقت تک جوش صاحب گلاس ہاتھ میں لے چکے تھے اور اس گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔ جب ان صاحبہ کو شرماتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے۔ صاحب! انہیں معاف ہی کر دیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ پیتے پلاتے نہیں۔ صرف دیکھتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں دیکھنے ہی سے انہیں نشہ ہو جاتا ہے۔ اصل میں یہ ''بچہ پارٹی'' ہیں۔

اس پر عام حاضرین ہنسنے لگے!

خیر، یہ تو ضمنی بات تھی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ ''بچہ پارٹی'' نائے ونوش کی محفلوں میں بھی جوش صاحب کے ساتھ رہتی ہے لیکن وہ ان سے شراب پینے کے لئے اصرار نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ چائے پینے اور کچھ کھانے پر اصرار کرتے ہیں۔ بس تو پھر ایسی محفلوں میں یہ ہوتا ہے کہ جوش صاحب تو پیتے ہیں اور ''بچہ پارٹی'' کھانے میں مصروف رہتی ہے اور جوش صاحب اس پر خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ نوجوانوں کا شراب پینا انہیں خود بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اس چیز کو ان کے لئے صحیح معنوں میں اُم الخبائث سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ان کی محفل نائے ونوش ایک محفل وعظ میں تبدیل ہو جائے گی، انہیں اس کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے مخصوص انداز میں شراب کی تعریف ہی کرتے رہتے ہیں۔ اس کی عظمت کے گن ہی گاتے رہتے ہیں۔ شراب کی محفل میں وہ شراب کی تعریف نہ کریں تو انہیں چین نہیں پڑتا لیکن یہ

تعریفیں بڑے ہی دلچسپ اور پُرلطف انداز میں ہوتی ہیں۔ مجھے تو ان تعریفوں ہی میں شراب کا لطف آجاتا ہے۔

ایک شام کو اپنی مخصوص محفل میں جوش صاحب کہنے لگے:

''عبادت صاحب! ایک دن نہا دھو کر آیئے۔''

میں نے کہا:

''خیریت، یہ آپ کو اس وقت نہا دھو کر آنے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟''

کہنے لگے:

''نہا دھو کر آیئے تو پھر بتاؤں گا۔ پہلے وعدہ کیجئے۔''

میں نے کہا:

''اچھا منظور ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، لیکن پھر ہوگا کیا؟''

کہنے لگا:

''ہوگا کیا؟..... صرف یہ ہوگا کہ اس طرح آپ کا ''کفر'' ٹوٹے گا، ''ارتداد'' دور ہوگا، اور شراب سے رغبت ہوگی۔ یہ چیز بڑی ہی پاکیزگی کا تقاضا کرتی ہے۔''

میں نے کہا:

''بے شک صحیح ہے۔ جب ہی تو یہ ہم ایسے گندے اور گنہگار لوگوں کے پاس نہیں پھٹکتی۔''

جوش صاحب ہنس کر کہنے لگے:

''آپ کا کفر نہیں ٹوٹے گا۔''

میں نے کہا:

''جوش صاحب! ہم نے تو جنت ہی میں پینے کی قسم کھائی ہے۔''

کہنے لگے:

''سنیئے'' ایک رباعی یاد آگئی۔

کیا شیخ کی تلخ زندگانی گزری
بے چارے کی ایک شب نہ سہانی گزری

جنت کی دعاؤں میں بڑھاپا کاٹا
حوروں کی تمنا میں جوانی گزری

غرض شراب کی تعریف میں جوش صاحب اس طرح کی بے شمار باتیں کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ باتیں لطف سے خالی نہیں ہوتیں۔ میں تو ان باتوں پر جھومتا رہا ہوں۔ میرے نشے کے لئے تو ان کی یہ باتیں ہی کافی ہوتی ہیں۔

جوش صاحب کبھی تنہا شراب نہیں پیتے کہتے ہیں۔ تنہا شراب پینے سے شراب کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ ماضی کی تمام تصویریں بھوت بن کر شراب پینے والے کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اور وہ ان کو دیکھ دیکھ کر ڈرتا ہے۔ اس کے لئے تو یہ ایک کرب کا عالم ہوتا ہے۔ اسی لئے جوش صاحب اپنے ہم مشربوں کو جمع کر کے ہر شام ایک محفل جماتے ہیں اور دعوت نائے و نوش دیتے ہیں۔

میں نے جوش صاحب کو شراب پینے کے بعد بہکتے ہوئے بہت ہی کم دیکھا ہے۔ نشے کے عالم میں وہ موٹر تک چلاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے اعصاب مضبوط ہیں اور اعصاب مضبوط اس وجہ سے ہیں کہ شراب کے معاملے میں انہوں نے زندگی بھر اعتدال سے کام لیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں شراب مجھ پر حاوی نہیں ہو سکی ہے، میں شراب پر حاوی ہو گیا ہوں، اسی لئے وہ شراب پینے کے بعد نشے کے عالم میں موٹر تک چلا سکتے ہیں۔ میں تو جب بھی اس عالم میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھا ہوں۔ تو میری جان نکل گئی ہے۔ لیکن آج تک کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

شراب کا نشہ جوش صاحب پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ اس عالم سرخوشی میں ان کی باتیں سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات سناتے ہیں۔ لطیفے سناتے ہیں۔ کلام سناتے ہیں اور اس لئے ان کی یہ محفل باغ و بہار بن جاتی ہے۔

جوش صاحب کو ان کے اصل روپ میں دیکھنے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہوتا!

شاعر انقلاب کی زندگی میں یوں بڑا اعتدال ہے۔ شراب نوشی تک میں جو اعتدال سے کام لے اس کی بڑائی سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس اعتدال کے باوجود معمولی طور پر دیکھا جائے تو ان کی زندگی میں خاصا لاابالی پن نظر آتا ہے۔ ایک ایسا لاابالی پن جس کی جھلک، ہر جینئس GENIUS میں کسی نہ کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے۔ یوں دیکھئے تو شاعر

انقلاب کی شخصیت میں بڑی با قاعدگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں، صبح کو طرف چمن و صحن بیاباں میں، دن کو شہر و بنر و کوئے ادیباں میں، شام کو رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں، اور رات کو بزم طرب و کوچۂ خوباں میں نظر آتے ہیں۔ اس معمول میں کبھی بھی فرق نہیں آتا۔ لیکن اس با قاعدگی کے باوجود ان کے مزاج میں بے قاعدگی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عملی آدمی نہیں ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ وہ جذباتی، تخیلی اور روحانی ہیں۔ انہیں کسی ایک جگہ پر قرار نہیں، سوچتے نہ جانے کیا کیا کچھ ہیں۔ لیکن کرتے کچھ بھی نہیں، ان کی طبیعت میں ایک فطری لاپروائی ہے۔ اس لاپروائی نے انہیں زندگی میں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کی ساری جائیداد اسی لاپروائی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ جائیداد کے سلسلے میں جو مقدمے ہوئے ہیں، ان کی پیروی جس طرح ہونی چاہیئے۔ وہ ان سے نہیں ہو سکی ہے۔ پیشی کی تاریخ گزر جانے کے بعد انہیں پیشی کی تاریخ کا خیال آیا ہے۔ ان حالات میں پیروی بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ سوائے شاعری کے انہوں نے کسی کام کی طرف بھی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی ہے۔ تن آسانی بھی ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ وہ عملی زندگی میں محنت اور جفا کشی سے بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔

یہ تمام باتیں ان کی شخصیت میں موجود ہیں۔ انہیں خود بھی اس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ان خامیوں کو سمجھتے ہیں۔ ان کا شعور رکھتے ہیں۔ میں نے ان خامیوں کا ذکر کر کے انہیں خود اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور ملامت تو وہ اپنے آپ کو بہت کرتے ہیں۔ اپنی کوئی خامی ذہن میں آئے گی یا کسی کمزوری کا احساس ہوگا، بیٹھے بیٹھے کہہ اُٹھیں گے۔ '' صاحب! ہم بڑے نالائق ہیں۔ ہمیں تو مر جانا چاہیئے، ہمیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ لااُبالی پن نہیں ہے۔ عملی زندگی سے ایک بے نیازی کی سی کیفیت ہے اور یہ بے نیازی ہر جینیس GENIUS کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔

اس لئے اس لااُبالی پن، اور بے نیازی سے شاعر انقلاب کی شخصیت کی عظمت کو ٹھیس نہیں لگتی۔ ان کی بڑائی میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

شاعرِ انقلاب بنیادی طور پر ایک شاعر اور فن کار ہیں اور ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو، ان کی یہی شاعری اور فن کاری کا تعلق ہے۔ ان کی شخصیت اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ صورت

سے انداز سے چال ڈھال سے گفتگو سے وہ شاعر اور صرف شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں بانکپن اور طرحداری سے ملی جلی وہ جو ایک معصومیت اور سادگی ہے اس خیال کو حقیقت بنا دیتی ہے۔ ہوشمند اور باشعور ہونے کے باوجود وہ جو ہر چیز کو حیرت اور استعجاب سے دیکھنے والی کیفیت ہے اس سے بھی یہ خیال صحیح ثابت ہوتا ہے۔ باوقار اور پر تمکین ہونے کے باوصف وہ جو آن کی آن میں ہر حسین چیز پر لوٹ پوٹ ہو جانے والا انداز ہے، اس سے بھی اس خیال پر صداقت کی مہر لگتی ہے۔ غرض ان کی ہر بات سے شاعر اور فن کار ہونا ٹپکتا ہے اور شخصیت کی یہ شاعرانہ اور فنکارانہ خصوصیات ان کے لاابالی پن یا عملی زندگی سے بے نیازی کو بڑی حد تک پس منظر میں ڈال دیتی ہے۔ جوش صاحب کی شاعرانہ اور فن کارانہ عظمت کے پیش نظر ان خامیوں کو نظر انداز کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ اسی لئے میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جوش صاحب کے اس لاابالی پن کو برداشت کر لیتے ہیں۔ جن کے مزاج میں باقاعدگی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اسی لئے جوش صاحب کے پرستاروں میں رندان بلانوش اور عاشقان جنون کوش سے لے کر واعظانِ خشک اور زاہدانِ بے رنگ تک شامل نظر آتے ہیں۔ ایک شخص جوان سے ایک بار مل لیتا ہے، ان کی جاذب نظر اور دل میں کھب جانے والی شخصیت کا دلدادہ ہو جاتا ہے اور پھر ساری زندگی ان کا دلدادہ ہی رہتا ہے۔

جوش صاحب کی اس رنگارنگ پر کیف اور دلآویز شخصیت میں ان کی شاعرانہ عظمت اور فن کارانہ فوقیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ اسے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ وہ ایک انسان اور دوست ہی کی حیثیت سے عظیم نہیں ہیں۔ ایک شاعر اور فن کار کی حیثیت سے بھی عظیم ہیں اور ان کی اس شاعرانہ اور فن کارانہ عظمت کا راز، انسانی زندگی کے شدید احساس، گہرے شعور اور اس احساس وشعور کے ہاتھوں پیدا ہونے والے افکار وخیالات کے حسین اظہار میں مضمر ہے۔ جوش صاحب نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی اور اس کے متنوع پہلوؤں کو جس شدتِ احساس اور علوئے فکر کے ساتھ حسین ترین فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کی مثال اردو میں تو کیا، دنیا کی اور زبانوں میں مشکل ہی سے ملے گی۔ جوش صاحب کی شاعری اردو ہی میں اضافہ نہیں، دنیا بھر کے ادب میں ایک اضافہ ہے۔ انسانی زندگی کا کون سا پہلو ہے، جو اس میں موجود نہیں۔ اس میں انسان ہے، اس کی دلچسپیاں ہیں، اس کی آرزوئیں ہیں، اس کی تمنائیں ہیں، اس کی حسرتیں ہیں، اس کی ناکامیاں

ہیں، اس کی کامرانیاں ہیں، غرض وہ سب کچھ موجود ہے جو انسانی زندگی میں ہوتا ہے اور جس کو انسانی زندگی میں ہونا چاہیے۔ جوش صاحب ایسی انسانی زندگی کے شاعر ہیں۔ وہ شاعر انقلاب ضرور ہیں۔ شاعرِ شباب بھی انہیں کہا گیا ہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ ان دونوں سے کہیں زیادہ شاعر حیات کا لقب ان پر پھبتا ہے۔

وہ شاعرِ حیات ہیں کیونکہ انسان ہیں اور انسان ہیں، اس لئے شاعرِ حیات ہیں۔ اسی لئے تو ان کی شخصیت سے قربت حاصل کرنے والے ہر شخص کو ان پر پیار آتا ہے۔!

☆☆☆

محمد علی صدیقی

جوش اور عظمتِ انساں

جوش ناگزیر طور پر جوش تھے جو حضرات جوش کی حمایت میں کچھ اس طرح سوچتے ہیں کہ آخر جوش نے ''نئے خیالات'' کی وکالت میں اس درجہ تند ہی کا مظاہرہ ہی کیوں کیا کہ وہ متنازعہ فیہ شخصیت بن کر رہ گئے۔ وہ جوش کی عظمت کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ اگر جوش اپنے معترضین کے لئے ناپسندیدہ شخصیت تھے تو یہ ایک ایسا اختصاص ہے جس پر جوش فخر کر سکیں گے۔ انسانی فکر کی ترقی ''اقرار'' اور ''انکار'' کی سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ یہ ایک ایسی منزل کی جانب سفر ہے جہاں جوش اپنے معترضین کے لئے بھی ایک گراں قدر اثاثہ بن جاتے ہیں۔ معترضین حضرات اس طرح اپنی صفوں کی زیادہ بہتر ترتیب کے ساتھ ساتھ اپنی فکر پر ''براسو'' پالش کے دو ہاتھ بھی مار سکیں گے۔ کیا حرج ہے اگر تھوڑی سی محنت ان حضرات کے حصے میں بھی آجائے۔ جو اپنے مفروضات کی صدیوں پرانی چھاؤں میں پاؤں پسارے پڑے رہنا چاہتے ہیں۔ جب کہ ان کا ارد گرد اس تیزی کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے کہ وہ چھاؤں بھی بذاتِ خود معرضِ خطر میں ہے۔

جوش نے فرسودہ اقدار کے تار و پود میں جس بے رحمی کے ساتھ دراڑیں ڈالی ہیں وہ اس قدر سنگین نوعیت کی ہیں کہ انھیں پسِ پشت ڈالنا ممکن بھی نہ ہو سکے گا۔ سلیم احمد جیسے روایت پسند

دانشور نے اپنے مضمون ''جوش اور خدا'' میں ان دراڑوں پر کافی دبیز پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم احمد جوش کے معترضین کے لئے ہدفِ ملامت بن چکے ہیں۔ معترضین جوش کم از کم سلیم احمد سے اس قسم کی دریا دلی کی توقع نہ رکھتے تھے کہ وہ اس نازک لمحے میں ''جدید'' ذہن کا ساتھ دے بیٹھیں گے۔ لیکن سلیم احمد بہر حال وحدت الوجودی ہیں۔ جوش ''اقرار'' اور ''انکار'' کی حقیقت سے آشنا تھے۔ لیکن ان کی شاعری میں آخر وہ کون سا عقدہ لاینحل ہے جو حل طلب ہے۔ جوش تجسس پسند تھے۔ سوالات کرتے رہتے تھے۔ اکثر و بیشتر جوابات بھی خود ہی دے لیا کرتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کے معترضین ان کے بارے میں جو حکم چاہیں صادر فرما دیں۔ جوش کا کلام ایک بحرِ ذخار ہے جس میں ہر ''موڈ'' کی ترجمانی موجود ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ جوش کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ یا پھر یہ کہ آپ خود کو جوش کی شاعری کے حوالے کر دیں۔ پھر دیکھئے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے؟ یہاں یہ ضروری ہے کہ جوش کے ذہنی ارتقا اور ان کے دور کے سیاسی اور سماجی ماحول اور ''اقرار'' و ''انکار'' کے پیمانوں میں ہمدردانہ غور و فکر شرط اوّل ہے۔ تاکہ حقیقت کا متلاشی ذہن پہلے سے قائم شدہ مفروضات کی عصبیت کا شکار ہو کر نہ رہ جائے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہو پاتا ہے۔ ہم دوسروں کے کلام اور تحریروں کی راہوں میں اس قدر رکاوٹیں کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں کہ مطالعہ کی ہر کوشش بسا اوقات اپنے تعصبات سے مڈ بھیڑ اور اس کے نتیجے میں انتشار پر ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ چاہیئے، یہ بھی ایک طرح کی آزادی ہے۔ مفروض کو موضوع سمجھ بیٹھنے کی سہل نگاری اگر نارسائی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ مثلاً جوش کے سلسلے میں ایک عام گمراہی یہ ہے کہ ہم ان کی قادر الکلامی میں کیڑے نکالنے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج کے اختصار پسند قاری کے ذہن پر ایک مضمون کو سو سو رنگ میں باندھنے کا مظاہرہ گراں گزرتا ہے اور معترضین یہ حقیقت فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ جوش کی قادر الکلامی ان کا تہذیبی ورثہ ہے۔ جوش اس طرح کلاسکی شعرا کے سامنے خم ٹھوک کر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ آخر جوش صاحب سے ان کی کلاسکی افتادِ طبع کے باوجود ہیئت کے معاملے میں تجدد پرستی کا مطالبہ ہی کیوں کیا جاتا ہے۔ جوش عربی اور فارسی ادب سے دوری یا بیزاری یا لاتعلقی میں سے کسی مجبوری کا شکار نہ تھے۔ کیا موجودہ نسل جوش اور اپنے مابین کسی ایسے میثاق کو بطور ثبوت پیش کر سکتی ہے جس کے رو سے جوش نے مسدس، قصیدہ اور مثنوی جیسے اصناف سے پہلو تہی کا وعدہ کیا ہو۔

جوش بہ اعتبارِ فکر جدید تھے۔ وہ اس حد تک ''جدید'' تھے کہ وہ آج سے سولہ سال قبل کی ایک تحریر میں روایت پسندوں کی عقل دشمنی پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

''صد حیف کہ اپنے ''سروں'' کو معزول کر کے ہم نے اپنے ''کانوں'' کو راہنمائی کا منصب عطا فرمایا ہے۔ عقل کو کہنی مار کر جذبات اور مجذوبیت کو گلے لگایا ہے اور ''کھوپڑی'' پر پاؤں رکھ کر ''چھاتی'' کو ہم نے سروں پر بیٹھا لیا ہے اور اپنی اس روش کے چلتے ان اقوام کے سامنے جو زندگی کے فرق پر تسخیر قوائے کائنات کا تاج رکھنے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ آج ہم جاہلوں، بیماروں، بھوکوں، ننگوں، ٹھگوں اور بھک منگوں کی طرح سر جھکائے کھڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روحِ کائنات ہم سے مایوس ہو چکی ہے اور زندگی نے ہم سے دست برداری کا فیصلہ کرلیا ہے اور بیشک سیاسی مایوسی دست برداری کا نتیجہ ہے کہ ایوانِ حسیات و قصر کائنات کا وہ مضبوط قفل جو صرف تفکر کے لوہے سے پگھل کر کھل سکتا ہے۔ ہم اسے موباف کے تاگوں اور ترکی ٹوپیوں کے پھندے سے کھولنے کی سعی فرما رہے ہیں۔ پس جس نے پہلے نہ سنا ہو وہ اب سن لے کہ جس وقت تک ہم اپنے کو سائنٹفک مزاج کے سانچے میں نہیں ڈھال لیں گے، آگاہی وہ دیدہ وری کے بغض سے توبہ نہیں کرلیں گے ساعت کے میدان میں کبڈی کھیلتے اور عقل کا نام سن کر دولتیاں جھاڑتے رہیں گے۔ اس وقت زندگی ہم سے منہ موڑتی رہے گی۔''

(جنگ کراچی، ۲۲ر جنوری، ۱۹۵۶ء)

جوش کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ آخر وقت تک ثابت قدم رہے اور انسانیت کی ثنا خوانی کرتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ جوش کے کلام میں زوائد (Redundancies) کا وفور ہے۔ آخر ہم اس حقیقت سے کس لئے آنکھیں چرائیں کہ وہ ایک شعری اسلوب کے خاتم تھے اور یہ

''زوائد'' جوش کے شعری اسلوب کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ یہ شعری اسلوب ایک عرصے سے حریت فکر سے تہی دامن تھا۔ جوش نے اس روایت کے دامن میں اپنی روایت کے اس قدر گہرہائے آبدار کا اضافہ کیا کہ انھوں نے ہیئت کی ژولیدگی کا نظریہ فاش فاش کر دیا۔ ہر چند کہ جوش بقول احسان دانش ''اپنی شعری روایت کے ''بڑوں'' میں شمار ہوتے تھے۔'' لیکن انھوں نے بعض جدید ترین شعرا کے مقابلے میں زیادہ 'جدید' رویہ کا مظاہرہ کیا۔ جوش کا خیال تھا کہ وہ اس دنیائے دار و گیر میں قبل از وقت پیدا ہوئے تھے لیکن ان کا ظہور ناگزیر تھا۔ جوش اپنی نظم ''میرا مرثیہ'' میں کہتے ہیں:

مجھے اے ہم نشیں اس زندگی نے
ہنسایا جب تو رونے کو ہنسایا
ارے اس عالمِ تعجیل خو نے
یہاں مجھ کو بہت پہلے بلایا

اور یہ سب کچھ غالباً اس لیے کہ:

جہاں فکرِ جواں اگتی نہیں ہے
مرا اس خاک پر پودا لگایا
میں تھا بھی شاید ایک ایسا معما
کہ یاروں کی سمجھ ہی میں نہ آیا
نفس کی آمد و شد اللہ اللہ
مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا

اس اظہارِ تاسف سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جوش نے جس ''عالمِ تعجیل خو'' کی شکایت کی تھی وہ چنداں درست نہ تھی۔ انھوں نے مقدور بھر اپنا فریضہ انجام دیا۔ ہر چند کہ وہ اپنے زمانے کے شاکی تھے۔

ہم وزن و ہم گہر ہوں جہاں زاغ و عندلیب
اس گلستاں میں مرغِ خوش الحاں ہوئے تو کیا

جس تیرگی میں ہو نہ سکندر نہ روئے خضر
اس تیرگی میں چشمۂ حیواں ہوئے تو کیا

لیکن تاریخ ثابت کرے گی کہ یہ شکایت بے جا تھی۔ جوش جیسے شاعروں کے ساتھ کوئی انہونی بات نہیں ہوئی۔ تاریخ ادب ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

خواہ جوش بہ اعتبار فکر ''سروں'' کی معزولی اور ''کانوں'' کی رہنمائی کے لاکھ مخالف ہوں لیکن وہ اپنی شاعری کا جادو صرف ''سروں'' ہی کے راستے نہیں بلکہ ''کانوں'' کے راستے بھی جگاتے ہیں۔ ''سر'' فکر کی علامت ہے اور ''کان'' روایت کی۔ جوش اس طرح تازہ فکر اور قدیم اسلوب شاعری پر یکساں فریفتہ تھے۔ اس لئے ہم جوش کی شاعری میں زوائد کو موسیقی اور ڈرامے کا روایتی روپ قرار دے سکتے ہیں۔

جوش نے اردو شاعری کو اس درجہ مالا مال کیا ہے کہ وہ زبان کو مالا مال کرنے کے باب میں قلی قطب شاہ نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کی صف میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں جوش اور انگریزی شاعری میں ملٹن کے ساتھ ایک عجیب معاملہ یہ ہے کہ یہ دونوں شعری زبان کے جملہ امکانات کھنگالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جوش زبان پر اپنی بھرپور قدرت سے فائدہ اٹھانا نہ چاہتے ہوں وہ زبان کے طمطراق سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ اپنی فکر کی سچائی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ وہ غزل کی روایت میں طویل فکری نظموں کے لئے راہ ہموار کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سینئر ہمعصر اقبال نے بھی یہی طریقۂ کار اپنایا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جوش کے لئے ان کے بعض جدید ہمعصروں نے وہی سب کچھ کہا جو ایلیٹ اور اس کے ہم نواؤں نے ملٹن کے بارے میں کہا تھا۔ یہی کہ ملٹن کے یہاں زبان کی گھن گرج کے علاوہ اور کیا ہے لیکن جس طرح ایلیٹ مآل کار اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے خیال پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ملٹن کی ''عظمت'' تسلیم کی بعینہ اسی انداز میں جوش کی عظمت کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ بس زوائد کی شکایت پر اکتفا کیا جا رہا ہے لیکن اگر ان زوائد کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے گنجائشیں پیدا کر لی جائیں تو پھر جوش کی عظمت کے اعتراف میں آخری رکاوٹ بھی دور ہو سکے گی۔

افسوس کہ جوش ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کے انیس مجموعہ ہائے کلام ایک

ایسے دور میں ایوانِ اردو کے پُرشکوہ فانوس میں اپنی روشنیاں جلاتے رہیں گے جب ہر جانب ''روشنی، روشنی پکارا اے دل'' کی صدائیں عام ہوتی چلی جارہی ہیں۔

اب میں مختصراً جوش کے شعری سفر کے بارے میں اجمالی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ جوش کی شاعری کے جس وصفِ خاص کی جانب بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی وہ جوش اور فطرت پرستی کا موضوع ہے۔ یوں لگتا ہے کہ نادر کاکوروی اور ان کے قبیل کے فطرت پرستوں نے اردو شاعری کو جس نت نئے مضامین سے روشناس کرانے کی ذمہ داری قبول کی تھی جوش نے اسے انتہا تک پہنچادیا۔ جوش نے یہ منزل عقل وخرد کی روشنی میں طے کی۔ انھوں نے انگریزی زبان کے رومانوی شعراُ کے تتبع میں بیزاری کا وطیرہ اختیار کرنے کی بجائے فطرت کی کتاب فراست سے تغیر اور پیہم تشہیر کا درس لیا۔ یہ انوکھی معاملت، جوش کی فکر کے ہر گوشہ پر حاوی ہے اور اس زاویۂ نگاہ کی مدد سے سیاسی و انقلابی شاعری حتیٰ کہ رومانوی شاعری کا لب ولہجہ بھی زیادہ بامعنی ہوجاتا ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ جب جوش نے اپنے والد بزرگوار کی معیت میں ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں مولانا رضا فرنگی محلی (لکھنؤ) کے مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعر پڑھا۔

اے نسیمِ صبح کے جھونکوں یہ تونے کیا کیا
میرے مستِ خواب کی زلفیں پریشاں ہوگئیں

تو اسی وقت مرزا محمد ہادی رسوا نے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور صفی لکھنوی نے جی بھر کر داد دی تھی۔ روحِ ادب (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) میں شامل نظم ''ترانۂ بیگانگی'' جوش کے ذہن کی اولین کروٹ کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس نظم کے چند سطور ملاحظہ فرمائیے..........

زہر لگتی ہے زمانے کی مجھے آب و ہوا
ظاہری اسباب کو چھوڑے زمانہ ہو گیا
چھوڑ کر انساں کو میں فطرت کا شیدا ہو گیا
خوبیِ قسمت کا فوراً ربط پیدا ہو گیا
میرا ہمدم سبزہ زار ِ کوہ صحرا ہو گیا
دوست میرا چشمہ و گلزار و دریا ہو گیا

لیکن جوش کی فطرت پرستی نے جہاں ان کے ذہن کو رفعت دی وہیں یہ احساس بھی دیا۔

دنیا بڑی وسیع تھی لیکن مرے لئے
آزادئ خیال نے زنداں بنا دیا

رابندر ناتھ ٹیگور نے جوش کی فطرت پرستی اور اس سے فطری استنباط کی خواہش کے اعتراف میں انھیں ''فرزندِ سحر گاہ'' کا خطاب دیا تھا۔ جوش ملیح آبادی کی فطرت پرستی کے اعلیٰ نمونے مرثیوں میں موتیوں کی مانند بکھرے پڑے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوش منظر کشی کے ہنگام بھی عقل و خرد کی گتھیاں سلجھاتے رہتے ہیں۔ اگر جوش کے نقاد فطرت پرستی کے جذبے ہی کو زوائد قرار دینا چاہیں تو وہ آزاد ہیں۔ مثلاً جوش آوازۂ حق (مشمولہ جوش ملیح آبادی کے مرثیے مرتبہ ضمیر اختر نقوی) کے ایک بند میں اس طرح گویا ہوتے ہیں۔

غنچوں کی حیا، گل کی ہنسی، اوس کے گوہر
زرتار شفق، سرد ہوا، باغِ معطر
رنگین ہوا، قوسِ قزح مہرِ منور
نغمے یہ پرندوں کے، پہاڑوں کے یہ منظر
ہے کون سی خوبی جو مہِ نو میں نہیں ہے
کیا باغِ ارم صبح کے پرتو میں نہیں ہے

اب ذرا ''آگ'' کا مندرجہ ذیل بند ملاحظہ فرمایئے........

آگ مطرب کا ترنم آگ تاروں کا گداز
آگ طوفانِ نیاز و چشمۂ تغیانِ ناز
آگ روئے رنگ پرور، آگ چشمِ نیم باز
آگ جوہر کی حیا پرور توانائی کا راز
یہ نگارِ برق وش، ہر سوز میں، ہر ساز میں
گرمیٔ انفاس میں ہے، شعلۂ آواز میں

(آگ، ۱۹۵۹ء)

کیا یہ ایسی شاعری کی مثالیں نہیں ہیں جن میں لمحہ موجود کا اثبات اور جوہرِ توانائی کے علم کے ساتھ رشتہ موانست استوار نہیں کیا جارہا ہے۔ کیا جوش کا روایتی اسلوب اور مسدس کے فارم عقل و خرد کی ہمہ دم ضوفشانی کے اعتراف سے عاجز ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر جوش کی اہمیت کا تعین اس بنیاد پر بھی ہو سکے گا کہ انھوں نے بڑے نامساعد حالات میں بھی عقل پرستی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ۔ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنی فکر کے لاکھوں چراغ روشن کر چکے تھے۔ بڑے فنکار کا مقدر ہی یہ ہے کہ وہ اپنے شبہ پاروں میں موجود رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے انگنت چاہنے والوں میں نسل در نسل ایک غیر مرئی وجود کی مانند زندہ رہے۔ جوش کے بارے میں زوائد تضادات اور اغلاط کی بحثیں چھیڑنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اس قد کے ادیب کے خلاف کہنے کے لئے اب اسی قسم کی باتیں رہ گئی ہیں۔ رومی، حلاج، غالب اور اقبال کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا گیا تھا لیکن یہ حضرات اپنے معترضین کے اعتراضات کی وجہ سے یاد نہیں رکھے جاتے بلکہ اپنے تاریخی اثرات کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں لیکن میں جوش کے سلسلے میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ جوش کی تمام تر وکالت کے باوجود یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ان کے کلام میں بعض توجہ طلب مراحل آتے ہیں۔ مثلاً جوش جیسے شاعر سے نطشے جیسے مفکر سے ارادت مندی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ نطشے ہر اس مظہر سے جسے ''عوامی'' قرار دیا جاسکتا ہو یک گونا بیر رکھتا تھا اور اسے حسن، خیر اور عدل کے حق میں سمِ قاتل سمجھتا تھا۔ کیا جوش واقعتاً نطشے پر اس بنیاد پر لہلوٹ تھے کہ وہ ''اشرافیہ'' کی بالادستی کا قائل تھا اور جوش بھی ''یادوں کی بارات'' میں جاگیرداری کے خاتمے پر ملول و مضطرب نظر آتے ہیں۔ یہ امر واقعتاً حیرانی کا باعث ہے کہ جوش کے ذہن پر ''سنبل و سلاسل'' ۱۹۴۷ء'' کی اشاعت تک نطشے کے لئے اس قدر خیر سگالی بلکہ مرعوبیت کا جذبہ سوار تھا کہ انھوں نے اس مجموعے کو ''امیر فکر و تخیل نطشے اعظم کے نام'' معنون کیا تھا۔ اس زمانے میں بسم اللہ کی جگہ ''بنام قوت و حیات'' لکھنے لگے تھے۔ اقبال بھی نطشے سے مرعوب ہیں۔ یہ پہلو تکلیف دہ ضرور ہے لیکن جوش کے معترضین جن کی اکثریت نطشے کے افکار سے بیحد متاثر ہے، جوش سے اس بنا پر بھی خوش نہیں ہو سکتے یہ حضرات جانتے ہیں کہ جوش عملاً نطشے کی فکر سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ نطشے خردافروزی کی روایت کے خلاف تھے اور جوش نے تمام عمر خردافروزی پر زور دیا ہے۔ جوش ''عظمتِ انساں'' میں کہتے ہیں.......

مرغ زار و چمن و وادیٔ و کوہ و صحرا
سبزہ و شبنم و ریحان و گل و سرو صبا
ذرہ و اختر و مہر و مہ دشت و دریا
سب یہ گونگے ہیں اٹھائے ازلی سناٹا
گردِ ارض و سما کھول رہا ہے انساں
اس خموشی میں فقط بول رہا ہے انساں

جوش کا تصورِ خداوندی اور انساں بھی کارخانۂ فطرت ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ ''عظمتِ انساں'' ہی کے ایک بند پر اس مضمون کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ بند جوش کے عقائد کے بارے میں سب سے واضح بیان کا درجہ رکھتا ہے۔

ذہن جس وقت کہ ہو جائے گا انساں آگاہ
تو نکل آئے گا خود پردۂ انساں سے الٰہ
وحدتِ انفس و آفاق کو پالے گی نگاہ
اور شریعت یہ کہے گی کہ تفکر ہے گناہ
شور ہوگا نہ رہے کوئی وفا کا دشمن
بیشک انسان کا دشمن ہے خدا کا دشمن

(۱۹۸۲ء)

☆☆☆

نامی انصاری

جوش یا فیض!

آج کل ہندوستان کے بعض ادبی حلقوں میں اس نکتے پر کافی زور دیا جارہا ہے کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر جوش ہیں۔اس کے موئدین میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر خلیق انجم، رفعت سروش اور سید عاشور کاظمی پیش پیش ہیں۔ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ'' میں، حرف آغاز ہی میں لکھ دیا ہے کہ ''اردو کے عظیم شاعروں کی فہرست میں صرف چار نام آتے ہیں۔میرؔ، غالبؔ، انیس اور اقبال۔اس کے بعد دوسری فہرست بڑے شاعروں کی ہے۔اس فہرست میں سب سے پہلا نام، جوش ملیح آبادی کا ہے۔اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے بعد دوسرے بڑے شاعر جوش ہیں۔''

کچھ اور قلم کاروں کا یہی نظریہ ہے لیکن اب تک شاید اس پر غور نہیں کیا گیا ہے کہ بڑی شاعری کیا ہے اور جوش کی شاعری میں وہ کون سی صفات ہیں جن کی بنا پر ان کو اقبال کے بعد کا سب سے بڑا شاعر مان لیا جائے۔

جہاں تک بڑی شاعری کے خدوخال متعین کرنے کا سوال ہے تو یہ ایک پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے تاہم مجموعی طور سے کچھ ایسی محکم صفات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو دنیا کی تمام زبانوں میں

اور خاص کر اردو و فارسی شاعری میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں کے تناظر میں جوش کی شاعری کے اقدار پر غور کرنا بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ اس صدی میں کم از کم ۱۹۵۵ء تک جوش، اردو شاعری کے افق پر سب سے زیادہ چمک دمک بلکہ دھمک اور ہنک والے شاعر بنے رہے اور اگر بیسویں صدی ۱۹۵۵ء ہی میں منجمد ہوگئی ہوتی تو شاید جوش کو اقبال کے بعد کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کر لینے میں مطلق تکلف نہ ہوتا لیکن اس صدی کے نصف دوم میں اردو ادب و شاعری میں جو انقلابی تبدیلیاں آئیں، رجحانات بدلے، فکر و نظر کے نئے زاویے قائم ہوئے، اعلام و رموز کی نئی جہتیں بروئے کار آئیں، اس کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہنا سخت مشکل ہوگا کہ اقبال کے بعد جوش ہی اس صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے۔

جوش کے عہد آفریں یا بڑے شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ ان کی شاعرانہ توانائی اور قدرتِ کلام سے ان کے مخالفین بھی انکار نہیں کر سکے۔ الفاظ اور تراکیب کا جیسا اور جتنا بڑا ذخیرہ جوش کے پاس تھا وہ نظیر اور انیس کو چھوڑ کر کسی دیگر شاعر کے پاس نہیں تھا اور وہ اس ذخیرے کو جس طرح چاہتے تھے، حاکمانہ قدرت کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے، لفظوں کے مینا بازار سجا سکتے تھے، سامعین کو حیرت زدہ بلکہ دہشت زدہ کر سکتے تھے، رومانی اور جمالیاتی شاعری سے داد و دہش کا انبار بٹور سکتے تھے مگر وہ جو شاعری کی اعلا ترین صفات ہوتی ہیں اور جو جمالیاتی حصولِ حظ کے ساتھ ساتھ کچھ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہیں، جن میں گہری معنویت اور تہہ داری ہوتی ہے اور جن کا اثر مدھم مگر دیرپا ہوتا ہے، ان صفات کا جوش کے یہاں بہت کم سراغ ملتا ہے۔

اس بات کو ایک دوسرے زاویۂ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سترھویں صدی میں وَلی دکنی سب سے زیادہ اہم شاعر بن کر ابھرتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے سب سے بڑے شاعر میر تقی میرؔ، انیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر غالبؔ اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبالؔ تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی شاعرانہ اور تخلیقی صفات ہیں جو ان چاروں شاعروں کو اپنی اپنی صدی کا سب سے عظیم شاعر بناتی ہیں۔ ان میں اگر کوئی قدرِ مشترک ہے تو وہ ان کی انسان دوستی، عام آدمیوں کے دکھ درد کا ادراک، اور انسانی زندگی کے جلال و جمال کی باز آفرینی ہے۔ یہ عناصر اوپری سطح پر چاہے کم نمایاں ہوں لیکن ان کی شاعری کے رگ و ریشے میں خون کی طرح دوڑتے نظر

آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابِ زمانہ کی گرد بھی ان کی شاعری پر اثر انداز نہ ہو سکی اور یہ شاعری آج بھی اتنی ہی سدا بہار اور دلکش ہے جتنی ان کے زمانے میں تھی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی آب وتاب اور زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ غور کیجئے تو تقریباً یہی عناصر فیضؔ کی شاعری میں بھی پیوست ہیں۔ ان کا دھیما انداز، انسانی دردمندی، مظلوموں کی حمایت، ایک خوشگوار مستقبل کی آرزو، عصرِ حاضر کے ظلم وجبر کے خلاف پرقوت احتجاج، دل میں ترازو ہو جانے والے ہلکے ہلکے نشتر، شاعری کا مستحکم جمالیاتی نظام، تہہ داری اور معنویت، ان کو میرؔ و غالبؔ دونوں سے قریب کر دیتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری گرماتی نہیں ہے، جوش وخروش نہیں پیدا کرتی، ذہن ودل کو صدمہ نہیں پہنچاتی، بلکہ ایک سچے رفیق اور دمساز کی طرح ہمارے فکری اور جمالیاتی احساسات کو متاثر کرتی ہے، تقویت پہنچاتی ہے اور فکر وخیال کو مہمیز کرتی ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بالکل ممکن ہے کہ بیسویں صدی میں اقبالؔ کے بعد، سب سے بڑے شاعر ہونے کا تاج اگر کسی کے سر پر بجتا ہے تو وہ شاعر فیض احمد فیضؔ ہیں نہ کہ جوشؔ ملیح آبادی۔ کچھ لوگ میرا جی یا ن۔م۔ راشدؔ کو فیضؔ سے بڑا شاعر قرار دینے پر مُصر ہیں لیکن یہ دراصل بر بنائے عقیدت ہے نہ کہ بر بنائے حقیقت۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑائی کا یہ ستارۂ امتیاز، پانچ دریاؤں کی زرخیز سرزمین کے حصے میں آیا ہے مگر یہ اُردو زبان کی زمینی وسعت کا ایک روشن استعارہ بھی ہے۔

جوشؔ کو شاعرِ انقلاب اور شاعرِ شباب بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ انھوں نے سب سے زیادہ انقلاب کے نعرے لگائے ہیں۔ شکستِ زنداں کا خواب، بغاوت، انقلاب، غدّار سے خطاب، بھوکا ہندوستان، مردِ انقلاب کی آواز، وفادارانِ ازلی کا پیام شہنشاہِ ہندوستان کے نام، ترانۂ آزادیٔ وطن، دعوتِ انقلاب جیسی پرشور نظموں کی گونج کسی زمانے میں پورے ہندوستان میں سنائی دیتی تھی جن میں ان کا خطابیہ لہجہ اور بلند آہنگ سننے والوں کو جوش وخروش سے بھر دیتا تھا۔ اس زمانے کے سیاسی ماحول میں اس بلند آہنگی کی ضرورت بھی تھی لیکن اب یہ نظمیں ازکار رفتہ معلوم ہوتی ہیں اور محض تاریخ کے ایک حصے کی خانہ پُری کرتی ہیں۔ شاعرِ شباب وہ اس لئے ہیں کہ حسن وجوانی کے بارے میں ان کی نظموں کی دلکشی اور رعنائی، نوجوان دلوں کی دھڑکن اور پختہ عمر کے لوگوں کے لئے جمالیاتی حظ کا وسیلہ بن جاتی تھی۔ فتنۂ خانقاہ، الھڑ کامنی، حسنِ مخمور، روپ متی، یہ کون اٹھا ہے شرماتا، یار پری چہرہ

اور سب سے بڑھ کر ان کی طویل نظم "کیا گلبدنی، گلبدنی، گلبدنی ہے" نہ صرف جوش کی بے مثل قادر الکلامی اور اُن کی بے پناہ قوتِ بیان کا اشاریہ ہے بلکہ اس میں حظ و کیف کا ایسا عالم بھی ہے جو انسان کو بیخود کر سکتا ہے۔ مثال کیلئے اس نظم کا صرف ایک بند ہی کافی ہے:۔

اٹھا ہے سرِ بامِ حرم، دیر کا طوفاں
پھر رقص میں ہے وہ صنم فتنۂ دوراں
غزنی میں پکار آؤ کہ پھر کفر ہے جولاں
مو باف کے لچھے میں لپیٹے ہوئے ایماں
اب آئے جسے حوصلۂ بُت شکنی ہے
کیا گلبدنی، گلبدنی، گلبدنی ہے

مو باف کے لچھے میں ایمان کے لپٹے ہونے کا منظر صرف جوش ہی دکھا سکتے تھے کیونکہ وہ جس جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ تھے، اس میں ان کا باریک مشاہدہ، حسن پرستی کا فطری رجحان اور پُر جوش تخیل، اس قبیل کے محاکاتی اور جمالیاتی مصرعوں کی تخلیق بلا تکلف کر سکتا تھا۔ نازک اور لطیف تشبیہات کا ایک سیلِ رواں ہے جو پوری نظم پر اپنا پرتو ڈال رہا ہے لیکن تیرہ بندوں پر مشتمل اس طویل نظم میں ابھرے جمالیاتی کیف، تشبیہ سازی اور قدرتِ کلام کے سوا اور کیا ہے جسے یاد رکھا جا سکے۔ اس کے مقابلے میں فیض کی نظم "تمہارے حسن کے نام" گہرے جمالیاتی احساس کے ساتھ ساتھ دردمندی اور دل سوزی کی ایسی فضا بھی تخلیق کرتی ہے، جس کا اثر دیرپا اور جس کا اُپروچ آفاقی ہے۔

تمہارے ہات پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلدارئ عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخئ ایام

''گلبدنی'' کے تیرہ بندوں سے وہ کیف اور تاثر نہیں پیدا ہوتا جو فیض کی، دو بندوں کی، اس مختصر نظم سے از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جوش نے صرف گلبدنی کی اکہری تعریف پر اکتفا کیا ہے جبکہ فیض نے محض چند مصرعوں میں محبوب کے حسن کا بکھان کر کے، اس کو تلخی ایام کے شیریں بنانے کے عمل سے بھی جوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے اس نظم میں وحدتِ تاثر کے ساتھ ساتھ، زمانے سے نباہ کرنے کے عمل کا ایک خوشگوار پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے اور اس کی معنویت زیادہ گہری اور اس کی فضا زیادہ تابناک ہو گئی ہے۔ جوش اکہرے تخیل کے شاعر ہیں اور قدرتِ کلام کے باوجود ان کی نظموں میں لمبائی تو ہوتی ہے مگر دبازت بہت کم یا بالکل نہیں ہوتی۔ فیض مختصر ترین الفاظ میں نظم کہتے ہیں مگر اس میں شدّت تاثر، معنویت اور گہرائی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

جوش اور فیض تقریباً ہمعصر تھے اور دونوں کو اپنی شاعرانہ تگ و دو کے لئے ایک ہی زمانہ ملا تھا اور ایک ہی سیاسی اور سماجی پس منظر میں دونوں نے اپنی تخلیقیت کا اظہار کیا ہے، اس لئے دونوں کے شاعرانہ سروکار کا تقابل بے محل نہیں ہے جبکہ جوش اور فراق یا جوش اور مجاز کا مقابلہ کرنا بے محل بھی ہے اور غیر حقیقی بھی ہے۔

جوش کی پوری شخصیت اور شاعری کو اگر مختصر ترین الفاظ کے کیپسول میں بند کرنا ہو تو صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ وہ جاگیردارانہ مزاج اور ماحول کے اکمل ترین تہذیبی نمائندے تھے۔ ایک طرف انانیت، خودسری، خودپسندی، بغاوت طنطنہ اور دوسری طرف عورت اور فطرت سے گہری دلچسپی ان کی شخصیت اور شاعری کے ترکیبی عناصر تھے جسے آپ شعلہ و شبنم، سموم و صبا اور جنون و حکمت سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ اسی جاگیرداری طنطنے اور باغیانہ کردار نے ان کے اندر مصلحت اور موقع شناسی کے زمینی عناصر کو پنپنے نہیں دیا۔ غلط موقعوں پر صحیح بات کہنا اور اپنے اندرونی جذبات کو بے محابا زبان پر لے آنا، ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی جس نے ان کی ذاتی زندگی میں تلخ کامیوں کا زہر گھول دیا اور اس سے وہ تا دمِ آخر نجات نہ پا سکے۔ ہندوستان میں انھوں نے ٹیگور، اقبال، ابوالکلام آزاد کو تنقید کا نشانہ بنایا اور پاکستان میں ایوب خاں اور اسکندر مرزا جیسے ڈکٹیٹروں کو بھی نہیں بخشا۔ اب کوئی اس کو ان کی مردانگی کہے یا بھولا پن کہ جو دل میں وہی زبان پر، لیکن زمانہ اور سماج اس

جسارت کو کبھی معاف نہیں کرتا اور نتیجہ وہی ہوا، جو ہونا چاہئے تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ جوش نے خاندان، حکومت یا خدا سے چاہے جتنی بغاوت کی ہو لیکن انھوں نے جاگیردارانہ نظام کے اس اسٹرکچر سے کبھی بغاوت نہیں کی جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی۔ طبقۂ اشراف کا جاگیردارانہ تصور ہمیشہ ان کی زندگی اور شاعری کا خاصہ بنا رہا۔ کمزوروں اور مظلوموں کے دُکھ درد سے ان کو کبھی کوئی نسبت نہیں رہی، نہ ذاتی سطح پر، نہ اجتماعی یا تصوراتی سطح پر۔ ان کی حسن وشباب سے متعلق نظمیں ہوں یا مظاہر فطرت کی مصوری، فکر وحکمت کی رباعیات ہوں یا طنزیہ شاعری، دبے کچلے لوگوں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ ان کی جاگیرداریت، عوام الناس کی فلاح کے بارے میں سوچ سکتی تھی اور نہ اس کی متحمل ہوسکتی تھی۔ مزدور عورتوں اور کسانوں کے بارے میں انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ سب ان کے رومانی تصورات کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں گہری انسانی ہمدردی کے جذبے کا سراغ کہیں دور دور تک نہیں ملتا۔ جوش کے مقابلے میں فیض کے یہاں ایسے مقاماتِ آہ وفغاں کی بہتات ہے جہاں شاعر کا دل، مظلوموں کی آوازِ شکستِ دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتا ہے اور اپنی نرم ولطیف وخوشگوار آواز میں ان کے زخموں پر ہمدردی کا مرہم رکھتا ہے۔

سیاسی لیڈر کے نام، مرے ہمدم مرے دوست، اے دلِ بیتاب ٹھہر، شورشِ بربط ونے، ترانہ، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، سوچ، ملاقات، دریچہ، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور اس قبیل کی متعدد نظموں میں غمخواری اور گہری انسانی ہمدردی کی موجِ تہہ نشیں نے فیض کی شاعری میں ایسا رنگ وآہنگ بھر دیا ہے جو محض تاریخ کے صفحات کی زینت بن کر نہیں رہ جائے گا بلکہ غالبؔ کی شاعری کی طرح، آئندہ زمانوں میں بھی چراغ راہ ثابت ہوگا۔

میرؔ وغالبؔ کی شاعری میں جو انسانی سروکار ہے، جو حیات بخش عناصر ہیں اور جو آج کے انسان اور آج کے دور سے مکالمہ کرتے ہیں، وہی عناصر دوسری صورتوں میں فیض کے یہاں بھی موجود ہیں جو آئندہ صدیوں کے انسان سے بھی مکالمہ کرتے رہیں گے لیکن جوش کی شاعری میں بنی نوع انسان سے دور تک مکالمہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہے اسی لئے وہ بہت اہم اور بہت پُرقوت شاعری ہوتے ہوئے بھی بہت پائدار اور دوررس نظر نہیں آتی۔ ن۔ م۔ راشد اور میراجی کی شاعری بہ حیثیت شاعر بتوانا اور طاقتور ضرور ہے مگر اس کے اثرات محدود ہیں اور یہ نقادوں اور دانشوروں کے

احاطۂ فکر ونظر سے آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ عام انسان سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اس کے عوامی سروکار کی حیثیت معدوم ہے۔ اس لئے اس کا حاصل بھی معلوم ہے۔ فکر اور تخیل جب تک جذبہ نہ بن جائے، شاعری میں آب وتاب مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ بقول پروفیسر مسعود حسین خاں:

> ''اعلیٰ شاعری نقالی ہے اور نہ تخیل کی کشیدہ کاری۔ یہ حرف وصوت میں رقصِ حیات ہے۔ اس رقص میں نقل اور اصل، سرخوشی اور فنی خم وپیچ سب کا اپنا اپنا مقام ہے، لیکن اس میں تحریک، یقیناً حیات کی برقی رووں سے آتی ہے۔ جن سے سرشتِ انسانی عبارت ہے، وہی جانِ شاعری ہیں، باقی چیزیں اضافی اور آرائشی ہیں۔''

(جوشؔ ملیح آبادی۔تنقیدی جائزہ۔صفحہ۔۳۴)

جوش جس آزادی کے لئے برسوں اپنی پرُشکوہ شاعری سے دیش واسیوں کے دلوں کو گرماتے رہے، جب وہ حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کی حیثیت ''داغ داغ اجالا'' اور ''شب گزیدہ سحر'' سے کچھ زیادہ نہیں۔ جوش کو فطری طور سے اس ادھوری آزادی سے صدمہ پہنچا اور انھوں نے ''ماتم آزادی'' کے نام سے ۴۴ بندوں اور ۱۳۲ شعروں پر مشتمل اس کا مرثیہ لکھا جس میں حاصل شدہ آزادی کے بارے میں اپنے ردِعمل کا کھل کر اظہار کیا اور حاصل کا افسوس اور بے حاصلی کا ماتم کیا۔

جب باغبانِ قوم ظفر مند ہوگیا
ہر برگِ نرم، خاک کا پیوند ہوگیا
عاشق جو وصل سے خرسند ہوگیا
فالج گرا دماغ پہ، دل بند ہوگیا
اُترا بخار، عقل کو طاعون ہوگیا
پیدا ہوا لہو تو جگر خون ہوگیا

سروِ سہی نہ ساز، نہ سُنبل، نہ سبزہ زار
بلبل، نہ باغباں، نہ بہاراں، نہ برگ و بار
جیحوں، نہ جامِ جم، نہ جوانی، نہ جوئبار

گلشن، نہ گلبدن ، نہ گلابی، نہ گل غدا
اب بوئے گل، نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

باوجوداس حقیقت کے، کہ اس بند کا آخری مصرعہ "وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ" ضرب المثل بن گیا ہے، پوری نظم اپنی طویل القامتی کے باوصف، فیض کی چار بندوں اور کل ۲۷ اشعار پر مشتمل نظم "صبح آزادی" کے مقابلے میں کافی کمزور معلوم ہوتی ہے۔ فیض کہتے ہیں ؎

جگر کی آگ ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کدھر سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدۂ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض کی نظم ایجاز، اختصار اور ارتکاز کا خوبصورت نمونہ ہے جبکہ جوش کی شاعری کو ان چیزوں سے اتنی بھی نسبت نہیں جتنی کہ کعبہ کو بتوں سے ہے۔ ایک بات کو سو ڈھنگ سے کہنے پر قادر ہونا، شاعر کی مشاقی اور قدرتِ کلام کی دلیل تو ہے مگر یہ بڑی شاعری نہیں، کہ بڑی شاعری لفظوں کا اعجاز دکھاتی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی نمائش نہیں لگاتی۔ میر انیس ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن وہ مترادفات کا بازار نہیں سجاتے اور نہ کسی سطح پر لفظ و معنی کی معجزہ نمائی سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ جوش کی قادر الکلامی ہی دراصل ان کی خوبی بھی ہے اور یہی ان کی کمزوری بھی ہے کہ اس کی وجہ سے خیال کا ارتکاز نہیں ہونے پاتا اور وہ سیلِ الفاظ ہی کو تخلیقیت کی اصل جولاں گاہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ فیض کی شاعری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ خیال کی مرکزیت پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں، تفصیل کے بجائے لفظوں کے اعجاز سے سروکار رکھتے ہیں اور لفظ و معنی کے رشتوں کے استحکام پر اپنی پوری تخلیقی توانائی کھپا دیتے ہیں۔

بلا شبہ جوش اس عہد کے ایک بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کے دامن کو وسعت دی ہے۔ اس کو طرزِ ادا کی نئی سمتوں سے روشناس کرایا ہے۔ مردانہ اور باغیانہ لہجہ دیا ہے، اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ سے شاعری میں کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی رباعیات کا تو ہمعصر اردو شاعری میں جواب ہی نہیں ہے۔ فراق، رواں، جاں نثار اختر، سب کی رباعیات اپنی جگہ خوبصورت اور مستحکم ہونے کے باوصف، جوش کی رُباعیات کے مقابلے میں کمتر ٹھہرتی ہیں۔

یاں چمپئی دھوپ ہے گلابی سایہ
رہتا ہے سحابِ ابد‌‌یت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے عالمِ ارواح
آیا ! یارانِ رفتہ، آیا آیا!

ہر بات میں تیغِ خوں چکاں ہے یارب
ہر پاؤں میں زنجیرِ گراں ہے یارب
مذہب کی برادری سے دل تنگ ہوں میں
انساں کی برادری کہاں ہے یارب

جوشؔ نے شاعری کا ایک نیا انداز ایجاد کیا جس کے موجد و خاتم وہ خود ہی تھے لیکن ان کو بیسویں صدی میں اقبال کے بعد کا سب سے بڑا شاعر کہنا، قرینِ حقیقت نہیں معلوم ہوتا۔ ذاتی پسند کی بات اور ہے، اور یہ نقد و نظر سے پرے کی چیز ہے۔

☆☆☆

عزیزہ بانو

جوشؔ بحیثیت اشتراکی وانقلابی شاعر

حالیؔ، اکبرؔ، چکبستؔ، اقبالؔ وغیرہ نے بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک اردو شاعری میں اشتراکی انقلابیت اور سماجی بیداری کی جو روح پھونکی۔ ممکن ہی نہ تھا کہ بعد کے شعراء ان اثرات سے اپنے کو بچا پاتے۔ دوسری طرف ملکی اور غیر ملکی حالات بھی انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرر ہے تھے۔ ان شاعروں کے کارناموں سے پوری اردو شاعری میں انقلاب واشتراک کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ سبھی شعراء اپنی اپنی بساط کے مطابق شاعری کرتے رہے۔ جوشؔ ان شعراء کے بعد ایک نمایاں و ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

"کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوشؔ فطری طور پر باغی تھے۔ وہ کسی بھی سرمایہ دارانہ نظام سے مطمئن نہ رہ سکے۔ انگریزی حکومت کے خلاف نظمیں کہیں۔ وہ ہمیشہ آزادی کے خواب دیکھتے رہے لیکن ہندوستان آزاد ہوتے کے بعد "ماتم آزادی" کے عنوان سے ایک نہایت سخت نظم لکھی۔ اس نظم کا لب ولباب یہ تھا کہ جس حسین اور خوبصورت آزادی کا خواب دیکھا تھا افسوس کہ اس کی تعبیر بہت خراب نکلی چنانچہ افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"دولت ملی تو اور بھی نادار ہو گئے
صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہو گئے

اترا جو بار اور گراں بار ہو گئے
آزاد یوں ہوئے کہ گرفتار ہو گئے
پگھلا جو آسماں تو زمیں تنگ ہو گئی
"یوں پو پھٹی کہ صبح چمن دنگ ہو گئی"

برطانوی سامراج، پیمانِ محکم، غلاموں سے خطاب، حسن اور مزدوری آثار انقلاب، زوال جہانبانی، بغاوت شکستِ زنداں کا خواب اور وطن جیسی معرکہ آرا انقلابی نظمیں لکھیں۔

جوشؔ کی وہ نظمیں جو وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہیں۔ان نظموں میں حکومت کے خلاف نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا ہے۔ جوشؔ نے براہ راست انگریزی حکومت اور برطانوی استبداد پر حملہ کیا ہے۔ جوشؔ نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے عوامی پہلوؤں پر اپنی مشہور نظم شکستِ زنداں کا خواب میں روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے انگریزی حکومت کے جبر سے پیدا ہوائے ہیجان اور انتشار کو پیش کیا ہے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آکے یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم کی بجلی، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

نظم وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستاں کے نام بھی جوشؔ کے بڑھتے ہوئے جذبۂ انتقام اور نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ حکومت برطانیہ کے خلاف نفرت ہندوستان کے تقریباً ہر باشندے کے دل میں موجود تھی۔ اس نظم میں نہ صرف حکومت برطانیہ پر طنز ہے بلکہ برطانوی استبداد کے خلاف شدید نفرت کا احساس بھی موجود ہے۔ شاعر نے تخیل میں ایسے باوفا غلاموں کی تخلیق کی ہے جو بغاوت پر آمادہ ہیں اور حکومت وقت کا تختہ الٹ دینا چاہتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر محکوموں کی زبانی شہنشاہ ہندوستان کو باخبر کرتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب بادشاہی کا چراغ گل ہوتا ہوا نظر آئے

گا۔ کیونکہ وہ غلام اور مزدور جن کو تم نے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اب ان کے اندر بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے اور ان لوگوں کے ارادے خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں ان کا ارادہ مانند سیلاب کے ہے جو اب روکنے سے نہیں رکے گا۔

ہم سے باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات
صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات
ہم تو موسیٰ بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے
پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرّے ذرّے سے عیاں آثار حرب و جنگ ہیں
کشور ہندوستاں میں رات کو ہنگام خواب
کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب
ہم وفا داران پیشیں، ہم غلامان کہن
قبر جن کی کھد چکی، تیار ہے جن کا کفن
تندرو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی امنگوں کو دبا سکتے نہیں
چونکئے جلدی ہوائے تندو گرم آنے کو ہے
ذرّہ ذرّہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

جوشؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے جس وقت شاعری شروع کی وہ ۱۹۱۹ء کے آگے کا زمانہ ہے جب پہلی عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ جنگ کے جو نتائج ملک اور عوام کو بھگتنے پڑتے ہیں اسی کیفیت سے ہندوستان بھی دو چار تھا۔ پورے ہندوستان میں افراتفری کا عالم تھا۔ جوشؔ بھی اپنے اردگرد کے ماحول کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نتیجہ ان کی شاعری بھی اپنے گردو پیش کے سیاسی و قومی ماحول سے متاثر ہوئی۔ ملک کی ابتر حالت، عوام کی زندگی، ادنیٰ اور گرے ہوئے طبقے کی بدتر حالت ان کے اندر جذبات کا ایک طوفان برپا کر رہی تھی۔ اس

لئے انہوں نے اپنے امنڈتے ہوئے جذبات واحساسات کی ترجمانی مختلف انداز میں کی اور اس میں بغاوت کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔

اقبآل اور چکبست کے زمانہ میں ہندوستان کی سیاست اتنی پر زور اور بے باک نہیں تھی جتنی جوش کی شاعری کے عروج کے زمانہ میں ہوگئی تھی۔ جوش کے وقت میں عوام میں جذبات کا ایک طوفان اُمڈ آیا تھا۔ لوگ جذبات کو کام میں لا کر تیزی سے آزادی کی جنگ میں عملی طور پر حصہ لے رہے تھے۔ جوش نے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جس کی اس وقت لوگوں کو سخت ضرورت تھی۔ ایسے میں جوش کی آواز جنگی نقارے کی صدا ثابت ہوئی۔

جوش اپنی شاعری کے لئے موضوعات کا انتخاب زندگی کی متحرک چیزوں سے کرتے ہیں۔ جوش کی شاعری میں جوش وخروش اور ایک غیر معمولی ہمت اور مردانگی ہے۔ اور اسی سے ان کی شاعری بھی جاندار ہے۔ ''بغاوت، سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
الاماں و الحذر میری کڑک میرا جلال
خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
آندھیوں سے میری اڑ جاتا ہے دنیا کا نظام
رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام

شکست زنداں کا خواب سے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
سنبھلو کی وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں ، دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

جوش نے اپنی شاعری کے ذریعے سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور اہل وطن کو ثابت قدم رہنے پر آمادہ کیا۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی

آزادی کے خواہشمند ہیں بلکہ ان کے ذہن میں جدید نظام کا ایک تصور بھی ہے۔

کھیل ہاں اے نوع انساں ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بجولا ہے تو کیا
چل چکی ہے پیشوائی کو نسیم باغ صبح
آج یوسف مبتلائے چاہ کنعاں ہے تو کیا

جوشؔ کی نگاہیں ان بے راہ رویوں اور بد عنوانیوں کو دیکھ لیتی ہیں جس سے ملک و قوم کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے وہ چیخ اٹھتے ہیں۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور

''وہ سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں، کسانوں کی زبوں حالی، غداروں کی سیاست، نازک اندامان کالج کی نسائیت، نصرانیت کی طرف اقدام مولویوں کی ریاکاری، معاشرت میں روپئے کی کارفرمائی برداشت نہ کر سکے اور چیخ اٹھے۔ شدت جذبات کی وجہ سے ان کی آواز میں کرختگی آ گئی۔ غم و غصہ نے الفاظ کو آتشیں لاوا بنا دیا۔[1]

[1] نئے اور پرانے چراغ پروفیسر آل احمد سرور ۳۲

جوشؔ نے مزدوروں کے گیت بھی گائے ہیں اور ایک نئی دنیا بسانے کا خواب بھی دیکھا ہے۔ مزدوروں محنت کشوں، کسان اور غلام ہندوستان میں بسنے والے سبھی لوگوں کی غیرت اور جرائت کو للکارا ہے۔ سماجی پستی جور و ستم، ظلم اور جبر و تشدد کے خلاف اظہار وہ اس بے باکی سے کرتے ہیں کہ ان کے سامنے قصر شاہی اور جلال شاہی کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں۔ جبر و استبداد کی گردن پر ان کا قلم مانند شمشیر کے چلتا ہے۔ وہ کاشتکاروں کو صحیح معنوں میں ارتقاء کا پیشوا اور تہذیب کا پروردگار مانتے ہیں۔ کیونکہ کاشتکاروں کے بل پر ہی تہذیب و تمدن کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی ایک نظم کسان ہے جو حقیقت میں کسان کا قصیدہ ہے۔

ناظر گل پاسبان رنگ و بو گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
سرنگوں رہتی ہیں جن سے قوتیں تخریب کی

جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن انسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرور شہر یار

نظم کسان کے آخری حصہ میں انھوں نے سرمایہ داری پر کاری ضرب لگائی ہے اور کاشتکاروں کی غربت و افلاس کا واحد ذمہ دار سرمایہ داروں کو ٹھہرایا ہے کیونکہ انہیں چند بڑے لوگوں نے نظام کو درہم برہم اور معیشت کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ وہ سرمایہ داروں کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب میں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بے تاب ہیں

خواب غفلت سے لوگوں کو بیدار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آیا وہ انقلاب آیا جاگو
فرمان شکست خواب آیا جاگو
اے ہند کے بد نصیب سونے والو
سر پر وہ آفتاب آیا جاگو

انقلابی شاعر کا دوسرا نظریہ اشتراکی حقیقت نگاری ہے۔ جوشؔ کی شاعری میں ہمیں سوشلسٹ رجحان بھی مل جاتے ہیں۔ اشتراکیت کی جھلک کلام سے ملاحظہ ہو

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ وخشت سے چنگ و رباب پیدا کر
جلال آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے

تواب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

سوشلزم کی جھلک جوش کی اس رباعی میں بھی دیکھی جا سکتی ہے

"زردار کا خنّاس نہیں جاتا
ہر آن کا وسواس نہیں جاتا
ہوتا ہے جو شدت ہوس پر مبنی
تا عمر وہ افلاس نہیں جاتا"

جوش نے اپنی شاعری کے ذریعہ دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام لیا ہے۔ قوم اور ملک کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی تلقین کی ہے۔ شاعری سے ملک میں انقلاب لانے کا کام لیا ہے۔ جوش کی شاعری تمام عصری مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ سرمایہ داروں اور ظالموں کو للکارتی ہے اور عوام کو ان سے بدلہ لینے کا سبق دیتی ہے۔ اردو شعر و ادب کو ایسے شاعر پر ناز ہے۔ جس نے اقبال و چکبست کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے ایک مستحکم رو عطا کی اور اسے زندۂ جاوید بنا دیا۔

بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین

"وہ اپنے کلام سے دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اقبال کی طرح حسن عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دنیا کو غلامی سے نجات دلا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر بعض اوقات لوگوں کی برائیوں پر روشنی ڈالنے میں اتنے جوش اور تیزی سے کام لیتے ہیں کہ نظروں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی شیریں کلامی تلخ نوائی میں بدل جاتی ہے، خواہ اسے ان کے شدید احساسات پر محمول کیجئے یا خواب گراں سے چونکانے کی تدبیر سمجھئے۔"[1]

[1] تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص ۱۸۵

☆☆☆

شاداب قدیر

جوشؔ ۔ فیضؔ کی نظر میں

اس حقیقت سے چشم پوشی ناممکن ہے کہ جوشؔ اقبالؔ کے بعد سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان کی شخصیت بھی سب سے زیادہ متنازعہ فیہ رہی ہے۔ جوشؔ کے بارے میں یہ بات اکثر دہرائی جاتی رہی ہے کہ وہ تضادات کے شاعر ہیں۔ جوشؔ کے تضادات کا مسئلہ ہی ان کے تعین قدر میں ایک رکاوٹ بنتا ہے اور یہ ایسا دشوار مسئلہ ہے۔ جسے ناقدین ابھی تک حل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ جوشؔ کی افہام و تفہیم میں بھی دو متضاد نقطۂ نظر دکھائی دیتے ہیں، ایک کی نگاہ میں جوشؔ، لفظوں کا ساحر، الفاظ کا مطلق العنان بادشاہ اور زبان شناس ہیں اور دوسرے کی نظر میں ان کی شاعری بے مغز، کھوکھلی اور محض لفظی بازیگری ہے۔ جوشؔ شناسی کا یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ انھیں دو انتہاؤں پر پرکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس مقالے میں جوشؔ کے مرتبے کا تعین کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ ہی ان کے کلام کا فکری و فنی سطح پر جائزہ لینا بلکہ جوشؔ کی قدر و قیمت فیض کی نظر میں کیا ہے! یہ مقالہ اسی موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔

فیضؔ نے جوشؔ پر ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان ہے ''جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے''۔ یہ مضمون فیض کے مجموعۂ مضامین ''میزان'' میں شامل ہے۔ اس مضمون میں فیضؔ نے جوشؔ کے نظریۂ انقلاب اور ان کی انقلابی شاعری کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ فیضؔ جوشؔ کے انقلابی تصورات سے متفق نہیں تھے۔ فیضؔ کے نزدیک انقلاب اور انقلابی شاعری ایسے الفاظ ہیں جو واضح

نہیں ہیں بلکہ ان میں ابہام پایا جاتا ہے وہ مضمون کا آغاز یوں کرتے ہیں

''انقلاب اور انقلابی شاعری مبہم الفاظ ہیں۔ ادب برائے ادب کی طرح انقلاب برائے انقلاب بھی گمراہ کن عقیدہ ہے اس لئے کہ انقلاب کا نتیجہ خیر بھی ہو سکتا ہے اور شر بھی۔ یہ انقلاب کی نوعیت اور مقاصد پر منحصر ہے۔''

انقلاب برائے انقلاب کا نظریہ اس وقت تک گمراہ کن ہوگا جب تک ہم اس کے مقاصد اور اس کی نوعیت کا پتہ لگا کر خیر و شر میں امتیاز نہ پیدا کریں۔ یہ امتیاز محض جذبہ وجنون سے پیدا نہ ہوگا بلکہ اس کے لئے ایک صحت مند نقطۂ نظر اور منفرد طریقہ کار کا ہونا لازمی ہے۔ فیض لکھتے ہیں

''اس خیر و شر میں تمیز کرنے اور صحیح انقلابی تعلیم کی ترویج کے لئے جذبہ وجنون کافی نہیں، فہم وتدبر اور صحت نظر بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ہر ادبی تحریر کے فنی وافادی پہلو تو ہوتے ہی ہیں لیکن انقلابی ادب کا ایک تیسرا پہلو بھی ہوتا ہے یعنی نظریاتی پہلو یا یوں کہہ لیجئے کہ انقلابی ادب کامیاب اور ناکامیاب، مفید اور مضر ہونے کے علاوہ صحیح یا غلط بھی ہو سکتا ہے''۔

فیض کے نزدیک سب سے پہلے اس بات کا تعین کر لینا ضروری ہے کہ انقلاب کا صحیح نقطۂ نظر کون سا ہے لیکن یہ ایک مشکل امر ہے کیونکہ ہر شاعر اپنے نقطۂ نظر کو اہم سمجھتا ہے، اس لئے کسی بھی شاعر کے کلام کا تعین قدر اس کے نظریات کی روشنی میں ہی کیا جانا چاہئے۔ کوئی بھی فنکار نقاد کے تراشے ہوئے اصولوں کے مطابق کام نہیں کرتا ہے اور نہ ہی کوئی ناقد اس سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اس نے نقاد کے نظریے کے مطابق فن پاروں کی تخلق کیوں نہیں کی؟۔ فیض جوش کے انقلابی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جوش کا نظریۂ انقلاب اشتراکی نظریے سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہ اشتراکی عقائد کی روشنی میں ہی جوش کی انقلابانہ روش کا پتہ لگاتے ہیں۔

فیض کو بھی اس بات کی شکایت ہے کہ جوش کے یہاں شخصیت کا تضاد ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایک شخصیت نہیں بلکہ دو شخصیتیں کارفرما ہیں جن کی جانب خود فیض نے اشارا کیا ہے۔ فیض نے اپنی اس بات کو مدلل بنانے کیلئے جوش کا درج ذیل شعر پیش کیا ہے

لایا ہوں بزم ورزم کے ارض تضاد سے
یہ طبل جنگ و ساز شبتان ترے لئے

بزم ورزم کی وارداتیں ایک ہی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن ان کے درمیان کوئی مطابقت، کوئی ارتباط یا کسی قسم کی وحدت قائم ہونی چاہئے کیونکہ جوش جن نظریات سے منسلک نظر آتے ہیں، ان میں انقلابی نظریہ محض رزم سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا انسلاک بزم سے بھی ہوتا ہے۔ بقول فیض

''ایک صحیح انقلابی شاعر اپنا انقلابی نظریہ محض انقلابی مضامین تک محدود نہیں رکھتا، اس کے لئے حسن وعشق، مناظر فطرت، شراب، ساغر سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں چنانچہ وہ خالص عاشقانہ کیفیت کا ذکر کرتا ہے تو اس میں بھی انقلابی شعور کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پائی جاتی ہے۔ وہ بزم شراب کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس بزم کی ہاؤ ہو میں انقلاب کا شوروشغب بھی شامل ہوتا ہے اور جب وہ خالص انقلابی مضامین باندھتا ہے تو وہ بھی بزم کے سرور اور فراق ووصال کے سوزوساز سے یکسر خالی نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شاعر اپنی ذات کو انقلابی نظریۂ حیات سے منطبق کر چکا ہے تو اس کے لئے یہ آسانی سے ممکن نہیں کہ ایک لمحے میں وہ خالص سو فیصدی انقلابی ہو اور دوسرے لمحے میں مکمل رند اور فراری۔ یہ جوش صاحب کا کمال کہہ لیجئے یا کمزوری سمجھ لیجئے کہ انقلابی اور رندانہ شخصیتوں میں کوئی ربط یا علاقہ نہیں ہے۔''

فیض کا خیال ہے کہ اگر جوش کی تمام نظموں کی تقسیم دو حصوں میں کردی جائے تو ان کی عاشقانہ نظموں کا پلہ بھاری رہے گا لیکن فیض کا مقصد ان کی انقلابی اور عاشقانہ شاعری میں تقابل و موازنہ مقصود نہیں اس لئے وہ جوش کے تصور انقلاب پر ہی اپنی نگاہ مرتکز رکھتے ہیں۔ وہ اشتراکیت کی کسوٹی پر جوش کے نظریۂ انقلاب کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اشتراکیت کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ انقلاب کسی ایک ذات واحد کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ سماجی اور اقتصادی قوتوں

کے باہمی پیکار سے انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ جوشؔ کے کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا انقلابانہ رویہ اس نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا ہے کیونکہ ان کے یہاں انقلابی تحرک کسی سماجی طبقے کے ذریعے نہیں بلکہ کسی فرد کے ذریعے پیدا ہوتا ہے اور بیشتر مقامات پر وہ فرد کوئی اور نہیں بلکہ خود جوشؔ صاحب ہیں۔ فیضؔ کے مطابق

> ''یہ تصور کہ کوئی ایک فرد یا کوئی ایک شخص انقلاب کو اپنی ذات میں سمیٹ سکتا ہے اور یہ کہ سماجی علل و اسباب اس کش مکش میں غیر اہم ہیں قطعاً غیر اشتراکی ہے اور اشتراکیوں کے بقول رجعت پسندانہ ہے۔ وہ ذاتی انکسار اور جماعتی تفخر جو صحیح انقلابی شاعر میں ہونا چاہیے جوشؔ کی شخصیت میں نہیں ہے۔''

اشتراکیت کے سماجی نظام میں محنت کشوں کا طبقہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس طبقے سے ذہنی، جذباتی اور نظریاتی وابستگی ضروری ہے لیکن جوشؔ کے یہاں اس قسم کی مطابقت بھی مفقود ہے۔ اگرچہ جوشؔ نے مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے لیکن اس میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں پیدا کر سکے اور نہ ہی انھوں نے ان طبقات کے مسائل کو بغور دیکھنے کی کوشش کی یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ان مسائل کے اظہار میں سطحیت نظر آتی ہے۔ بقول فیض

> ''وہ کسان اور مزدور کا ذکر اکثر کرتے ہیں لیکن بہت اوپر سے اور مشفقانہ انداز میں۔ انھوں نے اس طبقے کی نظر سے مسائل کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی نہ اس طبقے کے مسائل میں انھیں زیادہ دل چسپی معلوم ہوتی ہے۔''

فیضؔ جوشؔ کی مشہور زمانہ نظم ''کسان'' کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نظم کسانوں کے متعلق چند رومانی تصورات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس کی لفظیات توابی درباروں کے قصیدہ گو شعراء کی ذہنیت کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کسان، ہل اور ان کے متعلقات کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ بالکل اشتراکیت کے منافی ہے۔ فیضؔ کے نزدیک تصور انقلاب کو ان طبقاتی تصورات سے منفک نہیں کر سکتے ہیں یہ سبب ہے کہ فیضؔ کی نظر میں جوشؔ کا نظریۂ انقلاب درست

نہیں ہے کیونکہ انھوں نے محنت کش طبقات سے متعلق اپنے نظریات کی تہذیب و تنظیم نہیں کی۔ اس بحث سے قطع نظر فیض یہ بھی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

> ''اس ساری بحث سے یہ مراد نہیں ہے کہ جوش کا انقلابی یا ترقی پسند کلام نظریاتی اعتبار سے بالکل نا قابل اعتنا ہے۔''

اگر چہ فیض جوش کی انقلابیت سے کسی قدر اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ فیض جوش کے خلاف تھے درست نہیں ہے۔ جوش سے نظریاتی طور پر وہ متفق نہ ہوں لیکن وہ کلام جوش کی افادیت کے منکر نہیں تھے۔ انھیں جوش کی قادر الکلامی، بے باکی اور جرات رندانہ کا احساس پوری طرح تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی سے فیض ایک انٹرویو کے دوران جوش کے بارے میں کہتے ہیں

> ''بھئی ان میں خاص قسم کا ایک وفور اور ایک خاص قسم کی قدرت کلام ہے۔ اس سے تو مرعوب ہوئے بغیر چارا نہیں لیکن وہ بہت پر گو ہیں۔ غالباً قدرت کلام کی وجہ سے زیادہ لکھتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ سب بڑے شاعروں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اور برے اور بالکل خالص یا کہیے کم خالص تجربات میں زیادہ تمیز نہیں کرتے اور احتیاط نہیں کرتے تو جوش صاحب کا بھی یہ ہے کہ بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت چیزیں ایسی ہیں کہ سطح تو ان کی ہمیشہ قائم رہتی ہے لیکن اس سطح میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ خالص تجربے کی چیز ہیں لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں محض زور کلام میں کہی گئی ہیں۔''

یہ بات صحیح ہے کہ جوش کے یہاں الفاظ کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جو اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں نہیں آتا ہے لیکن ہم جوش کی شاعری کو محض لفاظی کہہ کر رد کر سکتے ہیں؟ یہ اور بات ہے کہ کثرت الفاظ کی وجہ سے ان کے یہاں ایسے بھی مقامات آتے ہیں جہاں وہ لفظوں کے استعمال میں محتاط نظر نہیں آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات خراب الفاظ بھی استعمال میں لائے گئے ہیں لیکن اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے بہت سے الفاظ کو نئے معنی دیے ہیں اور انھیں

نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا ہے۔ جوشؔ سودا کی روایت کے شاعر تھے اور ان کا ذہنی و ادبی رشتہ فارسی وترکی کے خطیبانہ اور بلند بانگ روایت سے تھا۔ جوشؔ کا کہنا تھا کہ ان کا مزاج ٹرکین سے عاشقانہ تھا لیکن فیضؔ کے نزدیک ان کا مزاج عاشقانہ کے ساتھ ہی جارحانہ بھی تھا اور انھیں دو صفات سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان کی عاشقانہ اور انقلابانہ شاعری میں جارحانہ عناصر کارفرما ہیں اور انھیں جارحانہ عناصر کی بنیاد پر ان کے یہاں جدال وقتال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جوشؔ کے جذبات میں اتنی شدت ہے کہ وہ اظہار پر کنٹرول نہیں کر پاتے ہیں اور اپنے احساسات کو اسی قوت اور توانائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس قوت کے ساتھ وہ انھیں محسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے احساسات کے اظہار میں لطافت کم اور متشددانہ لہجہ زیادہ ملتا ہے۔ بقول فیضؔ

> ''جوشؔ صاحب کو حدیث دل کی نزاکتوں اور داخلی احساسات کی لطافتوں سے بہت کم واسطہ تھا۔ اسی طرح ان کی شاعرانہ لغت اور لہجہ میں بھی لوچ کے بجائے گھن گرج اور طنطنے کو زیادہ دخل تھا۔ وہ بیشتر بڑے کینوس پر موٹے برش سے آئل پینٹ کرتے تھے۔''

اس کے باوجود فیضؔ جوشؔ کی عظمت شعری پر یقین رکھتے تھے۔ جوشؔ کی زبان دبیان پر گرفت اور ان کے استعمال کے ہنر کا احساس بھی فیضؔ کو تھا۔ جوشؔ کے یہاں انقلاب کا کوئی منضبط تصور تھا یا نہیں؟ اس کا جائزہ ہمیں دنیا کے انقلابی مفکرین کے تصورات کو پیش نظر رکھ کر نہیں لینا چاہئے بلکہ انیسویں یا بیسویں صدی کے انقلابی شعراء سے ہی جوشؔ کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

ہلال نقوی

جوش کا سنہ ولادت۔ ایک مختصر تحقیقی جائزہ

جوش صاحب انیسویں صدی کے آخری عشرے میں پیدا ہوئے، باقی تمام زندگی بیسویں صدی میں گزری لیکن عمر کی اس مسافت کے باوجود ان کی زندگی میں ان کے سنہ ولادت کا حتمی طور پر تعین نہیں کیا جا سکا۔ ان کی وفات کو بھی تقریباً ربع صدی گزر چکی ہے لیکن اب تک ان کے سنہ ولادت کے متعلق بالکل یقینی طور پر کچھ نہیں کہا گیا۔ اس ذیل میں نہ کوئی منضبط تحقیق ہوئی نہ ان کے خاندانی دستاویزات کی چھان پھٹک کی گئی۔ یہ بات تو یقیناً طے ہے کہ ان کی ولادت انیسویں صدی کے آخری عشرے میں ہوئی۔ لیکن سنہ کون سا تھا۔ ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک جتنے بھی سنہ ہیں ان میں سے ہر سنہ کو ان کے سن ولادت سے منسوب کر دیا گیا۔ نتیجتاً اتنے مغالطے پیدا ہوتے چلے گئے کہ یہ موضوع ہی الجھ گیا۔ تمام مغالطے پیدا کر دینے میں دیکھا جائے تو سب سے بڑا ہاتھ خود جوش صاحب کا ہے۔ انہوں نے یقیناً دانستہ ایسا نہیں کیا۔ سنہ ولادت کے متعلق انہوں نے جب بھی اظہار کیا اس میں نادانستہ طور پر مختلف سن کے وہ نام لیتے رہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا مزاج عالمانہ تو رہا لیکن دو اور دو چار والا محققانہ کبھی نہیں رہا۔ خصوصاً ایسی تحقیق جس میں اعداد و شمار زیر بحث ہوں ایسے روکھے موضوع سے تو ان کے شاعرانہ اطوار کا کوئی ذہنی تعلق قائم ہی نہیں ہوتا۔ ایک موقع پر جب راقم السطور نے اپنے تحقیقی مقالے کی تشکیل کے دوران ان کی رثائی تخلیقات کے سنہ تصنیف ان سے دریافت کیے تو انہوں نے اپنے خط میں جواب دیا:

"تحقیقی نوعیت کے سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے مجھے اپنی طبیعت پر
بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاملات میرے مزاج کے بالکل برعکس ہیں۔"[1]

یہاں ایک جائزہ لے لیتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سنہ ولادت کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ جو بھی اظہار کیا، وہ کب کیا۔ کس پس منظر میں کیا اور اس بارے میں انہوں نے کیا بتایا۔

جوش کے بیان کردہ مختلف سنہ ولادت

۱۔ ۱۹۳۳ء میں جوش صاحب نے ،،بہن کی یاد،، کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک مصرعہ یہ بھی ہے:

جیتے جیتے ہو چکے ہیں جوش چھتیس سال۔ (۲)

اس اعتبار سے ان کا سنہ ولادت ۱۸۹۷ء ہونا چاہیے۔

۲۔ ۳۹۔۱۹۳۸ء میں احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ انہی دنوں میں ان کے دل میں جوش صاحب پر ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ کتاب کا خاکہ تیار کرنے کے دوران اپنے مباحث کو آگے بڑھانے کے لیے انہوں نے کچھ سوالات جوش صاحب کو لکھ کر دیئے۔ جوش صاحب نے بھی ان کے جوابات تحریراً دیئے اس کے بعد احتشام صاحب نے پہلی بار ان کا جو سنہ ولادت بتایا وہ ۱۸۹۶ء تھا۔ (۳)

۳۔ ۱۹۴۸ء میں جوش صاحب نے 'جلال و جمال' کے عنوان سے بائیس بندوں پر مشتمل ایک نظم لکھی جس کے گیارہویں بند (۴) کے ابتدائی دو مصرعے یہ ہیں:

انچاسویں برس میں ہے گو عمر کا قدم
دل میں وہی تڑپ ہے وہی ولولوں میں رم

اگر ۱۹۴۸ء میں وہ انچاس برس کے ہوئے تو سنہ ولادت ۱۸۹۹ء ہونا چاہیے۔

۴۔ جوش صاحب کی زندگی میں 'افکار' کا اک ضخیم جوش نمبر ۱۹۶۱ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کے مدیر صہبا لکھنوی نے بڑے فیصلہ کن انداز سے حتمی لہجے میں یہ بات لکھی:

"اردو رسالوں اور ادبی تاریخوں میں آج تک جوش کا سنہ پیدائش ۱۸۹۶ء

اور مقام پیدائش کنول بار شائع ہوتا رہا ہے، جو غلط ہے ثبوت کے طور پر جوش کی تحریر کا عکس پیش ہے۔ یہ ان کے مسودات سے ہم نے حاصل کیا ہے۔'' ۵

اس عکس تحریر پر جوش صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ تاریخ کہ جب انہوں نے یہ معلومات درج کی تھیں، وہ ہے۔ جنوری ۱۹۴۰ء دہلی۔ یعنی انہوں نے جب ۳۹۔۱۹۳۸ء میں احتشام صاحب کو سنہ ولادت بتایا تو ۱۸۹۶ء بتایا اور اس کے ایک سال بعد ہی ان کی تحریر میں ۱۸۹۸ء لکھا ہوا ملتا ہے۔ اسی بنیاد پر صہبا لکھنوی نے ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء کو صحیح تاریخ و سنہ پیدائش قرار دیا۔ لیکن ماہنامہ 'افکار' کے اسی شمارے میں 'جشن جوش' کا بھی ذکر ہے جس کا انعقاد ۵ نومبر ۱۹۶۱ کو ہوا۔ اس جشن کو ان کی ۶۵ ویں سالگرہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس حساب سے سنہ ولادت ۱۸۹۶ء ہوتا ہے۔

۵۔ روزنامہ حریت کراچی کے سابق ایڈیٹر انور خلیل نے 'افکار جوش نمبر' کی اشاعت کے بعد جوش صاحب کے گھر پر ان سے ایک ملاقات کا تذکرہ کیا ہے جس میں انہوں نے جوش صاحب کے بچپن کی ایک تصویر دیکھی جس کے نیچے خود جوش صاحب کی تحریر میں یہ نوٹ لکھا ہوا ہے:

''یہ تصویر ۱۹۰۷ء کی ہے جب میری عمر ۱۵ / یا ۱۶ / سال تھی۔'' ۶

اس طرح تو ان کا سنہ ولادت ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء ہوا۔

۶۔ ماہنامہ افکار کے ۱۹۶۱ء کے جوش نمبر میں جوش صاحب ہی کی تحریر میں ان کا سنہ ولادت جو ۱۸۹۸ء شائع ہوا تھا وہ ۲۱ سال بعد صہبا لکھنوی نے اپنے جریدے کے بیاد جوش نمبر میں پھر شائع کر دیا (۷) اور اس دعوے کیساتھ شائع کیا کہ یہ جوش صاحب کے مستند ترین حالات ہیں یعنی ان کی زندگی میں شائع ہونے والے جوش نمبر میں بھی انہوں نے اسی سن ولادت کو اولیت دی اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کا اصرار اسی سنہ ولادت پر ہے لیکن افکار بیاد جوش نمبر سے بارہ سال پیشتر یعنی ۱۹۷۰ء میں جب جوش صاحب کی خودنوشت منظر عام پر آئی تو اس میں انہوں نے ۱۸۹۸ء کے بجائے ۱۸۹۶ء کو ترجیح دی اور وہ بھی اس زاویہ فکر کے ساتھ:

''میں، اس بوند بھر زندگی کو بھوگنے اور اس بظاہر رنگین و بباطن خون آلودہ زندان کون و فساد میں اوبھنے کے واسطے کب لایا گیا، اس امر کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ

ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ البتہ میری دادی جان سے جو خاندان کی مورخ تھیں، مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا۔ وہ سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۹۶ء تھا، یا ۱۸۹۸ء، یہ بھی یاد نہیں رہا۔ بہر حال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے، اس لیے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ دو برس اور بوڑھا ہو گیا، ہو جانے دیجئے (جوتی کی نوک سے)۔ البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے فرمایا تھا کہ بیٹا صبح چار بجے پیدا ہوا تھا۔'' ۵۸

۷۔ جوش صاحب کی وفات کے ۱۱رسال بعد مئی ۱۹۹۳ء میں ان کی پوتی تبسم اخلاق نے اپنے دادا کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کی جو فوٹو اسٹیٹ نقل مجھے فراہم کی اس میں شناختی کارڈ پر جوش صاحب کی عمر ۷۴ سال لکھی ہے۔ یہ کارڈ ۱۶رجنوری ۱۹۷۴ء کو اسلام آباد / راولپنڈی کے شناختی کارڈ آفس سے جاری ہوا ہے۔ اس لحاظ سے تو سنہ ولادت ۱۹۰۰ء ہونا چاہیے۔

۸۔ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ پر عموماً شخصی معلومات کا اندراج یکساں ہی ہوتا ہے ورنہ سفری ضروریات اور بعض دوسری اسناد کی صحت و تصدیق کی راہ میں کئی مشکلات آڑے آجاتی ہیں۔ لیکن جوش صاحب کے سنہ ولادت کا اظہار ان کے شناختی کارڈ سے ۱۹۰۰ء ہوتا ہے جبکہ پاسپورٹ پر ۱۸۹۸ء درج ہے۔ یہ پاسپورٹ ۷راپریل ۱۹۷۰ء کو بنا۔

جوش صاحب کے سنہ ولادت کے ذیل میں مندرجہ بالا تمام اطلاعات اور بیانات میں واضح تضاد نظر آرہا ہے اور کیونکہ ان کی زندگی میں اور ان کی زندگی کے بعد بھی تحقیق کرنے والوں نے ان کے سنہ ولادت کو موضوع تحقیق ہی نہیں بنایا تو اکثر و بیشتر لکھنے والے انہی سنین کو بنیاد بناتے رہے جن کی نشاندہی جوش صاحب نے کی تھی۔ ماہنامہ افکار کا ضخیم جوش نمبر اور یادوں کی برات کیونکہ سب کے لیے سہل الحصول تھے اور جوش صاحب کے سلسلے میں سب سے زیادہ انہی کو پڑھا گیا۔ چنانچہ ان میں لکھے ہوئے دونوں سنہ ہی برابر نقل کیے جاتے رہے۔ اس موقع پر بزرگ محققین سے لے کر آج کے نوجوان محقق تک کی متعدد تحریروں سے حوالے دیئے جاسکتے ہیں جنھوں نے جوش صاحب ہی کی بیان کردہ مختلف تاریخوں اور سنہ کو ان کا سنہ ولادت تسلیم کیا ہے اور وہ کسی کرید اور چھان بین کے سفر

پر نہیں نکلے۔ لیکن اس موضوع کو مزید طوالت سے بچانے کے لیے فی الوقت ان تمام حوالوں سے گریز کیا گیا ہے۔

ترقی پسند احوال وافکار کی ترویج واشاعت سے وابستہ ارتقا ادبی فورم کراچی نے ۱۹۹۸ء میں 'جوش صدی تقریبات' کا پورے پاکستان میں اہتمام کیا۔ یعنی کہا جا سکتا ہے کہ جوش صاحب کے نظریاتی ہم خیال ایک بڑے فورم نے بھی ان کے سنہ ولادت کو ۱۸۹۸ء ہی تسلیم کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جوش صاحب کے صحیح سنہ ولادت کا تعین کیا جائے تو کیوں کر کیا جائے اور کن حقائق کو بنیاد بنا کر ہم کسی ایک سنہ کو طے کرلیں۔ یہ اس طرح نہیں ہوگا کہ ملیح آباد سے اچانک ایسی دستاویز دریافت ہو جائے جس پر جوش صاحب کے آباو اجداد کی کوئی یادداشت اس گتھی کو سجھا دے۔ ایک تو اس زمانے میں یہ رواج ہی نہیں تھا کہ شخصی حالات لکھ لیے جائیں۔ دوسرے یہ کون کہہ سکتا تھا کہ جس بچے نے دنیا مین جنم لیا ہے آنے والے وقتوں میں ناموری کا تاج اس کے سر پر ہوگا۔ چنانچہ روز اول سے اس کی زندگی کے ہر اہم لمحے کو نوٹ کرلیا جائے۔ اس کے لیے ہمیں بعض ایسی شہادتوں اور تحریروں کو بنیاد بنانا ہوگا جو جوش صاحب کی زندگی کے ابتدائی دور سے متعلق ہوں کیونکہ دیکھا یہی گیا ہے اور تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دور آغاز میں جو حالات و واقعات قلمبند کیے جاتے ہیں وہ سب خاندان کے بزرگوں کی نظروں میں ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے ذاتی بیاضوں میں کچھ باتیں نوٹ کر بھی لی ہوتی ہیں تو وہ اس وقت تو محفوظ ہوتی ہیں مگر گزرتے وقت کے ساتھ یہ سب حقیقتیں گرد آلود ہوتی جاتی ہیں اور حقائق نظروں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ کسی عام آدمی سے متعلق ایسی معلومات کا حاصل کر لینا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنے اطراف میں شہرت رکھتا ہے خصوصاً کسی علمی و ادبی حوالے سے وہ معروف ہے تو پھر کہیں نہ کہیں اس کے حالات محفوظ ضرور ہو جاتے ہیں۔ پرانے تذکروں کی اہمیت کا سب سے بڑا راز ہی یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے اہل قلم اور اہل سخن کے بنیادی تعارف سے ہمیں آگاہ کر دیتے ہیں۔

اردو کے معروف محقق مشفق خواجہ صاحب نے اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ ان کے نوادرات میں شعرائے ملیح آباد کا ایک ایسا قلمی تذکرہ موجود ہے جو بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں لکھا گیا اور جس میں شبیر حسن خان (جوش) کے بھی مختصر احوال ہیں۔ میرے

اصرار پر انہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ کسی فرصت کے وقت میں یہ نایاب تذکرہ مجھے دکھادیں گے لیکن وہ اچانک انتقال کر گئے اور اس غیر مطبوعہ نادر تذکرے سے استفادے کا موقع نہیں مل سکا۔

صحیح سنہ ولادت

جوش صاحب کے صحیح سنہ ولادت کے ذیل میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'روح ادب' انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ میری مراد اس نسخے سے ہے جو میتھوڈسٹ پریس لکھنؤ نے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا تھا۔ نسوانی حسن کی خیالی تصویروں سے آراستہ یہ نایاب نسخہ جوش صاحب سے میں نے ان کے دستخط کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ یہ ان کے تمام شعری مجموعوں میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کا مقدمہ محمڈن کالج علی گڑھ اور کیننگ کالج لکھنؤ کے سابق پروفیسر رفیع احمد خان نے لکھا تھا جس میں پہلی بار جوش صاحب کے نام ونسب، مختصر حالات زندگی، بچپن، تعلیم و تربیت، آغاز شعر گوئی اور عادت و اطوار کا بھی تذکرہ ہے۔ جس میں یہ تک نشاندہی کی گئی ہے کہ جوش صاحب نے دس سال کی عمر میں کون سے شعر کہے اور گیارہ سال کی عمر میں کون سے۔ اتنی ترتیب اور اتنی تحقیق کے ساتھ لکھے جانے والے اس مقدمے میں پہلی بار مقدمہ نگار نے ان کے سنہ ولادت کا بھی اظہار کیا ہے جو ۱۸۹۴ء ہے۔(۹) اس مقدمہ میں ایک اور مقام پر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس وقت جوش صاحب کی عمر چھبیس سال ہے۔ (۱۰) اس مستند تاریخ ولادت کا حوالہ بعد کے محققوں کے یہاں اس لیے بھی نہیں آسکا کہ روح ادب کا یہ نسخہ کچھ ماہ بعد ہی نایاب ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں مکتبۂ اردو، لاہور، نے جب اسے دوبارہ شائع کیا تو اس میں رفیع احمد خان کا مقدمہ نہیں تھا۔ دیباچے کے طور پر جوش صاحب کی ایک تحریر ضرور شامل تھی۔

اس سنہ ولادت کی انتہائی قریبی شہادتوں میں جوش کی پہلی نثری کتاب 'مقالات زریں' بھی بہت اہم ہے۔ یہ روح ادب کی اشاعت کے ایک سال بعد ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی اور روح ادب کے پہلے نسخے ہی کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ جوش صاحب کے اقوال پر مشتمل ہے۔ یہ اقوال مختلف جذبات واحساسات کی ایک ایسی مرصع شکل ہیں جن میں ندرت فکر بھی ہے اور ندرت اظہار بھی۔ اظہار کا ایک یہ زاویہ بھی دیکھیے جس سے ہم ان کے سنہ ولادت کو اخذ کر سکتے ہیں:

''جوش ازل سے تجھ پر فریفتہ ہے۔ اب وہ ستائیسویں برس میں قدم رکھ رہا ہے۔ گویا تیرے عشق کی ستائیسویں سالگرہ ہے۔'' [11]

۱۹۲۱ء میں بھی ستائیسویں سالگرہ کا ذکر ۱۸۹۴ء ہی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ یوں رفیع احمد خاں کے بعد خود جوش صاحب نے بھی اسی سنہ ولادت کو اپنا حقیقی سنہ ولادت تسلیم کیا ہے اور اس کا اظہار بھی کیا۔ مگر بعد کی تحریروں میں وہ اسے بھول گئے۔ گنتی کے دو چار لکھنے والوں نے بھی اپنی کسی تحریر میں یہ سنہ لکھا ہے لیکن وہ ان کی کسی بحث کا حصہ نہیں ہے۔ جوش صاحب پر لکھتے ہوئے ان کا سنہ ولادت بھی لکھنا تھا، سو لکھ دیا۔ البتہ ڈاکٹر ناہید عارف جنہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے تحت خاندان گویا کی ادبی خدمات پر تحقیقی مقالہ لکھا اور جو خود بھی اسی خاندان سے ایک نسلی تعلق رکھتی ہیں۔ ۱۸۹۴ء ہی کو ترجیح دیتی ہیں اور وہ بھی روح ادب مطبوعہ ۱۹۲۰ء میں رفیع احمد خان کے لکھے ہوئے مقدمے کا حوالہ دیتے ہوئے یہی بات کہتی ہیں کہ:

''۱۹۲۰ء میں جوش کے متعدد بزرگ زندہ تھے۔ ظاہر ہے کہ رفیع احمد خان نے جوش اور ان کے بزرگوں سے معلوم کر کے ہی ان کا سنہ ولادت لکھا ہوگا۔'' [12]

جوش صاحب کے سنہ ولادت سے متعلق اس مختصر جائزے کے بعد اور آج تک کے تمام تحقیقی شواہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جوش صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۹۴ء ہے۔ وہ ملیح آباد کے قصبے مرزا گنج میں پیدا ہوئے۔ اس روز دسمبر کی پانچویں تاریخ تھی۔

حوالہ جات

۱۔ مکتوب جوش بنام ہلال نقوی مرقومہ ۱۷ر جون ۱۹۸۱ء اسلام آباد مشمولہ جوش ملیح آبادی کے خطوط۔ مرتبہ خلیق انجم، ثمر آفسٹ پرنٹرز نئی دہلی ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۳/۱۷۴

۲۔ جوش ملیح آبادی۔ نقش و نگار۔ مکتبۂ جامعہ دہلی ۱۹۳۶ء، ص ۱۱۸

۳۔ پروفیسر احتشام حسین، 'جوش ملیح آبادی انسان اور شاعر' اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۲۳۔

۴۔ جوش ملیح آبادی 'سرود خروش'، دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۲۹۷

۵۔ صہبا لکھنوی 'جوش ملیح آبادی زندگی، شخصیت اور فن کا جائزہ'، افکار جوش نمبر پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۱ء، ص ۱۷
۶۔ انور خلیل۔ جوش کا ایک یادگار انٹرویو، مشمولہ افکار بیاد جوش نمبر، جولائی ۱۹۸۲ء، ص ۸۷
۷۔ صہبا لکھنوی جوش ملیح آبادی زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ'، مشمولہ ماہنامہ افکار بیاد جوش نمبر، جولائی ۱۹۸۲ء، ص ۲۹
۸۔ جوش ملیح آبادی 'یادوں کی برات' جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۴۱
۹۔ رفیع احمد خاں۔ مقدمہ روح ادب، میتھوڈسٹ پریس لکھنؤ، ۱۹۲۰ء، ص ۱۵
۱۰۔ ایضاً ص ۱۹
۱۱۔ جوش ملیح آبادی 'مقالات زریں'، اصح المطابع تھوی ٹولہ لکھنؤ ۱۹۲۱ء، ص ۵۵
۱۲۔ ڈاکٹر ناہید عارف 'گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات ۱۹۲۰ء تک' نامی پریس ۱۹۸۹ء، ص ۳۸۱

☆☆☆